اردو ایڈیشن

رسالہ

دہلی

نن پرون

سال دوم | ۱۰ جولائی ۱۹۴۲ء | فہرست اندراجات | ۲۵ جمادی الثانی ۱۳۶۱ھ | نمبر (۵)

: دراجپور روڈ کوٹھی ۱۵ پرانی دہلی :

مدح یا غزل؟

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کیلئے
رہے نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کیلئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونچکاں کیلئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر
نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کیلئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری ایک جہاں کیلئے

فلک نہ دُور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں
دراز دستیٔ قاتل کے امتحاں کیلئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کیلئے

بقدرِ شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کیلئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمّل حسین خاں کیلئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملّت و ملک
بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کیلئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش
بنیں گے اور ستارے اب آسماں کیلئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اِس بحرِ بیکراں کیلئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کیلئے

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کاروبارِ جہاں ❊ نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

(اقبالؒ)

رازِ نجات
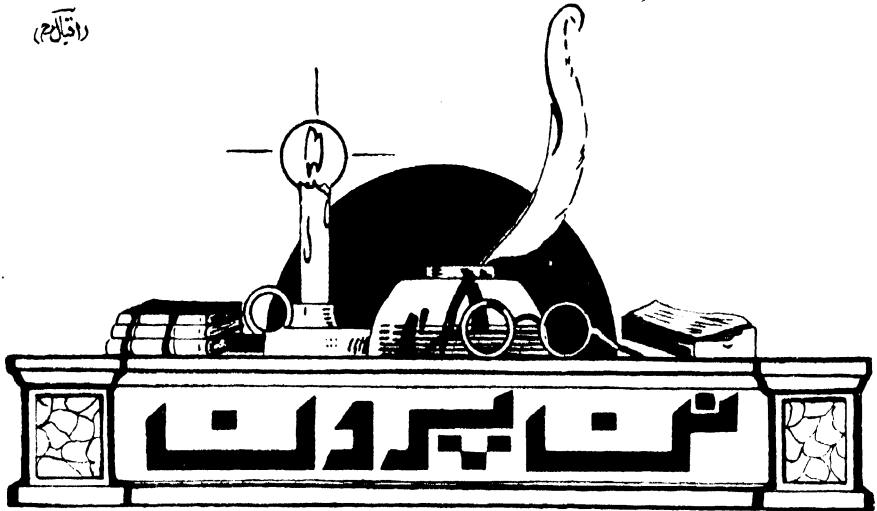
پشتو سے ترجمہ:-

آج کل دُنیا بھر میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا جو دل و دماغ رکھتا ہو لیکن روزانہ واقعات سے متاثر نہ ہوتا ہو اور ان کے متعلق کوئی نہ کوئی رائے نہ بنائے ہو ہل چلاتے وقت دہقان ایک دوسرے کو کہتے ہیں کہ ان مغربی ممالک میں کیسی بلا کی آگ برس رہی ہے۔ مزدور بھی پریشان ہے۔ دل میں کہتا ہے مزدوری تو مل رہی ہے مگر یہ عمارتیں یہ سڑکیں تابڑ توڑ کیوں بنائی جا رہی ہیں یہ کارخانے کیوں شب و روز بے تحاشا چل رہے ہیں۔ بیوپاری کی پانچوں انگلیاں گھی میں تو ہیں لیکن سب سے زیادہ گھبراہٹ اسی کو ہو رہی ہے کہ یہ سب مال و متاع کہیں ایک آن نہ کھو بیٹھے سرکاری ملازمین اپنے اپنے کام میں مستغرق ہیں لیکن جب رفتارِ زمانہ کا خیال آتا ہے انگشت بدندان رہجاتے ہیں۔ حکومت کے معتمدین۔ وزراء اور رؤسا رات دن اس ادھیڑ بن میں ہیں کہ اپنے گرد و پیش کے حالات سنبھالے رکھیں۔ سپاہی جان پہ کھیل رہے ہیں

سائینسدان نئی ایجادوں کی فکر میں ہیں جن سے اس
لڑائی میں مدد ملے۔ علمائے دین سب کچھ دیکھ
رہے ہیں اور سمجھ رہے ہیں مگر بے بس ہیں اور اس رَو
میں بہے جا رہے ہیں۔ غرض کوئی فرد ایسا نظر نہیں آتا
جو ان واقعات کو جانتا نہ ہو یا اُن کا کچھ نہ کچھ اثر لئے
ہوئے نہ ہو۔ ہر شخص ششدر ہے۔ اداس ہے۔ سوچنے
لگتا ہے کہ آیا آج کل جو کچھ روئے زمین پر ہو رہا ہے
جائز ہے دماغ پر زور ڈالتا ہے۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر دیکھتا ہے لیکن سوائے اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا
کہ دنیا سر بفلک شعلوں میں گھری ہوئی ہے یا ایک
بے پناہ سیلاب ہے جو سب کچھ بہائے لئے جا رہا ہے
یا ایک تند آندھی ہے جو چھوٹے بڑے سارے پودوں
کو اکھاڑ پھینک رہی ہے یا ایک بجلی ہے جو سب کچھ
راکھ کر رہی ہے۔ ہر شخص بے اختیار ہے۔ لاچار ہے۔
کچھ پتا نہیں چلتا۔ اول تو صحیح رائے بن نہیں آتی۔ اگر
سوجھے بھی تو کوئی مانتا نہیں۔ آئندہ کے بھید کا سوائے
خدا کے کسی کو پتا نہیں

بعض اقوام نے علوم و فنون میں بڑی ترقی کی ہے
فطرت کے ہزارہا سربستہ راز پا لئے۔ آسمان، سورج
چاند، ہوا، پانی، پہاڑ، میدان ان سب کو اپنی علمی
تحقیقات کا جولانگاہ بنایا ہے۔ بعض لوگ جوں جوں
ان اقوام کی ترقیات پر غور کرتے ہیں توں توں اس
دبدہا میں پڑ جاتے ہیں کہ کیا یہ سب کمالات۔ یہ سب
ایجادات یہ قومیں اپنی تباہی اور بربادی ہی کیلئے استعمال
کرسکتی ہیں؟ کیا ان سب کی سمجھ پر پردے پڑ گئے ہیں؟
انہی نے اپنے علوم و فنون کے زور سے اس دنیا
کو جنت کا ہم پلہ بنایا اور انہی کے ہاتھوں دوزخ بن
رہی ہے۔ یہ تو سراسر باؤلا پن ہے۔ یہ عالموں، سائینسدانوں،
موجدوں اور سیاستدانوں والی قومیں یہ سب کچھ کر رہی
ہیں اور پھر بھی نہیں سمجھ سکتیں کہ کر کیا رہی ہیں اور آخر
انجام کیا ہوگا۔

مورخین کا خیال ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی
رہتی ہے۔ یہ نئی بات نہیں۔ ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے
اور تقاضائے فطرت بھی یہی ہے۔ ہر کمالے را زوالے
موجودہ تہذیب اپنے معراج تک پہنچ چکی ہے اور
پرانی تہذیبوں کی طرح اپنی قبر خود کھود رہی ہے۔
اس تہذیب کا دور بھی ختم ہوا چاہتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ دنیا کا اقتصادی نظام
ہی ناقص ہے۔ یہ لڑائی بھی اسی وجہ سے ظہور میں آئی۔
اور اس لڑائی کے بعد بین الملی اقتصادیات کی از سر نو
تنظیم کی جا سکتی ہے کیونکہ آبادی گھٹ جائے گی
مشینی ذرائع بڑھ جائیں گے۔ اور ہر قوم کی ضروریات
اس حد تک پوری ہو سکیں گی کہ لڑائی کی نوبت نہ آئے

علم النفس کے ماہرین کا عقیدہ ہے کہ لڑائی بشری
خاصہ ہے۔ انسانی ترقی کتنی ہی بڑھ جائے پھر بھی
بشر حیوان ہی تو ہے۔ حیوانوں کی زندگی انفرادی اور

ذاتی ہوتی ہے کسی حیوان کی خواہش پُورا ہونے میں کوئی رکاوٹ ہو تو وہ اس رکاوٹ کو زور کے ذریعہ ہی دُور کرتا ہے ۔ اگر ایک جانور دوسرے جانور کا حصہ چھیننا چاہے تو اس مسئلہ کا فیصلہ بھی زور ہی کے ذریعہ ہوتا ہے ۔

کچھ دنوں سے میں یہ بھی دیکھ رہا ہوں کہ بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خیالات موجزن ہیں ۔ کہ آخر اس دنیا کا خالق بھی تو ہے ۔ وہ رحمان ہے رحیم ہے لیکن دنیا میں اس سارے ظلم و تشدد کو خوب دیکھ رہا ہے ۔ وہ علیم اور بصیر ہے اپنی مخلوقات کو پھر کیوں آزاد چھوڑ رکھا ہے ۔ اسکی شان سے دُور ہے کہ اُس کی دنیا میں ایسے جنگ و جدال کا بازار گرم رہے ۔ میرا رُوئے سخن بھی انہیں حضرات کیطرف ہے

میں یہ نہیں کہتا کہ دُوسرے مفکرین کا استدلال غلط ہے ۔ وہ جن نتائج پر پہنچے وہ نتائج انکے مخصوص مطالعہ کا نچوڑ ہیں ۔ لیکن یہ میدان ہی اور ہے اور میری دانست میں مؤرخین ۔ سائینسدان اور ماہرین علوم و فنون اس میدان کے شاہسوار نہیں ہیں ۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ باری تعالےٰ نے دنیا کا نظام مادیت کی بنا پر قایم نہیں کیا ۔ اس نظام میں اس کا اپنا ہی اصُولی کار فرما ہے اور وہ رُوحانیت کا اصُول ہے ۔ مادہ رُوح کے تابع ہے ۔ گو بشر کو فرشتے تک سجدہ کرتے رہے ہیں لیکن وُہ علم و اعمال حسنہ کا بہترین نمونہ بننے کا بھی اہل ہے جس وقت فرشتوں کو حکم ہُوا ۔ اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ (میں زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کرتا ہوں) تو فرشتوں نے بشر کا وہی پہلو پیش کیا جس کا آج دنیا میں مظاہرہ ہو رہا ہے اور ساتھ ہی یہ درخواست کی :۔ اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَیَسْفِکُ الدِّمَاءَ (تو زمین پر ایسوں کو خلیفہ مقرر کرتا ہے جو وہاں فساد کریں گے اور ایک دوسرے کا خُون بہائیں گے) اسپر باری تعالےٰ نے حضرت آدمؑ اور فرشتوں سے ایک سوال کیا ۔ جس کا جواب فرشتے تو نہ دے سکے مگر حضرت آدمؑ نے درست دے دیا ۔ اس طرح سے خلافت حق حضرت آدمؑ کو ملی ۔

یہ وراثت بڑی ذمہ داری کی حامل تھی ۔ شرط یہ تھی :۔
فَاِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ النَّارِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ۝ (پس جب تمہاری طرف میری ہدایت آئے پس جو کوئی ایمان لایا اور اس نے اس کی پیروی کی اُس کے لئے کوئی خوف نہیں اور نہ ہی وُہ کبھی غمگین ہوگا ۔ اور جس کسی نے ہدایت ماننے سے انکار کر دیا اور باری تعالےٰ کی آیتوں کو جھٹلایا تو اُن کے لئے آگ ہے اور اُس میں وُہ ہمیشہ رہیں گے) اس آیۂ کریمہ کے علاوہ دیگر آیات سے صاف عیاں ہے کہ دنیا پر مصیبت اور ابتلا کی گھٹائیں اس وقت چھا جاتی ہیں جب دنیا راہ راست سے بھٹک جائے ۔ باری تعالےٰ کے بتائے ہوئے اصُول بھول جائیں فسق و فجور کا بازار گرم ہو جائے ۔ مذہب

رُوس ته چه په دې نازک وخت کښې د کشمکش څه جاري سامانو د پاره کوم بے اندازه امداد د اتحاديانو د طرفه رسي په هغې کښې زيات د ايران په لاره ليږلے شي - په پاسني تصوير کښې د برطانوي جنګي سامانو نه ډک ريل ګاډي د ايران د يو بندر نه روسي سرحد ته د روانيدو د پاره تيار ولاړ دي - په ښکتني تصوير کښې يو روسي منصبدار د خپلو فوجي لاريو چلوونکو ته هدايات ورکوي دا لاري د برطانوي جنګي سامانو نه ډکې روس ته روانيږي - د دغه شان په زرګونو ډک ريل ګاډي او لاري شپه او ورځ روس ته چليږي -

اس نازک مرحلہ پر اتحادیوں کی طرف سے جو بیحد وحساب جنگی سامان روس بھیجا جا رہا ہے اس میں سے زیادہ تر ایران کے راستہ سے جاتا ہے (اوپر) برطانوی جنگی سامان سے لدی ہوئی ریل گاڑیاں ایک ایرانی بندرگاہ میں روسی سرحد کی طرف جانے کیلئے تیار ہیں - (نیچے) ایک روسی افسر اپنے ڈرائیوروں کو ہدایت دے رہا ہے - یہ لاریاں بھی برطانوی جنگی سامان سے لدی ہوئی روس جا رہی ہیں - رات دن میں ایسی ریل گاڑیاں اور لاریاں ہزاروں کی تعداد میں روس پہنچ رہی ہیں ❊ - ❊

ایک کھلونا نہ بن رہے ۔ مادہ پرستی بشر کا فلسفۂ حیات بنجائے وُہ اخلاق جو بشری معاشرت کا سہارا ہیں یکسر کافور ہوجائیں ہرطرف نفسانفسی پڑجائے ۔ ہر شخص یہ کہتا ہو کہ جان ہے تو جہان ہے جب زندگی پر دو ہی لفظ یعنی "میں" اور "میرا" حکمفرما ہوں تو یہی زندگی کا انجام اور ہو ہی کیا سکتا ہے ؟

انسان نے اعمال ہی کی کئی منزلیں طے کر کے کمال کا درجہ پایا ہے ۔ یہ علوم و فنون ہزارہا سال کے تجربوں کے بعد انسان کو میراث میں ملے ہیں ۔ اجتماعی زندگی کے اصول گوناگون تجربات کے بعد وضع کئے گئے ہیں اپنے عمل ہی سے انسان نے رُوئے زمین کو ایک گلزار بنا دیا اور اپنے اخلاق کے زور سے انسان حیوان پر فائق ہوا ۔ اور اس رُوحانی اور جسمانی ترقی کے بعد اس نے "اشرف المخلوقات" کی سند پائی ۔ باری تعالےٰ نے "احسنِ تقویم" میں بھی اسی کی تخلیق کیطرف اشارہ کیا ہے اور اسی صلاحیت کی بنا پر اُسے اپنا خلیفہ بنایا ۔ یہ صلاحیت نہ رہے تو یہی انسان اَسْفَلُ السّافِلین بن سکتا ہے ۔ ہماری آجکل کی حالت بتا رہی ہے کہ ہم میں وہ صلاحیت نہیں رہی ۔ جب ایمان اور اعمالِ حسنہ میں بُعد ہو تو لازماً بشر پر حیوانیت غالب آ جاتی ہے ۔ ایسے ہی حالات میں انبیاء بھیجے گئے ۔ جب مادہ پرستی غالب آجائے تو نفس پرستی ہی زندگی کی غرض و غایت بن جاتی ہے وُہ اخلاق جن سے اجتماعی اور انفرادی زندگی سدھرتی ہے کمزور پڑجاتے ہیں رُوحانیت حیوانیت کے تلے دب جاتی ہے ۔ اور نوبت یہاں تک آپہنچتی ہے کہ مادی ذرائع تباہی کی روک تھام نہیں کر سکتے ۔ انسان دُبدھا میں پڑجاتا ہے ۔ تب خلق خدا نئے سرے سے پھر اپنے خالق کی طرف جھکنے لگتی ہے ۔ میں دُنیا کی تسلی کے لئے اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ وہ ضرور اپنے بندوں پر رحم کرتا ہے اور اس نے ایسی مشکلات ہمیشہ اپنے پیغمبروں کے ذریعہ حل کی ہیں ۔ آج بھی دُنیا کی نجات اسی میں ہے کہ ہم اپنے کردگار کی طرف رجوع کریں ۔ موجُودہ رُوحانی خلاء یقیناً خدا کو ناپسند ہے ۔ نجات کا اس وقت واحد وسیلہ یہ ہے کہ ہم مذہب کے سلسلہ کو مضبوط پکڑے رہیں ۔ ایسا وقت آنے کی ہر مذہب و ملت کے بزرگوں نے پیشینگوئیاں کی ہیں ۔ سب جاننے لگ گئے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ انسان اپنے پروردگار کے سامنے جھکے تب رحمتِ کبریائی جوش میں آئے گی ۔ ہمیں چاہیئے مذہب کیطرف متوجہ ہوں ۔ مادہ پرستی کو دھتکار دیں رُوحانیت سے ہم آغوش ہو جائیں ۔

پروفیسر جوڈ اور دیگر علمائے یورپ اس نکتہ کو بھانپ گئے ہیں اور میری رائے میں بھی ترک مادیت اور تجدید دیانت یہی دو وسیلے ہیں جو موجُودہ دُنیا کو گرداب فنا سے نکال ساحل نجات تک پہنچا سکتے ہیں ۔

(مولانا) عبدالقادر

رفتارِ زمانہ

۲ ر جولائی ۱۹۴۲ء کو دارالعوام میں ایک نہایت اہم بحث ہوئی ۔ اس بحث کا ان دنوں بہت چرچا رہا ہے ۔ چند ممبران نے موجودہ حکومت کیخلاف تحریک عدم اعتماد پیش کی ۔ اس بنا پر کہ حکومت کی جنگی رہنمائی ناقص ہے ۔ لمبے چوڑے مباحثہ کے بعد ۴۷۵ ووٹیں اس تحریک کے خلاف آئیں اور صرف ۲۵ اس کے حق میں ۔ یہ واقعہ مسٹر چرچل کی حکومت کی نمایاں کامیابی سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس سے دنیا کو پتہ چل گیا کہ باوجود لیبیا کی ہار کے برطانوی قوم موجودہ حکومت کی حمایت پر تلی ہوئی ہے

مسٹر چرچل کی اپنی تقریر اس مباحثہ کی اہم ترین خصوصیتوں میں سے ایک تھی ۔ یہ تقریر ہر لحاظ سے ایسی اچھی تھی کہ اگر تاریخ بشر میں بہترین جنگی تقریریں چنی جائیں تو یہ تقریر ان میں ضرور شمار ہوگی ۔

اس تقریر کی ایک خصوصیت وہی مسٹر چرچل کی راست گوئی ہے جو محوری پیشواؤں کی تقریروں میں ڈھونڈے نہیں ملتی ۔ آپ نے اپنے نقصانات اور حادثات بلاکم وکاست بیان کر ڈالے اور دارالعوام کو اطمینان دلادیا کہ یہ سب تباہیاں مرکزی رہنمائی کے ناقص ہونے کی وجہ سے رونما نہیں ہوئیں بلکہ انہیں محض قسمت کے پھیر سمجھنا چاہیئے ۔ اس مباحثہ کا ایک اور پہلو جو ساری دنیا کی نگاہ میں اہمیت لئے ہوئے ہے یہ تھا کہ ممبران پارلیمنٹ کو جنگ کے زمانہ میں بھی کتنی زیادہ آزادی حاصل ہے اور مسٹر چرچل نے بجا طور پر دعوےٰ کیا کہ اور ممالک اور جمہوری حکومتیں اس نعمت سے محروم ہیں ۔ اس شاندار کامیابی سے تمام متحدین اور اُن کے ہوا خواہ نہایت درجہ مسرور ہوئے ۔

برطانوی قوم کا یقین روز بروز قوت پکڑ رہا ہے کہ متحدین کی طاقت بڑھ رہی ہے اور انجام کار متحدین کا ہی بول بالا رہے گا

آسٹریلیا کے وزیر امور خارجہ ڈاکٹر ایوٹ برطانیہ اور اضلاع متحدہ امریکہ میں تین مہینے دورہ کرکے ابھی آسٹریلیا لوٹے ہیں ۔ آپ نے اپنے ایک بیان میں برطانوی قوم کے اس یقین کی طرف بدیں الفاظ اشارہ کیا ہے :-

"اس کے بعد ہمیں کوئی زک نہیں ہوگی ۔ اگر آپ لوگوں کو معلوم ہوجائے کہ برطانوی قوم کتنی تلی ہوئی ہے اور کیا کچھ کر رہی ہے تو آپ خود ہی سمجھ جائینگے کہ اس لڑائی کا ایک ہی انجام ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے تمام دشمنوں پر فتح پائیں گے ۔"

برطانوی قوۂ فضائی کا تازہ ترین حملہ برمین پر

ہُوا جو جرمنی کا نہایت اہم جنگی صنعتی مرکز ہے۔ اس
حملہ میں ہزار سے زائد بمبار تھے اور وہ آگ برسائی کہ اس
کی نظیر نہیں ملتی۔ اس ہفتہ میں بہت سے ناخوشگوار
واقعات پیش آتے ہیں اور اس حملہ کا اسی ہفتہ میں
ہونا نہایت برمحل تھا اور اس سے ہماری موافق خبروں
میں بھی اضافہ ہوگیا۔ جرمنی اس کشمکش و پیچ میں ہے
کہ اس کے بعد برطانوی بمبار اور کہاں برسیں گے۔

برطانوی قوۂ فضائی کا ذکر کرتے ہوئے
فالح رفقی آتائے ترکی اخبار اولس مورخہ ۲ر جون میں
یُوں رقمطراز ہے:-

"۱۹۴۰-۴۱ء میں لندن میں یہ حالت تھی کہ سر چھپانے
کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ اب وہی برطانوی جزیرہ رُوم میں
محوری فضائی طاقت کا منہ توڑ جواب دے رہے ہیں
ہندوستان اور آسٹریلیا کے بچاؤ کے لئے جاپانی
قوۂ فضائی سے ٹکرا رہے ہیں۔ رُوس کو طیارے
بھیج رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ہزار ہزار بمباروں
سے جرمنی پر بھی حملے کر رہے ہیں۔ پہلے یہ خیال کیا جاتا
تھا کہ برطانویوں کا یہ دعویٰ کہ ہمارے ذرائع بہت ہیں
اور ہم بڑا جنگی سامان بنا رہے ہیں نرا دعوے ہی
دعوے ہے لیکن اب ثابت ہوگیا کہ وہ خیال کس قدر
بے جا تھا۔"

جنگ لیبیا ختم ہوگئی۔ سرِدست روّمل کی آہنی
قوت کی جیت ہوئی۔ طبرق بھی گیا اور اس کے جانے پر
سب کو تعجب ہے۔ متحدین کی قوائے بہت سا اسلحہ اور
جنگی سازوسامان کھو بیٹھیں۔ آٹھویں فوج اور روّمل
کی زرہ پوش قوائے کے درمیان سرزمین مصر میں گھمسان
کی لڑائی ہو رہی ہے۔ دشمن کی ہمہ گیر پیشقدمی اب
رُک گئی ہے۔ متحدین قوائے کا حوصلہ تل بھر نہیں گھٹا۔
وُہ اپنی سابقہ جرأت اور تندی کے ساتھ دشمن سے
بھِڑ پڑی ہیں۔ اسلحہ اور تازہ دم فوج کی کثیر تعداد مصر
پہنچ چکی ہے اور زائد کمک بھی پہنچا چاہتی ہے۔

برطانوی حکومت نے پہلے ہی مصری حکومت کو
یقین دلا دیا تھا کہ ہم مصر کے بچاؤ کے لئے آخر دم تک
لڑیں گے۔ اور اب وہ اس وعدہ کو پوری قوت سے پورا
کر رہی ہے۔ مصر جمہوریتوں کے نصب العین کا سراسر
حامی ہے۔ مصر کے وزیر اعظم اور مصری قوم کے نہایت
ہر دلعزیز قائد نحاس پاشا نے کئی بار کھلے بندوں اعلان کیا
ہے کہ مصر اپنے معاہدۂ دوستی پر نہایت خلوص اور
استقلال کے ساتھ کاربند ہے۔ محور نواز سابق وزیر اعظم
علی مہر پاشا کی گرفتاری کے جواز میں گذشتہ اپریل تقریر
کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:-

"ہماری سیاست خارجہ صرف یہ ہے کہ مصر اس لڑائی
میں نہ اُلجھے۔ لیکن مصری حکومت کسی مصری کے ایسے
رویہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی جس سے ہمارے حلیف
(برطانیہ) کی افواج کی سلامتی خطرہ میں پڑ جائے

یا جو لوگ اس وقت جمہوریت اور آزادی کی بقا کے لئے جنگ آزما ہیں انہیں کوئی پریشانی لاحق ہو جائے۔ یہی میری پالیسی ہے۔ میں چاہتا ہوں ہمارے حلیف کو اس کا پتہ چل جائے۔ میں چاہتا ہوں اس کی افواج کو بھی پتہ چل جائے جو حق اور انصاف کے بچاؤ کے لئے میدانِ جنگ میں طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کر رہی ہیں"

مصری پارلیمنٹ نے وزیر اعظم کی پالیسی سے کلّی اتفاق کرتے ہوئے مصری حکومت کے حق میں ایک بے پناہ اکثریت سے (۱۸۵ ووٹ حق میں اور ۵ خلاف) تحریک عدم اعتماد پاس کر دی۔ نحاس پاشا کی زبان وفد پارٹی کی زبان ہے اور وفد پارٹی کی زبان مصر کی زبان ہے۔

اس میں کلام نہیں کہ اس وقت مصر کی لڑائی کو مگو کی حالت میں ہے اور بڑی مشکلات اور بڑے خطرے پیش نظر ہیں تاہم متحدین کی تو لے ایک فائدہ میں ہیں وہ یہ کہ اب وہ اپنے رسدی اڈوں کے نزدیک ہیں اور سامان رسد میں کوئی کمی نہیں۔ علاوہ بریں توپخانے بھی سب کے سب نزدیک ہیں اور توپخانوں اور طیاروں کے مشترکہ حملے محوری پیشقدمی میں کڑی اور پُر خطر رکاوٹیں پیدا کر سکتے ہیں۔

سیباسٹوپول گیا یا جانے کو ہے۔ روسی مدافعین نے اپنی شجاعت اور استقلال کی روایات کو قائم رکھا۔ اُن کی مقاومت بیکار نہیں گئی کیونکہ محوری سپاہ اور اسلحہ نہایت کثیر تعداد میں تلف ہوئے۔

ادھر جرنیل ٹموشینکو نے بھی خارخوف کے محاذ پر آفت ڈال رکھی ہے اور روسی قدم قدم پر لڑ مر رہے ہیں ٹموشینکو کے جوابی وار پہلی سی شدت کے ساتھ جاری ہیں بلکہ زیادہ کاری ہو رہے ہیں۔ جرمن حملہ جس کی خبر مدت سے گرم رہی ہے ابھی تلک شروع نہیں ہوا۔ اب تو بہت دیر ہو گئی ہے۔ موسم گرما نصف سے زیادہ تو گذر چکا ہے۔ کچھ بھی ہو روس تن من دھن سے ہر حملہ کے مقابلہ کے لئے تیار کھڑا ہے۔ علاقہ یورال اور شرقی جمہوریتوں میں جنگی کارخانے پورے زوروں پر ہیں۔ رُوس میں تیل اور دھات کی زیادہ افراط ہو رہی ہے۔ اب تو روس کا برطانیہ سے نیا معاہدہ دوستی ہو چکا ہے اور یہ دو نو بڑی قوتیں ایسی آپس میں جُڑ گئی ہیں کہ اب تک کبھی نہ جڑی تھیں۔

متحدین روس کو پہلے ہی بہت کمک بھیج چکے ہیں اور مزید کمک جاری ہے۔ حالانکہ راستہ میں دشمن کے حملوں کی وجہ سے بہت سے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں اور بہت سے خطروں کا سامنا رہتا ہے۔

جیسا کہ مسٹر چرچل نے ۲ جولائی کو فرمایا درحقیقت جب سے برطانیہ کا ہندوستان سے تعلق ہوا ہے ہندوستان کے اندر کبھی بھی اتنی جنگی قوت جمع نہیں ہوئی جتنی کہ اب جرنیل ویول کی کمان میں یہاں

یہ موجود ہے۔ جنگی کارخانے پوری شدت سے کام کر رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں میں تو باہمی کشمکش جاری ہے لیکن عامۃ الناس سمجھ رہے ہیں کہ ہمارا وطن خطرہ میں ہے۔ اور وہ تن من دھن سے جنگی جدو جہد میں حصّہ لے رہے ہیں۔ ایگزیکیٹو کونسل کی بھی توسیع ہوگئی ہے اور تمام فرقوں بالخصوص سکھوں اور اچھوتوں کی پوری نمائندگی اسے اب حاصل ہوگئی ہے۔ اس توسیع اور نئے ممبروں کے انتخاب سے ہندوستان کی امنگیں زیادہ تر پوری ہوگئی ہیں۔ دفاع کی وزارت جس کی خاطر اتنی لے دے رہی ہے اب ایک نامور ہندوستانی یعنی سر فیروز خان نون کے سپرد ہوگئی ہے اور اب امید ہے کہ جنگی جدو جہد انتہائی زور پکڑ جائے گی۔

چین میں جاپانیوں اور چینیوں میں شدت کے ساتھ لڑائی ہو رہی ہے۔ تازہ ترین اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ چینیوں نے دوہانگ کے شمال مشرق میں ایک جاپانی حملہ کو روکا اور جاپانی بہت نقصان اُٹھا کر پسپا ہوئے۔ چینیوں نے لوچینگ سے ۸۰ میل جنوب مشرق کی طرف ٹنگ شنگ ریلوے لائن پر قبضہ کر لیا ہے۔ سینیا ریلوے لائن کے اس حصّہ کو بھی جہاں سے جاپانی فوجیں ہینکو کی طرف گذرتی رہی ہیں چینیوں نے تباہ و برباد کر ڈالا ہے۔

چیکوسلواکیہ میں نازیوں کی طرف سے قتل و غارت جاری ہے۔ چیک قوم نئے نازی نظام کی مخالفت میں ڈٹی ہوئی ہے۔ مختلف علاقوں میں چیکوں کیطرف سے بھی چھاپہ بازی اور تباہکاری جاری ہے۔ انہیں اپنی نجات کا پورا یقین ہے اور وہ اپنے قومی شاعر جوزف سلاویک کا ایک شعر پڑھتے رہتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے:۔ کہ بہار کے جان آفرین جھونکے چلیں تو ہم بھی مرجھائے ہوئے گھاس کی طرح پھر سرسبز ہو کر لہلہانے لگیں گے۔

کابل میونسپل کمیٹی نے گیہوں اور گھی کے ورود اور فروش پر سے ساری بندشیں اُٹھا دی ہیں۔

موضع قیصر (ضلع بغلان) میں ایک توانا اور صحت مند شخص سکندر شاہ خان نامی موجود ہے جسکی عمر ۱۳۰ برس کی بتلائی جاتی ہے۔

اعلیحضرت ہمایونی نے افغانستان کی میطرفی کا پھر اعادہ فرمایا۔ اور نئے امریکن سفارت خانہ کا ذکر کرتے ہوئے اعلیحضرت نے اس امید کا بامسرت اظہار فرمایا کہ عنقریب افغانستان اور اضلاع متحدہ امریکہ کے درمیان بہتر اقتصادی تعلقات قائم ہو جائیں گے۔

افغان بیوپاری بیجا نفع اُٹھانے کی نیت سے مال التجارت جمع کرتے رہے ہیں قیمتیں بہت ہی بڑھ گئی ہیں۔ حکومتِ افغانستان ان مشکلات کے رفع کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔

چترال

ہندوستان کے انتہائی شمال مغربی کونہ میں دشوار گذار پہاڑوں میں گھری ہوئی اور دنیا سے الگ تھلگ ایک ریاست واقع ہے جسے چترال (یا قشقار) کہتے ہیں۔

ہے تو یہ چھوٹی سی ریاست لیکن جغرافیائی، تاریخی اور سیاسی نقطۂ نظر سے اُسے نہ صرف صوبۂ سرحد میں بلکہ ہندوستان بھر کی ریاستوں میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے شمال میں رُوس ہے اور جنوب میں ریاست دیر۔ ایک طرف افغانستان دوسری طرف کشمیر۔ چینیوں نے مدتوں اس علاقہ کو میدانِ کارزار بنائے رکھا۔ درمیانی ایشیا کی جنگجو قومیں اسی راستہ سے ہندوستان میں داخل ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ سکندرِ اعظم کا بھی پہلے پہل یہ ارادہ تھا کہ اسی راستہ سے ہندوستان پر اتر آئے۔

چترال میں ہموار میدان کہیں کہیں نظر آتے ہیں اور وہ بھی چھوٹے چھوٹے۔ انہیں پر تھوڑی بہت کھیتی باڑی ہو جاتی ہے۔ ہر طرف جنگل بھرے پہاڑ ہی پہاڑ ہیں جن کی چوٹیاں بارہ مہینے برف سے ڈھکی رہتی ہیں۔ پہاڑوں کے دامنوں میں سرسبز لہلہاتے کھیت، میوہ دار درختوں کے باغات۔ خودرو خوش رنگ پھول اور دلکش چشمے اور آبشاریں نظر آتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو قدرت کے رنگا رنگ دلفریب مناظر کے لحاظ سے چترال کشمیر اور یورپ کے بہترین علاقوں کے ساتھ لگا کھا سکتا ہے۔

اس خطہ میں معدنیات جن میں سے گندھک اور ابرک خاص طور پر قابل ذکر ہیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

یہاں کی آب و ہوا بہت سرد اور صحت کیلئے نہایت مفید ہے۔ زمین شاداب اور زرخیز ہے پر بہت کم ہے۔ باشندے زیادہ تر پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتے ہیں بھیڑ بکریاں وغیرہ چرا کر گذر اوقات کرتے ہیں اور بہتوں کا مدار اُونی اشیا کی بافت اور تجارت ہے۔ ان وجوہات سے یہاں کے باشندے بالعموم صحت مند جفاکش اور بہادر ہیں۔

اس ریاست کا دارالخلافہ بھی چترال کہلاتا ہے ۱۹۰۱ء کی مردم شماری کی رو سے دارالخلافہ کی آبادی آٹھ ہزار ہے۔ اس ریاست کے والی کو "مہتر چترال" کہتے ہیں۔ فارسی میں سردار کو مہتر بولتے ہیں۔

چترال جانے کے یوں تو کئی راستے ہیں مگر زیادہ مشہور اور اہم دو ہیں۔ ایک تو گلگت کا پہاڑی راستہ جو درۂ شاندور میں سے ہو کر جاتا ہے اور دو سو میل لمبا اور سطح سمندر سے بارہ ہزار ڈھائی سو فٹ اونچا ہے۔ دوسرا راستہ مالاکنڈ چکدرہ سے دیر اور ماجوڑ ریاستوں میں سے گذرتا ہے اس راستہ میں تو باری درہ بھی آتا ہے جو سطح سمندر سے دس ہزار چار سو بچاس فٹ اُونچا ہے۔ یہاں ایک فوجی چوکی بھی ہے۔

هزهائی نس مهتر صاحب دچترال د پېښاور په ریلوې سټېشن باندې ۔ دا تصویر هغه وخت اخستے شوے دے کله چه دوی حج بیت الله شریف ته روانیدل

ہز ہائی نس مہتر چترال پشاور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ۔ آپ حج بیت اللہ شریف کے لئے روانہ ہو رہے ہیں ۔ ؞

ہندوستان اور صوبہ سرحد سے چترال کو سب سے آسان اور
چھوٹا راستہ یہی ہے۔

شہر چترال سے لگ بھگ تیس میل دور لٹکو درہ میں
ایک گرم پانی کا چشمہ ہے جسے گرم چشمہ ہی کہتے ہیں۔ یہ پانی
ہر وقت اُبلتا رہتا ہے اور گندھک کی بُو اٹھتی رہتی ہے۔
پانی میں یہ صفت ہے کہ اس میں ایک ہی دفعہ نہانے
ارش، پھوڑے، پھنسیاں غرض سارے
تے ہیں۔ یہ پانی ہاضمہ کے لئے
کی طرف سے اس چشمہ کے
چشمہ کا

کے صدر کی حیثیت سے آخر دم تک انتہائی خلوص کے
ساتھ اس درسگاہ کی ترقی کے لئے جد و جہد کرتے رہے
آپ کی محبت اور عقیدت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ
آپ نے اپنے شاہزادوں اور شاہی خاندان کے دیگر
نوجوانوں کو اسی کالج میں دینی اور دنیوی تعلیم دلوائی
ایک بڑا مقصد اُن کا یہ بھی تھا کہ یہ حضرات سرحد
کے ہر طبقہ کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہیں۔ اور
اجتماعی زندگی کا طرز و طریقہ سیکھ لیں۔

شاہی خاندان کے افراد نے بھی آپ کی خواہش
احسن طریقہ سے پوری کی اور نہ صرف اپنی قابلیت اور
خلق کی بلکہ اسلامی اخوت اور مساوات کی یادگاریں
چھوڑ گئے ہیں۔

ل کے شاہی خاندان کی خداداد ذکاوت۔ پاس
ب اور دیگر اخلاق حسنہ کی بہترین
کے موجودہ مہتر صاحب ہز ہائینس
ناصر الملک صاحب بہادر ہیں
نہ صرف اسلامیہ کالج اور چترال
ان کی ریاستیں بھی نازاں ہیں
۲۹ر ستمبر ۱۸۹۷ء ہے۔
ابق آپ نے اسلامیہ کالج
اسکول کا
رہا ہے
ہی

آپ نے اپنے خاص ذاتی محاسن سے اپنے خاندان کا نام اور بھی روشن کر دیا اور آپ کی تعلیمی زندگی ہر نوجوان کے لئے مشعل ہدایت ہے۔

آپ کی ذکاوت کا یہ عالم ہے کہ آپ ہر امتحان میں حتیٰ بی۔ اے کے امتحان میں بھی اول نمبر پاس ہوئے دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کا رجحان شروع ہی سے دینیات اور علوم شرقی کی طرف رہا ہے۔ نماز روزہ کے ہمیشہ پابند اور دیگر مذہبی دھندوں میں سب سے بڑھے چڑھے رہتے تھے۔ آپ کی طرز بود و باش نہایت ہی سادہ تھی۔ شہزادگی کی بو باس ذرہ بھر آپ میں نہ تھی۔ اسکول کے استاد اور کالج کے پروفیسر "شہزادہ چترال" کا ذکر اپنے شاگردوں میں مثال کے طور پر کیا کرتے ہیں۔

ان اوصاف کے علاوہ زمانہ طالب علمی ہی میں تقریر اور تحریر کا اعلےٰ قسم کا ملکہ بھی ان میں موجود تھا۔ چنانچہ اپنے ایام کالج ہی میں آپ نے ایک مذہبی رسالہ تحفۃ الابرار کے عنوان سے لکھا جس سے آپ کے دینی مطالعہ اور تحقیق کا اندازہ لگ سکتا ہے۔

اسلامیہ کالج کی "خیبر یونین" کے آپ صدر رہے ہیں۔ اور یہی آپ کے اعلیٰ منفرد ہونے کا کافی ثبوت ہے

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ۱۹۲۶ء میں آپکو ہندوستانی فوج میں آنریری لفٹیننٹ کا رتبہ ملا۔ ۱۹۳۲ء میں آپ افغانستان کی سرحدی کمیشن میں حکومت برطانیہ کی طرف سے نمایندہ مقرر ہوئے۔ ۱۹۳۶ء میں آنریری کپتان ہوئے اور آجکل میجری کے اعزازی رتبہ پر فائز ہیں۔ اسی دوران میں تھوڑے عرصہ کے لئے کوہاٹ اور مردان میں بطور اسسٹنٹ کمشنر تعینات رہے جہاں جہاں رہے وہاں آپ کی قابلیت۔ شرافت۔ انصاف اور دینداری کی یاد تازہ ہے۔

جب آپ نے عنان ریاست اپنے ہاتھ میں لی تو آپکے تمام اوصاف جلیلہ امور حکمرانی پر پرتو افگن ہونے لگے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف اہالئے ریاست ہی آپکے مدّاح ہوگئے بلکہ آپ کی قابلیت فراست اور حسن اخلاق کا شہرہ دور دور تک پہنچنے لگا۔

اپنی جانشینی کے تھوڑے ہی عرصہ بعد آپ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لیگئے۔ اور واپسی پر اپنی رعایا کی بہبودی اور ترقی کے لئے کوشاں ہو گئے۔ اپنے والد بزرگوار کی طرح آپ بھی اسلامیہ کالج کی منتظمہ کمیٹی کے صدر ہیں اور اس مدرستہ العلوم کی اصلاح اور ترقی کے لئے منہمک رہتے ہیں۔

آپ کے عہد میں چترال نے بہت کچھ ترقی کی ہے۔ بنجر اور غیر آباد زمینوں کی آبپاشی کا اعلےٰ انتظام ہو گیا ہے۔ رعایا میں تعلیم کا ذوق بہت پھیل گیا ہے۔ مہمانوں اور مسافروں کی رہائش کے لئے دریا کے کنارے اور باغات میں کوٹھیاں اور مہمان خانے بنائے گئے ہیں۔ اداروں کی اصلاح زیر غور ہے۔ فوج کیلئے نئی بارکیں بن رہی ہیں۔ قوی امید ہے کہ آپ کے زیر سایہ

یہ ریاست بہت جلد ترقی کے اور بھی مدارج طے کریگی۔

آپ نہ صرف محقق اور مصنّف ہی ہیں بلکہ بڑے پایہ کے شاعر بھی ہیں یہ امتیاز والیان ریاست میں کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ مسئلہ "ارتقا" پر آپنے ایک لمبی فارسی نظم لکھی ہے جو "صحیفۃ التکوین" کے عنوان سے ایک کتاب کی صورت میں شایع ہو چکی ہے۔ یہ آپ کا قابل فخر شاہکار ہے۔ مغرب اور مشرق کے بعض بڑے بڑے علماء فلاسفروں اور مفکروں نے اس تصنیف کی بیحد تعریف کی ہے۔ اس کی زبان سادہ بامحاورہ اور دلآویز ہے ارتقاءِ بشر کے دقیق مسئلہ پر کلام اللہ اور احادیث کی روشنی میں نہایت بصیرت افروز بحث کی گئی ہے۔

ایک اور صفت جو والیان ریاست میں نادر ہے۔ آپ میں بدرجۂ احسن پائی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ آپ اپنے بھائیوں سے نہایت محبّت اور شفقت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور وُہ بھی آپ کا اپنے والد یا مرشد کی طرح احترام کرتے ہیں۔ آپ کے چند بھائی انگریزی فوج میں ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔

اپنے والد بزرگوار کی طرح آپ بھی علماء اور مشایخ کا بہت احترام کرتے ہیں۔ سائینس۔ فلسفہ۔ جغرافیہ۔ ادبیات اور دیگر دینی اور مادی علوم پر آپ کو بہت عبور ہے اور اکثر اوقات علماء کے ساتھ علمی بحث مباحثہ رہتا ہے

آپ کی مہمان نوازی کا یہ عالم ہے کہ آپ کے دسترخوان پر مہمانوں کا جمگھٹا رہتا ہے اور آپ دونو وقت ایک ہی دسترخوان پر سب کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں۔

ایک اور نادر صفت آپ میں یہ ہے کہ اپنے طالب علمی کے زمانے کے دوستوں اور ملنے والوں سے آپکا برتاؤ ویسا ہے جیسا اُس وقت تھا۔ سب کے ہاں آنا جانا ہے اور اُن کی خوشی اور غم میں شریک رہتے ہیں۔ جب کبھی آپ ہندوستان آتے ہیں تو اپنے سارے دوستوں کو پہلے ہی سے مطلع کر دیتے ہیں اور اُن سے نہایت خلوص کے ساتھ ملتے ہیں۔

یہی اوصاف ہر اسلامی حکمران میں ہونے چاہئیں اور یہی اوصاف قرونِ اولیٰ کے بہترین مسلمانوں میں موجود تھے۔

مرغلرے

(نثر)

۱:- خَیْرُ الزَّادِ التَّقْوٰی۔ (آیت شریف)

ترجمه:- بهترینه توښه (دَ آخرت) پرهیزګاري ده۔

۲:- مَا هَلَكَ امْرُؤٌ عَرَفَ قَدْرَهٗ۔ (حدیث شریف)

ترجمه:- هغه سړے به نه هلاکیږي چا چه خپل قدر اوپیژندو

۳:- اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهٗ۔ (حدیث شریف)

ترجمه:- ګناه نه توبه کوونکے داسے دے لکه چه ګناه ئے هډو کړے نه دي

۴:- دولت په آرزو - جواني په وسمو (خضاب، ټکولو) او صحت په دارو نه حاصلیږي۔ (حضرت ابوبکر صدیق رض)

۵:- کوم سړے چه خپل سر از بیته ساتي هغه خپله سلامتي بخپله قبضه کښ ساتي۔ (حضرت عمر فاروق رض)

۶:- په ځائی وَدے چه ته دَ خدائے تعالیٰ په نزد دیا کار ثابت شے دا بهتره ده چه خلق دے ګنهګار اوګڼي۔ (حضرت عثمان غني رض)

۷:- په حرص روزي د هیچا نه زیاتیږي
ولے قدر ئے ضرور په دے کمیږي (حضرت علي کرم الله)

۸:- مرګ یاد ساتل دَ نفس دَ ټولو رنځونو دارو دی۔ (حضرت غوث الاعظم)

۹:- دَ دنیا مصیبتونه په ظاهر کښ بد ښکاري خو په حقیقت کښ دَ ترقئ موجب دي۔ (حضرت مجدد الف ثاني)

۱۰:- دَ خداوند کریم په ټولو نعمتونو کښ حکمته دټولو نه لوئے نعمت دے او حکیم هغه سړے دے چه دَ هغه قول او فعل دواړه یو شان دي۔ (افلاطون)

لطیفه

ؔ نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدمؑ یہ بیسنی روٹی

جس وقت چوبدارِ شاہی یہ اولوش لے کر آیا ایک باہر کا رہنے والا طالب علم جو مرزا غالب سے کچھ پڑھا کرتا تھا موجود تھا چوبدار کے چلے جانے کے بعد اس نے مرزا صاحب سے متعجب ہو کر پوچھا کہ بیسنی روٹی ایسی کیا نادر چیز ہے کہ بادشاہ کے دربار سے بطورِ اولوش تقسیم ہوتی ہے؟ مرزا نے کہا " ارے احمق! چنا وہ چیز ہے کہ اس نے ایک دفعہ جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی کہ دنیا میں مجھ پر بڑے ظلم ہوتے ہیں۔ مجھے دلتے ہیں، پیستے ہیں، بھونتے ہیں، پکاتے ہیں اور مجھ سے سینکڑوں چیزیں بنا کر کھاتے ہیں۔ جیسا مجھ پر ظلم ہوتا ہے ایسا کسی پر نہیں ہوتا۔ وہاں سے حکم ہوا۔ کہ " اے چنے تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے سامنے سے چلا جائے، ورنہ ہمارا ابھی یہی جی چاہتا ہے کہ تجھ کو کھا جائیں۔

شنٹو

۱۹۲۸ء میں ایشیائک سوسائٹی کا سالانہ جلسہ ٹوکیو کے جرمن سفارت خانہ میں قرار پایا۔ یورپ۔ امریکہ وغیرہ کے بہت سے عالم مورخ اور مدبر بھی موجود تھے۔ ایک جاپانی ادیب پروفیسر ہوفنشی ہوریکا نے تقریر کرتے ہوئے بیان کیا:۔

ہمارا نہائیت پرانا لیکن پکا عقیدہ ہے کہ سورج کی دیوی اماتراسواومی کامی نے پہلے پہل اپنی اولاد کو جاپان کی سلطنت سونپتے ہُوئے کہا تھا:۔ "میرے بچے دیوتاؤں کی حیثیت سے جاپان پر راج کرتے رہیں گے"۔

اخبار جاپان ٹائمز کے ایک سرمقالہ میں یہ عبارت پائی جاتی ہے:۔ "مغربی اقوام جاپانی قوم کی بنیادی ماہیت کو اکثر بھول جایا کرتی ہیں۔ صدیوں سے بیرونی افکار وقتاً فوقتاً سیلاب کی طرح آیا کئے۔ لیکن جاپان کا شاہی گھرانا سورج کی مانند قائم رہا۔ وُہ افکار اس سے ٹکرا کر اپنا زور کھوتے اور اپنی اپنی حقیقت پاتے گئے۔ جاپانی قوم کا ہمہ گیر روحانی عنصر جس کی تعریف بن نہیں آتی یہی شہنشاہ جاپان کا وجود ہے۔ کوئی بیرونی فکر عام اس سے کہ بدھ مت ہو یا عیسائیت ڈیماکریسی (جمہوریت) ہو یا سوشلزم (اجتماعیت) جب تک اس وجود کی روایات کا متبع ہو کر نہ رہے جاپان میں رہ نہیں سکتا اور نہ ہی جاپانی قوم کے نزدیک اس کا کوئی پاس ہوتا ہے۔ جن خداؤں نے ہمیں بنایا ہمارا شہنشاہ انہی کی اولاد میں سے ہے اس لئے جاپانی قوم کے دل میں اس کی نہائیت گہری حرمت ہے۔ بلکہ شہنشاہ کا نام لیتے ہی ہر جاپانی پر ایک ہیبت طاری ہوجاتی ہے اور اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بتانا کہ یہ کیفیت کیونکر پیدا ہوتی ہے اور کہاں تک جائز ہے عبث ہے۔ اُس کا وجود ہی اس کا جواز ہے"۔

ان اقتباسات میں جاپانی قوم کے ایمان کا نچوڑ موجود ہے۔ یہی اس کا مذہب یہی اس کا مسلک ہے اور اسی کو "شنٹو" کہتے ہیں۔

شنٹو "شن" اور "ٹو" کا مرکب ہے جاپانی زبان میں "شن" کے معنی "خدا" اور "ٹو" کے معنی "راستہ" ہیں۔ شنٹو سے مراد خداؤں کا راستہ یا مذہب ہے۔

ابتدا میں جاپانی تمام عناصر و مظاہر قدرت کو خدا سمجھتے تھے اور انہیں پوجتے تھے۔ سورج، چاند، آندھی، آگ، زمین پہاڑ، زلزلہ، کوہ آتش فشاں، کنواں، چشمہ، پتھر، سانپ، شیر، بھیڑیا، سوٴر، خرگوش، ریشم کا کیڑا، ترکاری، اناج وغیرہ ذالک۔ یہ سب کے سب ان کے دیوتا رہے ہیں کسی مرد یا عورت سے کوئی خاص بڑائی ظہور میں آئی اور وہ مرد دیوتا اور وہ عورت دیوی بن گئی۔ جاپان میں بے شمار مندر ہیں جنہیں ان دیوتاؤں دیویوں کی پُوجا کی جاتی ہے۔ اعضائے تناسل کی لکڑی یا پتھر کی مورتیں مندروں گھروں اور کھیتوں میں رکھی

رہتی ہیں اور اُن کی پرستش کی جاتی ہے ۔

یہ صحیح ہے کہ ۱۸۷۲ء میں جاپانی حکومت نے بہت سے "تناسلی" مندر گرا دیئے تاہم دیہات میں اس قسم کی پرستش اب بھی عام ہے اور بنے بنائے اعضائے تناسل ہزاروں بکتے ہیں ۔ لیکن ان سب دیوتاؤں دیویوں میں سے سب سے زیادہ عظمت اور حرمت سورج کی دیوی کی ہے جس کا نہایت عالیشان مندر آئیسی میں موجود ہے ۔ اور اسی دیوی کے ارضی نمائندہ یعنی شہنشاہ میکاڈو کا وجود ہمیشہ مقدس سمجھا گیا ہے اور سلطنت کا حق اُسی کا تسلیم کیا گیا ہے۔

جاپانیوں کا دعوےٰ ہے کہ یہ شاہی گھرانا تقریباً تین ہزار سال سے جاپان میں راج کرتا آیا ہے ۔ جاپان کی تواریخ بتاتی ہے کہ سولھویں صدی تک تو جاپان میں طائف الملوکی کا دور دورہ رہا ۔ اور قبائل ایک دوسرے کے دست و گریبان رہے ۔

جس قبیلہ کے قبضہ میں شہنشاہ جاپان ہوتا تھا اسی کا پلّہ بھاری رہتا تھا ۔ لہٰذا شہنشاہ پر قبضہ پانے کے لئے ان قبائل میں آپس میں کھینچا تانی رہتی تھی ۔ بلکہ کشت و خون بھی ۔ شہنشاہ آج کسی کے قبضہ میں کل کسی کے ۔ پایۂ تخت بھی بدلتا رہتا تھا ۔ کبھی نارا تھا کبھی کیوٹو ۔ کبھی کاما کارا ۔ سولھویں صدی سے شوگن ڈکٹیٹری کا دورہ شروع ہوا جو تقریباً سوا دو سو برس تک قائم رہا ۔ اس عرصہ میں شہنشاہ ڈکٹیٹروں کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی تھا ۔ اور یہی کیفیت ٹوکوگاوا کے دور میں رہی جو ڈھائی سو برس قائم رہ کر ۱۸۶۸ء میں خاتمہ پذیر ہوا ۔ اس سارے عرصہ میں میکاڈو کا وجود تو مقدس سمجھا جاتا رہا ۔ لیکن امورِ سلطنت میں اسے کوئی قابلِ ذکر دخل نہ تھا ۔ بعض شہنشاہوں کو تو نہایت عسرت کی زندگی گذارنا پڑی ۔

موجودہ میکاڈو کا پڑدادا کومی تینو کے بارے میں ایک جاپانی مصنف سنتارو لکھتا ہے کہ تمام شہنشاہوں میں سے سب سے زیادہ قابلِ رحم حالت اس شہنشاہ کی رہی ہے ۔ اُسے اپنی بہن کا بیاہ مجبوراً اسی غاصب گھرانے کے ایک فرد کے ساتھ کرنا پڑا ۔ یہ شہنشاہ شراب کا بہت دلدادہ تھا لیکن اچھی شراب خریدنے کی اس میں استطاعت نہ تھی ۔

لیکن ۱۸۶۸ء کے بعد سے میکاڈو کا اقتدار و عروج حقیقی معنوں میں بڑھتا رہا ہے اور سیاسی ضروریات کے پیشِ نظر "میکاڈو پرستی" بہت زور پکڑ گئی ہے ۔ اور جاپان اسے اپنی جہانگیرانہ امنگوں کے پورا کرنے کا نہایت موثر آلہ سمجھنے لگا ۔ اب کیفیت یہ ہے کہ جاپانی نسل اپنے آپ کو ایک کُنبہ اور میکاڈو کو اس کا "کرتا" سمجھتی ہے ۔ ہر جاپانی کا ایمان ہے کہ جاپانی قوم ایک آسمانی قوم ہے ۔ اور میکاڈو خداؤں کا ارضی نمائندہ ہے ۔ اس لئے جاپانی قوم تمام اقوامِ دنیا سے برتر اور اُن پر

په لندن کښې د امریکائي بحري قوی د شاه ځلمو یوه دسته

ایک امریکن بحری دستہ لندن میں
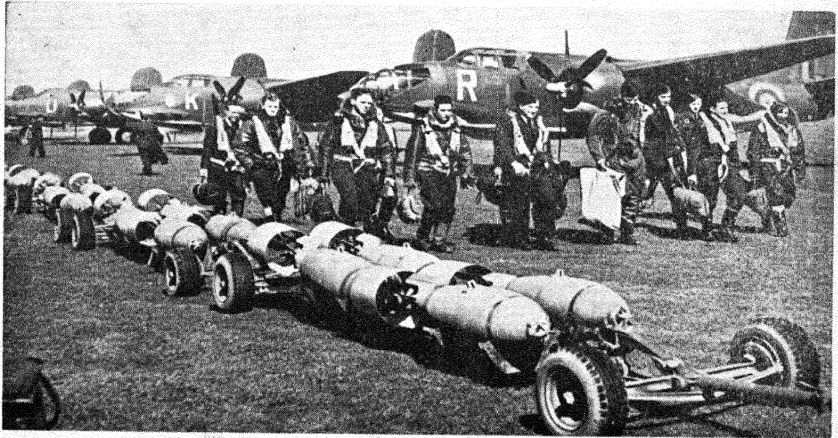
د بوسټن قسم په امریکائي بمبار والوتکو کښې اووه مڼیز بمونه کیښودې شي - په جرمني باندې د ورځې رڼا په هوائي حملو کښې دې بمبار والوتکو ډیره اهمه برخه اخستې ده او برطانوي هوابازان یې په تعریفونو نه مړیږي

بوسٹن قسم کے امریکن بمبار ہوائی جہازوں میں سات سات من بھاری بم رکھے جارہے ہیں۔ جرمنی پر دن دہاڑے کے ہوائی حملوں میں ان بمبار ہوائی جہازوں نے اہم حصہ لیا ہے۔ اور برطانوی ہوا باز ان کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔

حکومت کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اور تمام مذاہب دنیا شنٹو کے ماتحت ہو کر رہیں گے۔ جاپانی شنٹو کو مذہب نہیں مانتے بلکہ اُن کا دعوےٰ ہے کہ شنٹو تمام ادیان عالم سے سوا اور برتر مسلک ہے۔ شنٹو کو مذہب سمجھنا اسے اور مذاہب سے ہمقطار کرنا ہے اسمیں شنٹو کی تحقیر ہے۔ شنٹو تشدد کے خلاف ہے لیکن اگر شنٹو کی خاطر جاپانی کتنے ہی جرائم کریں سب معاف ہیں اسی لئے نکڈان۔ نانکن۔ کینٹن وغیرہ میں جو انسانیت سوز مظالم اور جرائم جاپانیوں نے کئے وہ انہیں جائز اور کم از کم معذور سمجھتے ہیں۔ میکاڈو یا اس کی حکومت کی مخالفت کرنا یا اُن پر کسی قسم کی نکتہ چینی کرنا ایک سنگین مذہبی گناہ اور سیاسی جرم ہو گیا ہے۔

میکاڈو کی حرمت میں اگر سر مو فروگذاشت ہو جائے تو معاف ہی نہیں ہوتی۔

ٹوکیو یونیورسٹی کے پروفیسر شیومی نے کہیں ایک مقالہ میں اتنا لکھ دیا کہ میکاڈو بھی ایسا ہی فرمانروا ہے جیسے دُنیا کے اور فرمانروا۔ پھر کیا تھا، حکومت اور اخبارات بگڑ بیٹھے اور اس الزام پر پروفیسر شیومی کو برطرف کر دیا کہ اس نے دنیا کے اور فرمانرواؤں کو میکاڈو کے برابر کر دیا ایسا ہی ایک اور واقعہ ہے۔ ۱۹۳۰ء میں میکاڈو کی سالگرہ کے موقعہ پر اودھم اور ایک جاپانی جو ٹوکیو کے کسی ہائی سکول میں مدرس تھا حسب دستور میکاڈو کی تصویر کے سامنے تعظیماً جھکا پر ذرا کم جھکا اس تقصیر پر اسے استعفےٰ دینے پر مجبور کیا گیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ دنیا پر جاپان اور شنٹو کا تسلط ہو جانے پر اور قوموں کو مذہبی اور شخصی آزادی سے ہاتھ دھونا پڑیگا۔ بالخصوص اسلام جیسے توحید پرست، آزادی پرست، اخوت پرست اور مساوات پرست دین سے

قاہرہ کے نامی اخبار "الدستور" کی اشاعت مورخہ ۱۴ مئی ۱۹۴۲ء میں "جاپان اور اسلام" کے موضوع پر ایک سر مقالہ نظر سے گذرا جسمیں سے ایک مختصر سا اقتباس (اردو میں) نذر قارئین کرام کرتے ہیں۔

"بات تو یہ ہے کہ اسلام تو جاپان کو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اسلام آزادی اور مساوات کا علمبردار ہے اور اسی لئے جاپان کو اس سے کھٹکا ہے۔ جاپان کا سلطنتی اور ملی مسلک شنٹو ہے جاپانی شنٹو کو دنیا کے تمام مذاہب سے بالا و برتر سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہم سماوی نسل سے ہیں لہٰذا ہم فانی نہیں ہیں اور سارے جہان پر راج کرنا ہمارا ہی حق ہے اپنے شہنشاہ کو خدا سمجھ کر پوجتے ہیں۔"

اس وقت ہمیں جاپانی جرنیل ارآکی کا یہ فقرہ یاد آیا۔ "ملتِ جاپان کا نصب العین "شنٹو" اتنا اہم ہے کہ اُسے ساری دُنیا پر چھا جانا چاہیئے اور اس کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہوں مٹا دینا چاہیئیں اگر ضرورت پڑے تو تلوار کے ذریعہ سے۔"

——— (م - ی - ن) ———

حضرت بابا فرید گنجشکرؒ

(دیپو)

حضرت بابا فرید الدین مسعود گنجشکر چشتیؒ جن کے سوانح حیات مختصراً بیان کرنا مطلوب ہے ہندوستان کے ان بلند پایۂ عارفین میں سے ہیں جن پر شاہ حاتم کا یہ شعر صادق آسکتا ہے :۔ ؎

بیٹھنے کو شاخ طوبیٰ پر نہیں کرتی نگاہ
اس چمن کے بلبلوں کا آشیاں ہی اور ہے

کردگار نے آپ کے وجود میں باطنی استعداد بدرجۂ اتم ودیعت کی تھی لیکن علم تجربہ اور ریاضت نے اُسے اور بھی چار چاند لگا دیئے ۔

ساری عمر فقر میں گذری مگر نہ صرف اپنی زندگی ہی میں بلکہ اب تک لاکھوں انسانوں کے دلوں پر اُن کی بادشاہت رہی ہے ۔ ؎

نہ رنجم گر بہ صورت از گدایان بودہ ام غالب
بہ دار الملک معنی میکنم فرمان فرمائی

آپ سنہ ۵۸۴ھ میں ضلع ملتان کے ایک گاؤں میں جو ان دنوں کھوتوال کہلاتا تھا پیدا ہوئے ۔ آپ بہت عالی نسب تھے ۔ بقول حضرت مولانا حسن نظامی آپ کے والد مولانا کمال الدین سلیمان " ساتویں واسطے سے فرخ شاہ بادشاہ کابل کے فرزند اور بیسویں واسطے سے حضرت امیر المومنین سیدنا عمر فاروقؓ کے صاحبزادے تھے " اور آپ کی " والدہ ماجدہ کا اسم شریف بی بی قاسم خاتون تھا جو مولانا وجیہہ الدین خجندی کی صاحبزادی تھیں "

اولاد کے لئے ماں بھی عجیب نعمت ہے بالخصوص جب کہ بچپن ہی میں باپ کا سایۂ اٹھ جائے ۔

نپولین کہا کرتا تھا کہ بچے کی تقدیر ماں کے ہاتھ میں ہے ۔

امریکہ کا مشہور صدر لنکن کہا کرتا تھا :۔ میں جو کچھ ہوں اپنی فرشتہ سیرت ماں کے طفیل ہوا ہوں اگر اور بھی بڑھوں تو وہ بھی اسی کی برکت سے ہوگا " واقعی

" زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے "

(دلبیر)

خوش قسمتی سے حضرت بابا فریدؒ کو ایک فرشتہ سیرت ماں ملی ۔ اس نے ابتدا ہی سے انہیں نیکی کے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا ۔ اور نیکی کی طرف میلان بڑھانے کے لئے طرح طرح کی ترکیبیں لڑاتی تھیں ۔ اُن کو نمازی بنانے کے لئے آپ ہر روز مصلّے کے نیچے شکر کی پڑیا رکھ

دیتی تھیں اور فرماتیں جو بچہ اس مصلے پر نماز پڑھے اُسے اُس کے نیچے شکر کی پڑیا ملتی ہے۔ یوں آپ بچپن ہی سے پکے نمازی بن گئے اور بقول حضرت مولانا حسن نظامی اسی شکر کی وجہ سے آپ کا لقب گنجشکر مشہور ہوگیا۔

آپ نے ملتان میں ابتدائی تعلیم پائی۔ کلام اللہ حفظ کیا اور اس کے بعد مروجہ نصاب کے مطابق درس حاصل کیا۔ اسی اثناء میں حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ دہلی سے ملتان تشریف لائے۔ ان کی زیارت اور صحبت کا آپ کے دل پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ جب وہ دہلی لوٹنے لگے تو آپ بھی ان کے ساتھ ہو لئے مگر حضرت خواجہؒ نے فرمایا:۔

"اس ترک وتجرید کے عالم میں ظاہری علوم حاصل کرو اس کے بعد میرے پاس آؤ۔ کیونکہ بے علم درویش شیطان کا مسخرہ ہوتا ہے"۔ ؎

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ہے آئینۂ باد بہاری کا (غالب)

چنانچہ آپ ملتان ٹھہر گئے اور تحصیل علوم ظاہری میں سرگرم ہوگئے۔ یہ شوق آپ کو قندھار لے گیا جہاں آپ نے پانچ سال قیام کر کے علوم مروجہ میں تبحر حاصل کر لیا۔ اس کے بعد آپ سیر و سیاحت کے لئے نکلے۔ علم کی وسعت اور مشاہدہ اور تجربہ کی پختگی کے لئے سیاحت بھی اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔

بقول غالب:۔ ؎

اگر بدل نہ خلد آنچہ از نظر گذرد

زہے روانیٔ عمرے کہ در سفر گذرد

آپ بہت سے بلاد اسلامیہ میں رہے اور بہت سے عرفا اور کاملین کی زیارت اور صحبت سے بہرہ اندوز ہوئے۔ جن میں سے حضرت شیخ المشائخ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ۔ شیخ سیف الدین خضریؒ شیخ سعید الدین حمویؒ۔ شیخ اوحدالدین کرمانیؒ۔ و شیخ فرید الدین عطار نیشاپوریؒ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

سفر سے واپس آئے تو سیدھے حضرت بختیار کاکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت بختیار آپ سے مل کے نہایت خوش ہوئے اور آپ کے قیام کیلئے ایک علیحدہ حجرہ مقرر کر دیا گیا۔ آپ کی عبادت و ریاضت کا چرچا ہوگیا اور خلقت آپ کی طرف اُمڈنے لگی تو آپ ہانسی تشریف لے گئے۔

حضرت بختیارؒ آپ کی باطنی صلاحیت اور عظمت کے بیحد معترف تھے۔ چنانچہ اپنے وصال سے پہلے حضرت بابا فریدؒ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ جب حضرت بختیار کا وصال ہوا تو آپ نے دہلی جا کر ان کا خرقہ۔ عصا و نعلین و مصلے وغیرہ حاصل کئے اور وہیں قیام فرمایا۔ جب خلقت کا رجوع پھر بڑھنا شروع ہوا تو آپ پھر ہانسی

تشریف لے گئے۔ اور وہاں شیخ جمال الدین کو خرقۂ خلافت عطا کر کے خود پاک پٹن تشریف لے گئے۔ وہاں آپ جنگل میں کمبل بچھا کر بیٹھ گئے۔ اور عبادت و ریاضت شروع کر دی۔ چند روز کے بعد آپ متاہل ہو گئے۔ اہل و عیال تو آبادی میں رہتے تھے۔ لیکن آپ جنگل ہی میں راتیں عبادت میں گذارتے تھے۔ عوام الناس کا رجوع بڑھتا گیا اور آپ کی بقیہ عمر بیعت، ارشاد اور یادِ الٰہی میں گذری۔

آپ کی ریاضت کا یہ عالم تھا کہ آپ کے پاس لے دے کے ایک کمبل تھا دن کے وقت اسی کو بچھا کر بیٹھتے تھے اور وہی آپ کا بستر تھا۔ ایک عصا جو حضرت بختیار سے ملا تھا آپ کا تکیہ ہوتا تھا۔ آپ اکثر اوقات لگاتار روزے رکھتے تھے منقّے کے چند دانوں اور ان کے پانی سے افطار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ صرف ایک روٹی کھاتے تھے اور رات دن میں یہی آپ کی خوراک تھی باوجود قلیل خوراک کے آپ کی صحت نہایت اچھی رہتی تھی۔ آپ ہر روز غسل کرتے تھے بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہر نماز سے پہلے غسل کرتے تھے۔

آپ کا اسلوبِ استدلال نہایت سادہ اور موثر ہوتا تھا۔ مزاج میں تحمل اور انکساری بھی نہایت درجہ تھی جو شخص کوئی پیچیدہ مسئلہ لیکر آتا تھا اس کی پوری تسلی کر دیتے تھے۔ بعض روایات کے بموجب آپ سے کرامتیں بھی ظہور میں آتی تھیں اور آپ کے اقوال اور نصائح نادر تحقیق اور وسیع تجربہ پر مبنی ہیں۔

خواص و عوام کا اس قدر رجوع اور ہجوم رہتا تھا کہ بقول حضرت مولانا حسن نظامی "بعض اوقات آپ کے جبّہ کی آستین دیوار پر لٹکا دی جاتی اور خلقت اس کو بوسے دیتے گزر جاتی یہاں تک کہ آستین کے پرخچے اڑ جاتے تھے"۔

سادگی اور قناعت آپ کے مزاج میں نہایت درجہ تھیں۔ آپ کا کرتہ دریدہ اور بوسیدہ ہو رہا تھا۔ ایک مرید ایک عمدہ کرتہ لایا۔ آپ نے پہن لیا مگر فوراً ہی اتار ڈالا اور فرمایا کہ جو لطف مجھے اس پھٹے پرانے کرتہ میں تھا اس نئے کرتہ میں نہیں آیا۔

باوجودیکہ آپ کثیر الاولاد تھے مال و دولت کو ہیچ سمجھتے تھے اور یہ استغنا اخیر عمر تک رہا۔ ایکبار سلطان ناصر الدین بادشاہ دہلی نے چار گاؤں کی سند اور کچھ زر نقد نذر بھجوائی آپ نے نقدی قبول کر لی لیکن سند واپس کر دی اور یہ کہلا بھیجا کہ فقیروں کو اس سے کیا سروکار؟

بادشاہوں سے طرزِ خطاب ملاحظہ ہو:۔ سلطان غیاث الدین بلبن کو کسی شخص کی سفارش میں خط لکھا تو یہ لکھدیا:۔ "جس کی سفارش کرتا ہوں اس کا مدعا خدا تعالیٰ سے پہلے ہی عرض کر دیا ہے اگر تو نے اس کا کام کر دیا کام تو خدا کرے گا مگر شکریہ تیرے حصہ میں آئے گا۔ اگر تو نے یہ کام نہ کیا۔ تو خدا کو بھی منظور نہیں ہے تیرا کیا قصور۔ تو مجبور ہے"۔

بقول حضرت مولانا حسن نظامی ہندوستان ہی میں آپ

کے کم از کم ایک کروڑ مرید ہوں گے ۔ چین میں آپ کے سلسلہ کی ڈیڑھ سو خانقاہیں ہیں اور عرب و افریقہ وغیرہ کی تعداد علیحدہ ہے ۔

آپ کے تین خلیفے تھے :۔

(۱)۔ خلیفہ اعظم تو حضرت قطب الدین ہانسوی ہیں ۔

(۲)۔ دوسرے خلیفہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی ہیں جن کو حضرت بابا فرید کا جانشین خاص سمجھا جاتا ہے ۔

(۳)۔ تیسرے خلیفہ حضرت مخدوم علاؤالدین صابر کلیری ہیں ۔

آپ کے اقوال کی تو کوئی حد و حساب نہیں تاہم قارئین کے استفادہ کے لئے چند چیدہ چیدہ اقوال درج کئے جاتے ہیں :۔

(۱)۔ اپنا گرم کام لوگوں کی سرد باتوں سے ترک نہ کرنا چاہیئے

(۲)۔ نامرادی کا دن مردوں کی شب معراج ہے ۔

(۳)۔ سبکسار رہنے کی خواہش کمزوری کی علامت ہے

(۴)۔ صوفی وہ ہے جس سے ہر چیز صاف ہو جائے اور خود اس کو کوئی گندہ نہ کر سکے ۔

(۵)۔ جیسا تو ہے ویسا ہی لوگوں کو دکھا ورنہ اصلیت خود بخود کھل جائے گی ۔

(۶)۔ احمق کو زندہ مت سمجھ ۔

(۷)۔ ہر کسی کی روٹی نہ کھا بلکہ ہر شخص کو اپنی روٹی کھلا ۔

(۸)۔ آرائش کے پیچھے نہ پڑ ۔

(۹)۔ جو تجھ سے ڈرتا ہے اس سے ہر وقت ڈر ۔

(۱۰)۔ وقت کا کوئی بدلہ نہیں ہے ۔

(۱۱)۔ ہنر ذلت سے سیکھ ۔

(۱۲)۔ دشمن کی دشمنی اس سے مشورہ کرنے سے ٹوٹ جاتی ہے ۔

(۱۳)۔ اگر ہے کچھ غم نہیں اگر نہیں ہے تو بھی غم نہیں ہے جب بھی خوش نہیں ہے تو بھی خوش ۔

(۱۴)۔ جو چڑیوں کو دانہ دیتا ہے تو ایک دن ہما اُس کے دام میں آن پھنستا ہے ۔

ان چند اقوال ہی سے خاصہ اندازہ لگ سکتا ہے کہ آپ کی نظر کس قدر وسیع اور غائر تھی اور اُن کے افکار میں نہ صرف مشاہدہ اور تجربہ بلکہ باطنی بصیرت کا کتنا دخل رہا ہے ۔ آپ ۹۵ برس زندہ رہے ۔ زندگی کیا تھی حقائق اور فیوض کا بے تھاہ چشمہ تھا جس میں سے اب بھی نہریں جاری ہیں ۔ یہ وہ بزرگوار تھا جس کی گفتار میں جادو تھا تو خموشی میں بھی جادو تھا ۔

ص

ہو گرم سخن تو گرد آئے اک خلق
خاموش رہے تو ایک عالم ہووے

———

نوٹ :۔ مندرجہ بالا سوانح زیادہ تر حضرت مولانا حسن نظامی صاحب قبلہ کے ایک محققانہ مقالہ سے اخذ کئے گئے ہیں ۔

(ادارہ)

رُوحانی امراض کا علاج

الانسان مرکب الخطا والنسیان - یا بہ الفاظِ دیگر خطا اور نسیان بشر کی گھٹی میں ہیں - بڑی برگزیدہ ہستیاں بھی ان لغزشوں سے بچ نہ سکیں - وُہ بشر قابل درگذر ہے جو رہِ راست سے بھٹکا رہے لیکن ٹھوکریں کھا کر رہِ راست پر لوٹ آئے لیکن برعکس اس کے اگر وُہ رہِ راست سے ہٹ کر مارا مارا پھرتا رہے اور اپنی غلطی کا احساس تک نہ کرے تو نہ صرف اپنے گوہرِ مقصود ہی سے محروم رہے گا بلکہ بربادی کا شکار ہو جائے گا۔

خطا کی بہت سی قسمیں ہیں جن میں سے دینی احکام و اصُول کی خلاف ورزی سب سے زیادہ اہم ہے - ایسی خطا کو گناہ کہتے ہیں - انہیں خطاؤں سے انسان میں رُوحانی روگ پیدا ہو جاتے ہیں - اگر شروع ہی میں اُن کی روک تھام نہ کی جائے تو دونوں جہان میں روسیاہی ہے!

گناہ کی دو قسمیں ہیں - گناہ کبیرہ اور گناہ صغیرہ مُسلمان کو توسخت ہدایت ہے کہ دونوں سے بچے - مگر افسوس صد افسوس ہم نے کلام اللہ کی صحیح تعلیم حضور سرورِ کائنات کے مبارک اقوال اور اسوۂ حسنہ صحابۂ کرام اور اسلام کی تمام روائیتوں کو بالائے طاق رکھ چھوڑا ہے اور شیطان کے بھرّوں میں آکر راستی چھوڑ خطا اور عصیان کے بھیانک راستہ پر چل رہے ہیں - اور یہ احساس تک نہیں کرتے کہ جو کام ہم کر رہے ہیں ناسزا ہیں - جس قوم میں یہ احساس نہ رہے وہ چند دن کی مہمان ہے -

گناہوں سے ہمارا دل سیاہ ہو گیا ہے - گناہ صغیرہ تو درکنار گناہ کبیرہ کرتے نہیں جھجکتے اور نہ ہی کر کے پچھتاتے ہیں -

اسلام میں اگر کوئی شخص دل سے پشیمان اور تائب ہو جائے تو کیسا ہی کبیرہ گناہ اس نے کیا ہو بخشا جا سکتا ہے - برعکس اس کے کوئی شخص گناہ صغیرہ ہی کیوں نہ کرے - لیکن اگر ہٹ دھرمی سے اُسے گناہ ہی نہ سمجھے تو یقیناً غضبِ الٰہی میں گرفتار ہوگا۔

پشتو زبان میں ضرب المثل ہے کہ انسان مُولی چرانے سے گنہگار اور بیتّے سے کافر ہوتا ہے - یعنی اگر مُولی چرائے مگر پچھتائے تو صرف گنہگار رہے لیکن بیتّہ چُرا کر اپنی فصل میں لے آئے تو اُسکا گناہ کہیں زیادہ ہے بلکہ کُفر کا حکم رکھتا ہے -

ہاں - میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رُوحانی بیماریوں کا

دعراق ورکوټے بادشاه فیصل دوئم دخپل ماما امیر عبدُالاِلٰه سره ولاړ
دخپلے سالگرے په موقعه دلوبو تماشه کوی

عراق کے نابالغ بادشاہ فیصل دوم اپنے ماموں امیر عبدالالہٰ کے ساتھ
کھڑے اپنی سالگرہ کے موقع پر کھیلوں کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔

دبغداد شریف دیو بازار ننداره

بغداد شریف کا ایک بازار

اگر شروع ہی میں علاج نہ کیا جائے تو دین و دنیا دونو سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

ان امراض کی دوا کیا ہے ؟ ..... سنئے !

ایک دن حضرت علی کرم اللہ وجہ بصرہ میں جا رہے تھے ایک جگہ بہت بھیڑ تھی۔ ایک حسین نوجوان جس کے چہرے سے نیکی اور بزرگی ٹپک رہی تھی بیچ میں بیٹھا تھا ہر شخص اُسے نبض دکھاتا اور دوا لیتا تھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ نے آگے بڑھ کے اس نوجوان سے پوچھا :-

آپ کے پاس روحانی بیماریوں کی دوا بھی ہے ؟

پہلے تو وہ نوجوان خاموش رہا مگر اصرار پر یوں گویا ہوا:-

" اگر کوئی روحانی علاج کا متلاشی ہو تو وہ پہلے ایمان کے باغ میں جا کر نیت کی جڑ۔ پشیمانی کے دانے غور و فکر کے پتے۔ عبادت کا بیج۔ سمجھ کو پھل یقین کی ٹہنیاں۔ اخلاص کا گودا۔ اجتہاد کا چھلکا۔ توکل کی جڑ۔ عبرت کی کلیاں۔ توبہ کا عرق اور انکساری کا تریاق اکٹھا کرے۔ پھر یہ تمام ادویات تصدیق کی انگلیوں اور توفیق کے ہاتھوں سے ملا دے۔ پھر تحقیق کے تھال میں ڈال دے اور آنسوؤں کے پانی سے دھوئے پھر اُمید کی ہنڈیا میں ڈال کر شوق کی آنچ دینا شروع کر دے اس وقت تک اُچھالتا رہے جب تک کہ حکمت کی جھاگ اُوپر نہ آ جائے۔ اُس کے بعد رضائے الٰہی کے پیالہ میں ڈال کر استغفار کے پنکھے سے اُسے ٹھنڈا کرے۔ اس دوا کو ایسی جگہ کھائے جہاں سوائے ذات پاک کے اور کوئی نہ ہو۔ اس دوا سے تمام رُوحانی امراض جاتے رہیں گے "۔

اس کلام کے بعد اس نوجوان حکیم نے نعرہ لگایا۔ زمین پر گر پڑا اور جان دے دی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا: بخدا! آپ دین و دُنیا دونوں کے لئے طبیب کامل تھے اس کے بعد حضرت نے اپنے دست مُبارک سے اسکی تجہیز و تکفین کی اور بصد حسرت و افسوس اُسے سپُرد خاک کر دیا ؛؛

کیوں زر کی ہوس میں دربدر پھرتا ہے
جانا ہے تجھے کہاں کدھر پھرتا ہے
اللہ ری پیری میں ہوس دنیا کی
تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سر پھرتا ہے

(انیس)

پشتو رسم الخط

گذشتہ شمارہ میں مولانا عبدالقادر صاحب کا مضمون شائع ہوا تھا۔ اسکے جواب میں میاں سید رسول صاحب بی اے بی ٹی کے مضمون کا ترجمہ شکریہ کے ساتھ ذیلاً درج کرتے ہیں تاکہ قارئین کرام تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

مولانا عبدالقادر صاحب کا ایک فاضلانہ مضمون بعنوان "پشتو رسم الخط" میری نظر سے گذرا اور میں نے اُن کے زرین افکار پر خوب غور کیا۔ رسم الخط کے ساتھ معیار زبان کا مسئلہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ مولانا صاحب کی دانست میں تلفظ اور تحریر میں چولی دامن کا ساتھ ہونا چاہیئے اور جو حروف بولے نہ جاتے ہوں لکھے بھی نہ جائیں۔ اس سے تحریر میں آسانی ہو جائے گی۔

گویا وُہ چاہتے ہیں کہ سرحدی پٹھانوں کی سہولت کیلئے پشتو کا موجودہ رسم الخط جو عربی ہے اُردو نستعلیق میں مبدل ہو جائے۔ اس کے علاوہ ان کی رائے میں یوسفزئی تلفظات کو معیار گردانا جائے اور انہیں تلفظات سے تحریر کو مطابقت دی جائے۔

چنانچہ پشتو کے خاص حروف مثلاً ټ ۔ ځ ۔ څ ۔ ښ ۔ ډ وغیرہ نکل جائیں گے اور پشتو زبان میں ایک واحد مستند معیار قایم ہو جائے گا۔ زبان آسان ہو کر جلد ترقی کر جائے گی۔

اس حد تک تو مجھے مولانا صاحب سے پورا اتفاق ہے کہ پشتو زبان کا واحد معیار اور واحد رسم الخط ہونا اس کی نشو و نما کیلئے ازبس ضروری ہے۔ لیکن اس ضروری اور نیک مقصد کو عملی جامہ پہنانے میں چند اساسی رکاوٹیں ہیں اور جب تک یہ رکاوٹیں دور نہ ہو جائیں مولانا صاحب کی تحریک مزید اختلافات کا باعث ہو جائے گی۔ اسی مصلحت سے افغانستان اور ایران اُردو رسم الخط چھوڑنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

مولانا صاحب نے اپنی تحریک کے جواز میں چند دلیلیں پیش کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے:۔ صوبہ سرحد میں اُردو عام ہے۔ وہاں کی تجارت۔ عدالتوں اور درسگاہوں میں اردو ہی برا جمان ہے۔ سرحدی پٹھانوں پر اُردو کا اثر غالب ہے پٹھانوں کے لئے پشتو کا موجودہ رسم الخط میں لکھنا تو درکنار پڑھنا بھی مشکل ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ ان سب دلائل کا جواب دُوں۔ پشتو نہ صرف سرحدی پٹھانوں کی زبان ہے بلکہ افغانستان سرحدی قبائل اور سرحدی خود مختار ریاستوں کی بھی زبان

ہے۔ اگر پشتو رسم الخط میں مجوزہ اصلاح ہو بھی جائے تو
وہ صرف صوبۂ سرحد تک محدود ہوگی اور دوسرے علاقوں میں
اور بھی مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ترکوں کے علاوہ تمام
اسلامی ممالک کا رجحان عربی رسم الخط کی طرف ہے۔ اسلامی
رشتہ پٹھانوں کو بھی مجبور کرتا ہے کہ وہ عربی رسم الخط
قائم رکھیں تاکہ یہ رشتہ بھی ویسا ہی قائم رہے۔ مصر۔
حجاز۔ عرب۔ فلسطین۔ شام۔ عراق وغیرہ کی تو زبان
ہی عربی ہے۔ ایران اور افغانستان جہاں عربی بولی
نہیں جاتی وہاں کے ماہرین زبان نے عربی رسم الخط
اسی لئے اختیار کیا کہ اور اسلامی ممالک کے ساتھ
ان کا رشتۂ تہذیب اور اخوت برقرار اور استوار رہے
عربی رسم الخط میں ایک خاص فائدہ یہ ہے کہ
اس کا ٹائپ موجود ہے۔ اور اس ٹائپ سے کتابیں
اخبارات وغیرہ نہایت آسانی اور افراط کیساتھ
چھپ سکتے ہیں۔ برعکس اس کے اردو نستعلیق کا کوئی
ٹائپ موجود نہیں اور کتابت کی وجہ سے اردو کتابیں
اور جرائد اتنی آسانی اور افراط کے ساتھ نہیں چھپ سکتے
یہی وجہ ہے کہ اردو مطبوعات زمانہ کی رفتار کے
مطابق ترقی نہیں کر سکیں۔ افغانستان اور ایران میں
اردو رسم الخط کو ترک کرنے کی ایک یہ بھی وجہ تھی۔
چونکہ پشتو رسم الخط عربی طرز کا ہے لہذا پشتو
مطبوعات آسانی سے چھپ سکتی ہیں یہ مجبوری خود اردو
نے بھی محسوس کر لی ہے۔ چنانچہ بہت سی اردو کی کتابیں
عربی رسم الخط ہی میں چھپ رہی ہیں۔

ظاہر ہے کہ بجائے عربی رسم الخط کے اگر ہم اردو
نستعلیق اختیار کر لیں بجائے فائدہ کے نقصان اور
بجائے آسانی کے مشکلات کا سامنا ہوگا۔ میرا تو یہ
عقیدہ ہے کہ اگر اردو۔ ہندی "مسئلہ" ہندوستان
میں اہمیت پکڑ نہ گیا ہوتا تو اردو نستعلیق کبھی کا متروک
ہو گیا ہوتا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ صوبہ سرحد میں اردو کا رنگ جما
ہوا ہے اور وہاں کے پٹھان بہ نسبت پشتو رسم الخط
اردو رسم الخط سے زیادہ آشنا ہیں یہ ہماری اپنی ہی
غفلت تھی کہ ہم نے اپنی زبان چھوڑ دوسری زبان کو اپنا
لیا۔ اب ہم جاگ اٹھے ہیں اور ہمیں اپنی غلطی کا ازالہ
کرنا چاہیئے۔ یہ ازالہ یوں ہی ہو سکتا ہے کہ بجائے
اردو کے پشتو عدالتی۔ تعلیمی اور کاروباری زبان قرار
پائے۔ اب تک تو کسی قوم کی ادبیات نے کسی غیر زبان میں
فروغ نہیں پایا اسی لئے سب قومیں اپنی اپنی زبان کی ترقی
کے لئے کوشاں ہیں۔ کمبل میں اگر جوں پڑ جائے تو اسے
نکال کر باہر کر دیتے ہیں نہ کہ کمبل ہی کو جلا دیا جائے۔
یہ مثال سرحد اور اردو پر صادق آتی ہے سرحدی
نوجوانوں میں پشتو سیکھنے کا جذبہ پیدا کیا جائے نہ کہ ہم ان
کی غلط کاری کی تقلید کریں بنیاد درست ہونی چاہیئے ورنہ

ع تا ثریا میرود دیوار کج

ہمارے نوجوان غیر زبان سیکھنے میں اپنی عمر عزیز کے

بیس بیس سال صرف کر دیتے ہیں کیا وہ پشتو رسم الخط پر قابو پانے کے لئے ایک ہفتہ یا عشرہ بھی نہیں دے سکتے؟

عیاں ہے کہ مسئلہ یہ نہیں کہ رسم الخط کونسا ہو مسئلہ یہ ہے کہ صحیح جذبہ اور صحیح خیال کیونکر پیدا کیا جائے تاکہ باوجود ساری مشکلات کے ہر پٹھان پشتو کی طرف مائل ہو جائے گا۔

میرا بھی جی چاہتا ہے کہ معیاری رسم الخط قائم ہو جائے لیکن مشکلات اتنی ہیں کہ اس آرزو کا برآنا ناممکن ہی سا نظر آتا ہے۔ معیاری رسم الخط تو پھر بھی قائم ہو سکتا ہے یہ معیاری تلفظ نہایت دشوار ہے۔ کسی قبیلہ کو اپنے مخصوص تلفظات چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک ایک واحد معیاری تلفظ تسلیم نہ ہو جائے تقریر اور تحریر کی تطبیق محال ہے۔

صوبۂ سرحد کے مختلف علاقوں کے باشندے اپنے اپنے مخصوص تلفظات رکھتے ہیں اس امر کا موجودہ رسم الخط میں خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ اگر مولانا صاحب کے خیال کے مطابق لکھنا اور بولنا یکساں ہو جائے تو یہ صورت بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ اپنے اپنے تلفظ کے مطابق لکھنا بھی شروع کر دے تو ایک دوسرے کی تحریر پڑھ نہ سکینگے اور بجائے واحد رسم الخط کے نت نئے رسم الخط بن جائیں گے۔

میرے خیال میں اگر ہم موجودہ پشتو زبان کو معمولی سی کانٹ چھانٹ کے بعد ایک معیار پر لے آئیں تو ہر طبقہ کے لئے آسانی ہو جائے گی۔

یہ نقص تو دنیا کی ہر زبان میں موجود ہے کہ غیر ضروری الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں۔ فرانسیسی، انگریزی، جرمن تک اس نقص سے مبرا نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر قوم میں مختلف طبقے ہیں ہر طبقہ کا لب ولہجہ الگ ہے اس کا اثر ساری زبان پر پڑتا ہے۔

نہ صرف تعلیمی نقطۂ نگاہ سے بلکہ مذہبی نقطۂ نگاہ سے بھی عربی رسم الخط کا قائم رہنا ضروری ہے۔ تلاوتِ کلام اللہ ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اس لئے عربی رسم الخط سے واقفیت ناگزیر ہے۔ عربی رسم الخط سے واقفیت ہو تو پشتو پڑھ لینا بہت سہل ہو جاتا ہے اور ذرا سی اور کوشش سے لکھنا بھی بہ آسانی آ سکتا ہے۔ لڑکیاں عام طور پر پشتو رسم الخط سے آشنا ہیں اور ایسی لڑکیوں کی نسبت جو اردو نستعلیق پڑھ سکتی ہوں مگر پشتو رسم الخط سے نا آشنا ہوں۔ ایسی ہی ہے جیسے آٹے میں نمک۔ بجائے اس کے کہ ہم مستورات کو اسبات پر آمادہ کریں کہ وہ سیکھا ہوا سبق ہی بھول جائیں یہ بدرجہا بہتر ہوگا کہ ہم اپنے نوجوانوں کو نیا سبق سیکھنے کی تلقین کریں۔ بجائے اس کے کہ ہم پشتو رسم الخط کو بدل ڈالیں یہ کہیں بہتر ہوگا کہ اردو نستعلیق کی جگہ عربی رسم الخط کو زیادہ رائج کریں۔

مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ جو حروف بولے ایک طرح جاتے ہوں اور لکھے دوسری طرح یا وہ زائد

حروف جو بولنے میں آتے ہی نہیں وہ اُردو رسم الخط ہونے کی صُورت میں پشتو کے حروفِ تہجّی سے نکال دیئے جائیں تاکہ زبان زیادہ سلیس اور آسان ہو جائے۔

تلفّظ کے لحاظ سے صُوبۂ سرحد کے باشندے دو حصّوں پر تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک حصّہ افغانستان اور قبائل خٹک گنڈہ پور وغیرہ پر مشتمل ہے۔ اور دوسرا یُوسف زئی یعنی پشاور۔ مردان۔ سوات۔ بنیر۔ دیر۔ باغستان وغیرہ پر۔ ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کے تلفظات اختیار کرنے کے لئے آمادہ نہ ہوگا۔ اور یہ فطری بات ہے۔ لہذا مخصُوص الفاظ پشتو زبان میں سے خارج نہیں ہو سکتے۔

ایک اور قابلِ توجّہ امر یہ ہے کہ قندہاری زبان زیادہ صحیح اور فصیح ہے اور اس زبان میں بہت سے ادباء اور علماء پیدا ہو چکے ہیں۔ اگر معیاری تلفّظ قائم کیا بھی جائے تو لازمی اور انسب ہوگا کہ قندہاری اور خٹک زبان معیار ہو۔ یہ زبان بجا طور پر معیاری ہونے کا دعوےٰ کر سکتی ہے۔ قندہاری رسم الخط کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس میں الفاظ کا ماخذ معلوم کیا جا سکتا ہے اور یہ بات بصورت دیگر دشوار ہے۔

دلائل فوق الذکر سے واضح ہے کہ صرف ایک ہی صُورت ممکن اور مفید ہے اور وُہ یہ کہ موجودہ رسم الخط میں معمُولی سی اصلاح کر دی جائے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض حضرات لاطینی رسم الخط کے حامی ہیں لیکن موجودہ فضا میں یہ سعی لاحاصل ہے پس موجُودہ رسم الخط کو بدل ڈالنا میری دانست میں پشتو زبان کی بیخ کنی کرنا ہے ؞

(سید رسول)

برباد تمنّا

میرے ویرانۂ دل کو یُونہی آباد رہنے دے ؞ تیرا ملنا تو مشکل ہے پر اپنی یاد رہنے دے
یہ دل کے زخم ہیں ہر دم جو آنسو بن کے رِستے ہیں ؞ نہیں ان کا کوئی درمان انہیں جلّاد رہنے دے
میری آہ و فغاں کا راز تو سمجھا نہ سمجھے گا ؞ یہ دل کی داستاں پُوری مجھے صیّاد کہنے دے
ارے ناداں تیرے نالے نہیں بدنام کر دیں گے ؞ خموشی سے جلے جانا مگر فریاد رہنے دے
مقدر میں لکھا تھا جب کہ ہم دونوں کا مٹ جانا ؞ شکایت کیا کسی سے اے دلِ ناشاد رہنے دے
مجھے آباد رہنے سے کوئی پُوچھے تو کیا مطلب ؞ میں برباد تمنّا ہُوں مجھے برباد رہنے دے

تیرے کیا ہاتھ آئے گا مجھے قیدِ بلا کر کے
میری آزاد فطرت ہے مجھے آزاد رہنے دے

(سید عبدالرحمٰن آزاد)

پندرہ روزہ رسالہ اُردو

چندہ سالانہ
تین روپے

سال دوم	۲۵ جولائی سنہ ۱۹۴۲ء	فہرست اندراجات	۱۰ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ	نمبر (۶)

نن پرون ایک عرصے سے پشتو زبان اور پشتو ادبیات کی بے نظیر خدمات سرانجام دے رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس رسالے کی قدر و منزلت پشتون قوم کے دل میں نبس گئی ہے۔ بعض احباب پے در پے خواہش کر رہے ہیں کہ **نن پرون کا اُردو ایڈیشن** بھی نکالا جائے۔ چنانچہ ان کی خواہش اور دلائل سے متاثر ہو کر ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ نن پرون کا اُردو ایڈیشن جاری کیا جائے جس کا اللہ کے فضل سے چھٹا نمبر قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اور استدعا کی جاتی ہے کہ وہ اپنی قیمتی آرا اور مشوروں سے ہمیں مشکور فرمادیں ؛

(ادارہ)

درۂ خیبر

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

کڑکتی بجلیوں کی اس جگہ چھاتی دہلتی ہے
گھٹا بچ کر نکلتی ہے ہوا ڈر ڈر کے چلتی ہے

یہ ناہموار چٹیل سلسلے کالی چٹانوں کے
امانت دار ہیں گویا پرانی داستانوں کے

یہی پگڈنڈیاں نیرنگِ ہستی کی نظیریں ہیں
یہی تو قسمتِ اقوام کی خونیں لکیریں ہیں

یہ ذرّے رہرووں کی ہمتوں پر مسکراتے ہیں
زبانِ حال سے ماضی کے افسانے سناتے ہیں

یہ پتھر قافلے والوں کے ٹھکرائے ہوئے سے ہیں
کسی آتش قدم کی راہ میں آئے ہوئے سے ہیں

لئے بیٹھی ہیں یہ ویرانیاں محشر کے ہنگامے
ہیں ان سنسانیوں میں دفن دنیا بھر کے ہنگامے

یہ بے آباد دہشتناک وحشت خیز ویرانہ
ہے لاتعداد شور انگیز تہذیبوں کا افسانہ

انہی دشواریوں سے آریوں کا کارواں گذرا
زمینِ ہند پر چھاتا ہوا اک آسماں گذرا

اسی رستے سے ہو کر ہنس اور اہلِ تتار آئے
کئی خانہ خراب آئے کئی آباد کار آئے

یہ مٹی شانِ اسکندر کی ہے آئینہ دار اب تک
اسی آندھی کا باقی ہے یہاں گرد و غبار اب تک

اسی تابش میں چمکی تھیں مسلمانوں کی شمشیریں
انہی فولاد کے دیووں سے ٹکرائی تھیں تکبیریں

فلک نے اس زمیں پر بارہا محمود کو دیکھا
بہادر غوریوں کے طالعِ مسعود کو دیکھا

اڑی یہ خاک برسوں تک غبارِ کارواں ہو کر
فلک پر چھا گئی دلدوز آہوں کا دھواں ہو کر

اسے تیمور نے روندا اسے بابر نے ٹھکرایا
مگر اس خاک کی عالی وقاری میں نہ فرق آیا

یہاں سے بارہا گذرے اٹالے بارگاہوں کے
قدم چومے ہیں اس مٹی نے اکثر بادشاہوں کے

کہاں اب وہ شکوہ نادری اقبالِ ابدالی
لیا کرتے تھے جن سے سخت پتھر درسِ پامالی

یہ ہے وہ خارزار اس میں ہزاروں آبلے پھوٹے
نہیں ٹوٹے مگر یہ سنگدل کانٹے نہیں ٹوٹے

(حضرت ابو الاثر حفیظ جالندھری)

مژدہ اے دل کہ مسیحا نفسے مے آید ※ کہ ز انفاسِ خوشش بوئے کسے مے آید

سیّدنا حضرت امام جعفر صادقؓ
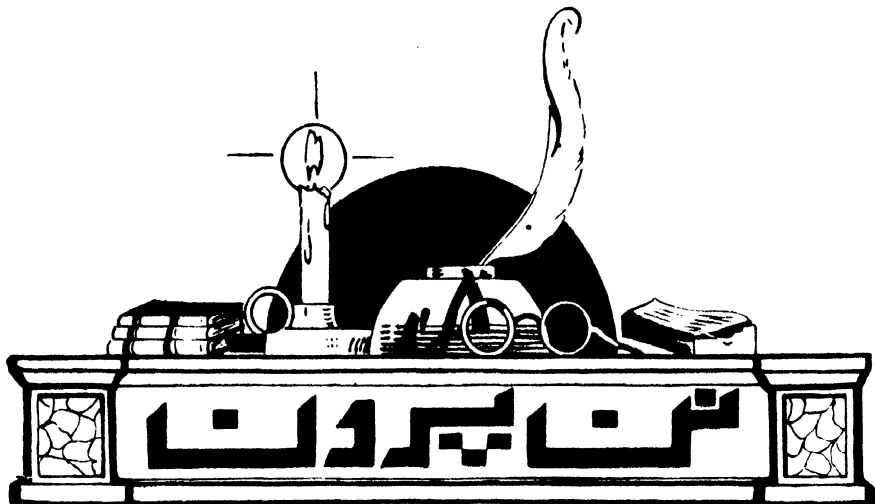
مؤلفِ "انوار الازکیا" لکھتے ہیں :- "حضرت عارف عاشق ابو محمدؐ امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ کی وہ شان ہے کہ اگر آپ کو ملّتِ مصطفوی کے سلطان ۔ حجت نبوی کے برہان ۔ عامل صدیق عالم تحقیق ۔ میوۂ دل اولیاء ۔ جگر گوشہ سید الانبیاء ۔ ناقدِ اعلےٰ وارثِ نبیؐ کہا جائے تو سزاوار بجا ہے ۔ آپ کو ہر علم و اشارت میں حد درجہ کا کمال حاصل تھا اور آپ پیشوا تمام مشائخ کے تھے ۔ سب کا اعتماد آپ پر تھا ۔ آپ پیشوائے مطلق تھے ۔ اہلِ ذوق کے بھی پیشرو تھے اور صاحبانِ عشق کے بھی رہنما ۔ عابدوں کے بھی مقتدا تھے اور زاہدوں کے مخدوم ۔ صاحب تصنیف حقائق بھی تھے اور کاشف لطائف تفسیر اور اسرار تنزیل بھی بلکہ اس میں بےمثل تھے۔"

اپنی تقریباً ستر برس کے سن میں آپ نے خلفائے بنو امیہ عبد الملک سے لیکر مروان ابن محمدؐ تک کا زمانہ دیکھا خلافت بنو امیہ آپکے سامنے بگڑی ۔ اور خلافت بنو عباس آپ کے سامنے بنی ۔ آپ کے وجود مبارک کو ان سارے

ادوار کے اہم وقایع سے کچھ نہ کچھ نسبت رہتی رہی ہے ایسے بزرگ کا پورا ذکر کرنا ہو تو ایک بڑی کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ اس مختصر مقالہ میں ہم آپ کے چند چیدہ چیدہ سوانح اور فضائل قارئین کرام کے استفادہ کے لئے پیش کر سکتے ہیں۔

آپ کا اسم مبارک جعفر، کنیت ابو عبد اللہ اور لقب صادق ہے۔ آپ کے والد بزرگوار سیدنا حضرت امام محمد باقرؓ سیدنا حضرت امام حسینؓ کے پوتے اور آپ بارہ اماموں میں سے چھٹے امام ہیں۔ آپ کی والدہ مطہرہ حضرت ام فروہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی پڑ پوتی تھیں۔ یہ خاتون معظمہ نعمت ایمان و عرفان سے اتنی مالا مال تھیں کہ بقول مورخین آپ کا شمار مدینۂ منورہ کے فقہائے سبعہ میں ہوتا تھا۔

"امه ام فروة بنت قاسم ابن محمد ابن ابوبکر الصدیق رضی الله عنه والقاسم من الفقهاء السبعة"

حضرت امام جعفر صادقؓ کا سال ولادت ۸۰ھ یا ۸۳ھ ہے سال وفات ۱۴۸ھ ہے۔ ۱۱۴ھ میں والد بزرگوار کی وفات پر آپ نے منصب امامت سنبھالا اور اس پُر آشوب زمانہ میں نہایت سلامت روی کے ساتھ شریعت حقہ کی تعلیم اور ترویج میں مصروف رہے۔ سلطنتی کاروبار اور ملکی سیاست سے آپ کو کوئی سروکار نہ تھا مگر جب کبھی کوئی پیچیدہ مسئلہ درمیان میں آیا اور اس زمانہ کے قاضی مفتی۔ علماء اور حکماء عاجز رہ جاتے تو پھر آپ ہی کی خدمت میں رجوع کیا جاتا تھا ہزاروں اشخاص نے آستانۂ مبارک سے علوم ظاہری اور باطنی کی تعلیم پائی۔ اُن میں سے حضرت امام ابو حنیفہؒ قاضی ابن ابی لیلیٰؒ سعید ابن مسیبؒ۔ سفیان ثوریؒ۔ ابراہیم ادہمؒ شفیق بلخیؒ وغیرہ شہرۂ آفاق ہو گئے۔

جب خلافت امویہ کا خاتمہ ہوا تو ابو سلمہ اور ابو مسلم خراسانی نے آپکو خلافت قبول کرنے کی دعوت دی لیکن آپ نے انکار کر دیا تب ابو مسلم نے کوفہ جا السفاح سے بیعت کر کے منصب امارت و حکومت اسکے سپرد کی۔ آپ نے پیشینگوئی فرمائی تھی کہ خلافت بنی حسن میں نہیں رہیگی اور بنی عباس کو مل جائیگی ۲۲ برس کے بعد یہ پیشینگوئی صحیح نکلی۔ چنانچہ اسی بنا پر منصور خلیفہ عباسی نے آپ کو "صادق" کا خطاب دیا۔ منصور کو علم تھا کہ آپ نے خلافت قبول کرنے سے انکار کیا بلکہ بنی حسن کو روکا تھا۔ اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ آپ نے بالکل گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے۔ لیکن وہ آپ کے علم و تقوے کے بے پناہ اثر سے ہر دم خائف رہتا تھا۔ پانچ مرتبہ اس نے چاہا کہ آپ کو قتل کر ڈالے لیکن ہر دفعہ آپ کی حقانیت اور جلالت سے مرعوب ہو کر اپنے ارادہ سے باز رہا۔

"انوار الازکیا" میں ایک طلبی کی کیفیت یوں درج ہے:۔ "خلیفہ منصور نے ایک رات اپنے وزیر سے کہا کہ جاکر صادقؓ کو بلا لا تاکہ میں اس کو قتل کر دوں۔ وزیر نے کہا کہ ایسے شخص کو جو ایک گوشہ میں بیٹھا ہے اور خلوت اختیار کئے ہوئے ہے اور عبادت الٰہی میں مشغول اور ملک و دنیا سے ہاتھ سمیٹے ہے تو قتل کرنا چاہتا ہے۔ خلیفہ اس سے ناخوش

دَ جنگ پہ میدان کښې دَ برطانوي فوځ یو ډاکټر او دَ هغه نائبان دَ خپل سر دَ خطرے نہ بے پروا دَ یو زخمي سپاهي اپریشن (جراحي) او مرهم پټے کوي۔

برطانوی فوج کا ایک ڈاکٹر اور اس کے ماتحتان اپنے آپ کو جوکھم میں ڈال کر میدانِ جنگ میں ایک زخمی سپاہی کا آپریشن کر رہے ہیں۔

ہوا اور کہا کہ جا اس کو لا تاکہ میں قتل کروں۔ وزیر نے ہر چند
باز رکھنا چاہا مفید نہ ہوا۔ ناچار وزیر بلانے کو چلا گیا۔ خلیفہ
نے غلاموں کو حکم دیا کہ جب آوے اور میں تاج کو اپنے سر سے
اتاروں تو اسی دم اس کو قتل کر ڈالنا۔ جب حضرت
صادقؒ تشریف لائے جھٹ منصور اٹھ کھڑا ہوا اور
نہایت عاجزی کے ساتھ حضرت امام صادقؒ کے استقبال
کو دوڑا اور مقام صدر پر ان کو بٹھایا اور آپ مودب ہو کر ان
کے سامنے بیٹھا۔ غلاموں کو تعجب معلوم ہوا۔ منصور نے
کہا کہ آپ کیا حاجت رکھتے ہیں حضرت امام صادقؓ نے فرمایا
کہ مجھے تو دوسری بار اپنے حضور میں نہ طلب کرے اور مجھ سے
مواخذہ نہ کرے تاکہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہوں
منصور نے آپکو اجازت دی اور بڑی عزت سے آپکو رخصت
کیا۔ اور اس وقت منصور کا بدن کانپنے لگا اور بیہوش ہو گیا
اور تین روز تک اسی حالت میں رہا اور بعض نے کہا ہے کہ اتنی دیر
بیہوش رہا کہ تین نمازیں اس کی قضا ہو گئیں۔ جب ہوش میں
آیا وزیر نے پوچھا کہ کیا حال تھا کہا کہ جب حضرت صادقؓ
دروازہ سے داخل ہوئے میں نے دیکھا کہ ایک بڑا اژدہا آپکے
ہمراہ تھا۔ اور مجھ سے زبان حال سے کہتا تھا کہ اگر تو نے اس
کو ستایا تو تجھ کو میں نگلونگا۔ میں اس اژدہا کے
خوف سے نہ سمجھ سکا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ میں نے ان سے
معذرت کی اور ایسا بیہوش ہو گیا۔"

اس واقعہ کو ملا عبدالرحمٰن جامی نے شواہد النبوۃ میں
اور شیخ فرید الدین عطار نے حلیۃ الاولیاء میں نہایت شرح
وبسط کیساتھ لکھا ہے

حضرت امام جعفر صادقؓ نے حضرت ابو حنیفہ سے پوچھا
کہ عاقل کون ہے آپ نے فرمایا وہ جو نیکی اور بدی میں فرق کرے
حضرت امامؑ نے فرمایا یہ تو چوپائے بھی کر سکتے ہیں اسلیئے کہ جو
ان کو مارتے یا چمکارتے ہیں وہ ان کو خوب پہچانتے ہیں
حضرت امام ابو حنیفہؒ نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک عاقل
کون ہے آپ نے فرمایا وہ جو درمیان دو خیر اور دو شر کے
تمیز کر سکے تاکہ دو خیروں سے بہتر خیر کو اختیار کرے اور دو
شروں میں سے کمتر شر کو چنے۔

ایک عورت وصیت کر گئی کہ میرے مال سے ثلث خیرات
کیا جائے۔ دو ثلث باقی میں سے ایک سے حج کرایا جائے اور ایک سے
ایک غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے۔

اس کا مال اتنا نہ تھا جو ان تمام مصارف کیلئے کافی ہو سکتا
امام ابو حنیفہؒ و سفیان ثوریؒ سے اسکا حکم پوچھا گیا تو دونوں نے
کہا کہ ایسا شخص تلاش کیا جائے جو حج کو گیا ہوا اور راستے میں اسے
رہزنوں نے لوٹ لیا ہو پس اس کو تھوڑا سا مال اس میں سے
دیکر حج کرا دیں۔ پھر ایسا غلام تلاش کریں جو اپنی آزادی کی
کوشش کرتا ہو بلکہ اپنی قیمت سے کچھ ادا بھی کر چکا ہو اور
کچھ باقی ہو وہ جزو ترکۂ عورت سے دیکر اسے آزاد کرا دیں
اور مابقی کو اس کی جانب سے خیرات کر دیں۔

یہ قضیہ آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ اور حکم دریافت
کیا گیا۔ آپنے ارشاد فرمایا کہ حج واجب ہے۔ اول وہ کرایا
جائے جو کچھ بچے اسے خیرات میں صرف کریں۔

کہا:- ما اصبرک علی الصلوٰۃ یا ابا عبد اللہ
(تمہاری نماز کس قدر سخت ہوتی ہے)۔ فرمایا:-
اما سمعت ان الصلوٰۃ قربان کلّ تقی (تجھے نہیں
معلوم ہے کہ نماز تمام تقوٰے سے زیادہ تر
قُرب خدا کا باعث ہے۔؟)

حضرت سفیان ثوریؒ سے روایت ہے
کہ ایک مرتبہ جناب امام کی خدمت میں حاضر ہوئے
تو دیکھا چہرۂ مبارک کا رنگ متغیّر ہو رہا ہے۔
دریافت پر آپ نے فرمایا:-

میں نے منع کیا تھا کہ کوئی کوٹھے پر نہ چڑھے
اس وقت جو گھر میں گیا تو دیکھا کہ ایک کنیز جو ایک
بچّے کی پرورش پر مقرر تھی اس کو گود میں لئے
زینہ سے اوپر جا رہی تھی مجھ کو دیکھا تو خوف سے
بدحواس ہوگئی اور بچہؔ اس کی گود سے گر کر جان بحق
تسلیم ہوگیا۔ مجھے اپنے بچّے کے تلف ہوجانے
کا اتنا خیال نہیں جتنا اس امر کا قلق ہے کہ کیوں
ایسا رعب اور ہراس کنیز پر طاری ہوا۔ پس تین
بار آوازِ بلند فرمایا لا باس علیک
اے کنیز! ذرا اندیشہ نہ کر۔ میں نے تجھے
رضائے الٰہی کے لئے آزاد کر دیا۔

آپ کے زرّیں اقوال لاکھوں ہیں۔ صرف
ایک قول یہاں درج کیا جاتا ہے۔
"آپ نے فرمایا کہ پانچ شخصوں کی صحبت
سے پرہیز کر۔

(۱) ایک جھوٹ بولنے والا کہ تو ہمیشہ اس کی
وجہ سے دھوکہ میں رہے گا۔
(۲) دوسرے احمق کہ ہرچند تیرا نفع چاہیگا
تیرا نقصان ہی ہوگا اور وہ نہ جانے گا کہ میں کیا کر
رہا ہوں۔
(۳) تیسرے بخیل کہ تیرے اچھے وقتوں کو برباد
کرے گا۔
(۴) چوتھے ڈرپوک کہ ضرورت کے وقت
تجھ کو تباہی میں چھوڑ دے گا۔
(۵) پانچویں فاسق کہ تجھکو ایک نوالہ پر بیچ
ڈالے گا۔

ان ہی چند سوانح اور فضایل پر اس مقالہ
کو ختم کرتے ہیں۔

ورق تمام ہوُا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیئے اس بحرِ بیکراں کیلئے (غالبؔ)

رباعی

کیا کیا دنیا سے صاحبِ مال گئے
دولت نہ گئی ساتھ نہ اطفال گئے
پہنچا کے لحد تک سب آئے پھر کر
ہمراہ اگر گئے تو اعمال گئے
(انیسؔ)

رفتار زمانہ

دنیا کی نگاہیں مصری اور روسی محاذوں کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ مصر میں آٹھویں فوج نے دشمن کو آگے بڑھنے سے بکلم روک دیا۔

رومل نے العالمین کے آس پاس مورچہ بندی شروع کردی مگر جرنیل آکنلک نے اسے چین لینے نہ دیا۔ برطانوی توپخانے اور طیارے دشمن پر ایسی تندی سے پل پڑے کہ اس کے پاؤں اکھڑ گئے اور پیٹتا پیٹتا پانچ میل ہٹا۔ اس کی بہت سی نفری ماری گئی یا پکڑ لی گئی۔ اپنی بکتری اور لاد و گاڑیاں بھی بہت سی کھو بیٹھا۔ متحدی ہوائی بیڑے نے لیبیا میں دشمن کے نئے ٹھکانوں پر کئی کرارے دھاوے کئے۔ تازہ ترین وہ ہے جو ۱۴ جولائی کی رات کو طبرق پر کیا گیا۔ اس دھاوے میں برطانوی بمبار کافی تعداد میں شریک تھے۔ جگہ جگہ آگ لگ گئی یہاں تک کہ طبرق سرتاسر آگ میں لپٹ گیا۔ ابھی ابھی جو اطلاعات ملی ہیں اُن سے پایا جاتا ہے کہ دشمن کے ٹینکوں اور پیادہ فوجوں نے تل العیسے کے مقام پر متحدین کی بیرونی چوکیوں پر حملہ کر ڈالا۔ رات پڑ گئی پر لڑائی نہ تھمی۔ تل العیسے کا ٹیلہ دو بار ادھر سے اُدھر گیا اور پھر اُدھر سے اِدھر آیا۔ میدانِ جنگ متحدین ہی کے قابو میں رہا۔

محوریوں نے ایک نیا ڈھونگ باندھنا شروع کیا ہے اب وہ یہ پراپیگنڈا کر رہے ہیں کہ "مصر مصریوں کا ہے"! لیکن چال کچھ پھیکی پھیکی سی رہی۔

اخبار "الوفد" لکھتا ہے:۔ حالات حسب معمول ہیں۔ ہر طرف سکون اور تمام طبقوں میں اطمینان پایا جاتا ہے

جرمنوں نے روس پر اپنا بڑا دھاوا کر ہی ڈالا۔ جرمن اب ووروِنش کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ بقول رائٹر روسی جانباز بھرے شیروں کی طرح لڑ رہے ہیں۔ دریائے ڈان کے آس پاس اس وقت ڈیڑھ سو میل لمبا محاذ ہے خیال کیا جاتا ہے کہ اس محاذ پر جرمنوں کے اسّی موٹر سوار اور پیادہ ڈویژن۔ چار ہزار ٹینک اور تین ہزار ہوائی جہاز مصروف کارزار ہیں۔ سرخ فوج تعداد میں ہے تو کم پر بوگوچار چھوڑنے سے پہلے اس نے دشمن کو کرارے نقصانات پہنچائے۔ ووروِنش کے شمال میں پہل اب بھی روسیوں ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جرمن چاہتے ہیں دریائے والگا پہنچکر قفقاز کو روس سے سوا کر ڈالیں۔

برطانوی درانه تانکونه دَ مغربی صحرا محاذ ته روان دی۔ جرنیل آکنلیک ته چه کوم امداد ورسی دا دَ هغې یوه معمولی حصه ده۔

برطانوی بھاری ٹینک جو مغربی صحرا کے محاذ کی طرف جا رہے ہیں۔ جنرل آکنلیک کو جو کمک پہنچ رہی ہے اُس کا یہ محض ایک شمہ ہے۔

۷ رجولائی کو چین نے اپنی موجودہ جنگ کی پانچویں سالگرہ منائی ۔ دنیا بھر سے مبارکبادیں آئیں ۔

مارشل چیانگ کایشک نے ریڈیو کے ذریعہ اپنی قوم کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :-

جو قوتیں حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہی ہیں ان میں ہم سب سے آگے آگے ہیں ۔ ہمارے ہموطن بہت سے جان دے چکے ہیں ۔ بہت سی عورتیں بیوہ ہو گئی ہیں ۔ بہت سے بچے یتیم ہو گئے ہیں ۔ ہمیں اندر کی طرف ہٹنا پڑا مگر ان ساری مصیبتوں اور آزمایشوں میں چینی قوم کی ہمت میں سرِ مو فرق نہیں آیا ۔ ہمارے پہاڑ ہی ہمارے قلعے بن گئے ۔ بنجروں میں ہرے بھرے کھیت لہلہا رہے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ چین کا اس وقت دنیا کی سب سے بڑی قوموں میں شمار ہے ۔ اقوامِ متحدہ کے مشوروں میں چین کی آواز اب وزن رکھنے لگی ہے ۔ سب سے بالاتر یہ کہ جاپان کے خلاف متحدین کا دار و مدار چین ہی پر ہے ۔"

اخبار "الحوادث" میں جو بغداد سے روزانہ شائع ہوتا ہے عراق کے ایک سابق وزیر کا ایک مقالہ چھپا ہے ۔ اس مقالے کے دوران میں آپ فرماتے ہیں :-

" جرمنی نے یہ ٹھانی تھی کہ ساری دنیا کا مالک بن بیٹھے اور ساری قوموں سے فائدہ اٹھائے ۔ اس مقصد کا دار و مدار عموماً اسلامی دنیا پر اور خصوصاً عربی ممالک پر تھا ۔ ادھر عربوں کی بغاوت نے قیصر کے تمام منصوبوں کو مٹی میں ملا دیا ۔ یہ بغاوت شاہ حسین مرحوم نے کرائی تھی اور آپ ہی نے جرمنی کا بھانڈا پھوڑا ۔ برطانیہ کی امداد سے عربوں کی آزادی کی صورت پیدا کر دی یہی برطانیہ جو عربوں کا حامی اور مسلمانوں کا خیر خواہ ہے"

راقم نے یہ بھی لکھا :- نازیوں کے وہی مقاصد ہیں جو قیصر ولیم کے تھے ۔ یعنی اور قوموں کو غلام بنائے رکھنا ۔ ان سے فایدہ اٹھانا اور ان کی طبعی ثروتوں کو لوٹنا ۔

اسی اخبار کی ایک بعد کی اشاعت میں عراق کے سرکردہ دینی پیشوا امام محمد الحسین الکاشف الغاتہ فرماتے ہیں :-

" نازیوں کا اور قوموں کو غلام بنائے رکھنا کفر ہے بدترین بدکاری ہے اور بھاری گناہ ہے ۔"

یہ امام صاحب مسلمانوں سے اپیل کر رہے ہیں کہ اٹھو ان لوگوں سے لڑ مرو جو یہ تلقین کرتے ہیں کہ بندہ خدا ہو سکتا ہے ایک نسل دوسری نسل پر فوقیت رکھتی ہے یا یہ کہ ایک قوم کو دوسری قوموں کو غلام بنانے کا حق حاصل ہے ۔

گورنر صوبہ مشرقی نے بمعیت سول اہلکاران جلال آباد کے " موسسۂ صنائع دستی " کا معاینہ کر کے اسکی غیر معمولی ترقی پر اظہار خوشنودی فرمایا ۔

والاحضرت وزیر معارف نے استقلال کالج اور نجات کالج کے کامیاب طلبہ کو بی اے کی سندیں تقسیم فرمائیں۔

اعلیحضرت ہمایونی شاہ افغانستان نے شوکت مآب صدر جمہوریہ ترکی کو ڈاکٹر سیدام مرحوم وزیر اعظم ترکی کی وفات پر تعزیت کا تار بھیجا۔ اسی مضمون کا تار والاحضرت وزیر خارجہ افغانستان نے وزیر خارجہ ترکی کے نام بھیجا۔

وزارت معارف افغانستان نے ایک نیا محکمہ موسوم بہ "ریاست پشتوی وزارت معارف" کھولا ہے۔ اس محکمہ کا کام یہ ہوگا کہ پشتو زبان کی تعلیم کی نگرانی کرے اور پشتو زبان میں نصابی کتابیں تالیف کرے۔

شہر میمنہ میں زیر صدارت گورنر صوبہ میمنہ ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں اور اعلیٰ حکام بھی شریک ہوئے کارروائی جلسہ تلاوت کلام اللہ سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد اسکولوں کے کامیاب طلباء کو سندیں دی گئیں

عراق کے نئے وزیر مختار متعینہ کابل ہز ایکسیلنسی جمیل پاشا الراوی ایران کے راستہ سے بتاریخ ۱۵ سرطان ہرات میں تشریف فرما ہوئے۔ وزیر خارجہ افغانستان نے آپکا استقبال کیا۔ اسکے بعد آپ کابل روانہ ہو گئے۔

صوبہ غزنی کے مدرسین کیلئے وزارت معارف کیطرف سے چھ ماہ کا تعلیمی کورس تجویز ہوا ہے تاکہ مدرسین میں علمی معیار بلند ہو سکے

اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے
تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے

ذوقؔ

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

میرؔ

غصے میں تیرے ہم نے بڑا لطف اٹھایا
اب تو عمداً اور ہی تقصیر کریں گے

انشاؔ

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے
اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

تسلیمؔ

اگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

غالبؔ

شوخی تو دیکھو تیر کو سینہ سے کھینچ کر
کہتا ہے میرے تیر کا پیکاں رہ گیا

مصحفیؔ

ضعف اسے کہتے ہیں سینہ سے لبوں تک آئے
سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اٹھا

رندؔ

مسجد سے نکل کر رہ بتکدہ بھولا
تقدیر نے میری رکھا نہ کہیں کا

اسیرؔ

پشتو رسم الخط

پروفیسر محمد علی خان صاحب ایم - اے نے پشتو رسم الخط کے بارہ میں پشتو زبان میں ایک محققانہ اور دلچسپ مقالہ لکھا ہے جس کا ترجمہ ہم نہایت مسرت اور شکریہ کے ساتھ ذیل میں درج کرتے ہیں۔ آپ نے پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور تقریباً سترہ برس وزارت معارف افغانستان میں سینئر پروفیسر آف ہسٹری رسر معلم تاریخ رہے۔ آپنے اپنے قیام افغانستان میں انگریزی میں دو مشہور اور نہایت مفید کتابیں "پروگریسیو افغانستان" (افغانستان بترقی) اور "گائیڈ ٹو افغانستان" (رہنمائے افغانستان) تصنیف کی ہیں ۔ (ادارہ)

ان دنوں مجلہ شریفہ "نن پرون" میں میں نے پشتو رسم الخط کے موضوع پر دو مقالے پڑھے - ایک مقالہ تو جناب مولانا عبدالقادر خان صاحب سابق ہیڈ ماسٹر اسلامیہ کالجیئیٹ سکول پشاور کے قلم سے تھا اور دوسرا ہمارے پشتو زبان کے شیریں کلام شاعر جناب سید رسول خان صاحب کے قلم سے - لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آجکل پشتون قوم کے تمام طبقوں میں ایک علمی لہر دوڑ رہی ہے اور اس غیور قوم نے جو ہمیشہ میدان مردانگی میں دوسروں سے گوئے سبقت لیجاتی رہی ہے اب پکا ارادہ کرلیا ہے کہ اپنی زبان کو زندہ کرے - اور دوسری قوموں کے برابر گامزن ہوکر اپنی گذشتہ عظمت کو پھر تازہ کرے ۔

اس میں کلام نہیں کہ موجودہ زمانہ میں علم کے بغیر ترقی محال ہے - ملت افاغنہ کے پیچھے رہ جانے کی وجہ یہی تھی کہ وہ مروجہ علوم سے غافل رہی - اب یہ قوم اپنی پستی کی اصلی وجہ پاگئی ہے - جہالت کیخلاف اس نے اعلان جنگ کردیا ہے اور بڑے انہماک کے ساتھ تحصیل علوم میں کوشاں ہے تاکہ اپنی گذشتہ کمیوں کو پورا کرکے جلد سے جلد ترقی اور عظمت کی منزل مقصود پر جا پہنچے ۔

حکومت افغانستان بھی گذشتہ چند سال سے اپنی قومی زبان کے سدھارنے اور پھیلانے کے لئے جدو جہد کر رہی ہے چنانچہ تمام مکاتب میں فارسی کی جگہ پشتو نے سنبھال لی ہے - اور عوام کو پشتو سکھانے کے لئے ملک کے گوشہ گوشہ میں خاص کلاسیں کھل گئی ہیں اور پشتو لکھنا پڑھنا ہر ملازم کے

لئے لازمی قرار دیا گیا ہے ۔ عامتہ الناس کے استعمال
کے لئے چند نہایت مفید کتابیں پشتو میں چھپوائی گئی
ہیں اور افغانستان کے اخبار اور رسالے بھی رفتہ رفتہ
بجائے فارسی کے پشتو میں نشر ہونے لگے ہیں ۔

حکومت کی اس عاقلانہ روش نے افغانستان
بھر میں ایک نئی روح پھونک دی ہے اور امید کی جا
سکتی ہے کہ دنیا کی اور اقوام کی طرح پشتون قوم بھی
علمی اور ادبی ذخیرے اپنی قومی زبان میں اکٹھے کرلے گی

سرحدی افغان بھی اپنی مقدور کے مطابق اپنی
قومی زبان کے پھیلانے میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں ۔
اور اس ضمن میں مولانا عبدالقادر خان صاحب کی
نمایاں خدمات اور کوششیں انتہائی تعریف اور
قدر دانی کی مستحق ہیں ۔ مولانائے موصوف ایک
ذی علم و حس افغان ہیں اور مدتوں سے اپنی قومی
زبان کی خدمت کر رہے ہیں اور ایک مہینہ سے تو
اپنے اور مشاغل سے کنارہ کش ہو کر اپنی قومی زبان
کی اصلاح اور توسیع کے لئے اٹل ارادے کے ساتھ
ہمہ تن مصروف ہو گئے ہیں اور اپنی امداد کے لئے
انہوں نے کئی ایک فاضل سرحدی افغانوں کو اپنے
دور پیش جمع کرلیا ہے ۔

مولانا صاحب موصوف کی رائے ہے کہ
پشتو کا مروجہ رسم الخط ناقص ہے ۔ اس میں ایسی
اصلاح ہونی چاہیئے کہ مبتدیوں کے لئے آسانی
ہو جائے ۔ اور چونکہ فارسی رسم الخط کو عمومیت حاصل
ہے بہتر ہوگا اگر موجودہ پشتو رسم الخط کی جگہ
فارسی رسم الخط ہی بعض تبدیلیوں کے بعد استعمال
کیا جائے ۔

جناب سید رسول خان صاحب کو اختلاف ہے ۔
آپ فرماتے ہیں کہ یہ تجویز ممکن العمل نہیں کیونکہ بعض
افغانی حروف کے کئی کئی تلفظ ہیں ۔ مثلاً حرف ږ
جو علاقہ پشاور اور صوبہ مشرقی افغانستان میں
"گ" بولا جاتا ہے قندہار وزیرستان اور کوئٹہ
میں فارسی "ژ" کی آواز دیتا ہے اسی طرح سے
حرف ښ ہے جسے بعضے "ش" بولتے ہیں بعضے
"خ" اور بعضے ان دونوں کے بیچ بیچ جرمنی "خ"
کی طرح تلفظ کرتے ہیں ۔

درحقیقت کسی زبان کی ترقی کے لئے اس کے رسم الخط
کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے اور اس کے بارہ
میں بہت سوچ بچار کے بعد قدم اٹھانا چاہیئے ۔ پشتو
رسم الخط کو ایک عمومی حیثیت اب بھی حاصل نہیں ہے
اور اس کی اصلاح کرنا چنداں کٹھن نہیں ۔ لیکن اگر
کہیں خدانخواستہ اس وقت غلطی کی تو کچھ عرصہ بعد
پھر صلاح بھی نہ ہو سکے گی ۔ ع

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

جو لوگ انگریزی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں
کہ انگریزی تلفظات بھی کسی صحیح اصول پر مبنی نہیں

ہیں۔ بعض حروف ایسے ہیں جن سے کئی کئی آوازیں
نکلتی ہیں اور اس نقص کو انگریز اور امریکن لوگ ابھی
تک رفع نہ کرسکے۔ اور خود مقر ہیں کہ ان نقائص کی
وجہ سے ایک انگریز طالب علم جرمن یا فرانسیسی
طالب علم سے درس میں پیچھے ہے۔

پس ہمارا فرض ہے کہ ہم ان مسائل کیطرف متوجہ
ہوں۔ پہلا مسئلہ تو یہ ہے کہ ہمارا رسم الخط کیا ہو؟
دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی زبان اور تحریر کی کیسے
اصلاح کی جائے؟

بعض حضرات پشتو کیلئے لاطینی رسم الخط تجویز کرتے
ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ عربی زبان تو سامی الاصل ہے
لیکن عربی رسم الخط اصل میں عبرانی اور آرامی ہے البتہ عربوں
نے عربی زبان میں ایسی ایسی اصلاحات کی ہیں کہ یہ زبان
اب دُنیا کی بہترین اور متمول ترین زبانوں میں محسوب ہو
رہی ہے۔ یہاں تک کہ اور زبانوں کی چنداں محتاج نہیں
رہی اور اُسے پانسو سے زیادہ الفاظ غیر زبانوں سے
لینا نہیں پڑے۔

عربی رسم الخط چونکہ سامی زبان سے خاص علاقہ
رکھتا ہے غیر سامی خصوصًا آریائی زبانوں کا اسے اختیار
کرلینا مشکلات سے خالی نہیں۔ پشتو ایک آریائی
زبان ہے اور اب بھی اپنی قدیمی ہیئت لئے ہوئے
ہے۔ اس میں بعض آوازیں ہیں جو اور کسی زبان میں نہیں
پشتو ہی پر موقوف نہیں ہر قوم کی زبان میں اپنی خاص
صدائیں ہوتی ہیں اور ہر قوم کے افراد کے بعض ایسے پٹھے
ہوتے ہیں جن کے استعمال سے وہ مخصوص صدائیں قائم
رہتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی دوسری قوم کے زبان کے
مخصوص آوازوں کے ادا کرنے میں مشکل پیش آتی ہے
جیسے عربی میں حروف ع۔ ح۔ ص۔ ض۔ ق۔ ذ۔ ظ
وغیرہ مخصوص آوازوں سے ادا ہوتے ہیں ویسے پشتو کے
حروف ښ ږ څ وغیرہ کی آوازیں مخصوص ہیں اہل فارس
پشتو کے حروف ڑ۔ ټ د ډ کو اچھی طرح ادا نہیں کرسکتے

عربی زبان میں ۲۸ حروف تہجی ہیں ان میں سے ہر
حرف کی صدا دوسرے حرف کی صدا سے سوا ہے۔ لیکن
غیروں کے نزدیک عربی کے بعض حروف کی آوازیں اتنی ملتی
جلتی ہیں کہ وہ ان میں امتیاز کرنے سے قاصر ہیں۔ برعکس
اس کے عرب انہیں بے تکلف علیحدہ علیحدہ تلفظ کرسکتے
ہیں۔ بلکہ اُن کے نزدیک ایک معمولی بات ہے۔ ذرا ان
ہم آہنگ حروف کو ملاحظہ فرمائیے۔

ت ط۔ ث س ص۔ ذ ز۔ ض ظ۔ ح ہ۔ ا ع۔ ہر
ٹکڑہ کے حروف میں امتیاز کرنا ایک غیر عرب کے لئے
مشکل ہے۔ اور عربی حروف تہجی میں صرف بیس حروف
ایسے ہیں جنہیں ایک غیر عرب درستی سے تلفظ کر
سکتا ہے۔ ایسی صورت میں عربی حروف تہجی کسی
دُوسری زبان بالخصوص پشتو زبان کی ضروریات
کو کیونکر پورا کرسکتے ہیں اگرچہ
خود پشتو کی خاص ضروریات کچھ تو فارسی

حروف کے ذریعہ اور کچھ اپنے مخصوص حروف ۔ ټ ۔ ښ ۔ څ ۔ ځ ۔ ډ ۔ ړ و ښ کے ذریعہ پوری کی ہیں

اس کے علاوہ فارسی رسم الخط میں دو نقائص اور بھی ہیں ۔ پہلا یہ کہ زیادہ تر حروف تہجی تین طرح سے لکھے جاتے ہیں ۔ وہی حرف لفظ کے شروع میں واقع ہو تو ایک طرح سے لکھا جاتا ہے بیچ میں آئے تو اور طرح اور اخیر میں ہو تو اور ہی طرح ۔

حروف "ج" و "ع" کی مثال لے لیجئے ۔ 'ج' تین طرح لکھا جاتا ہے یعنی جـ ـجـ ج اسی طرح سے 'ع' تین طرح تین طرح لکھا جاتا ہے یعنی عـ ـعـ ع ۔ ایک نو آموز کے لئے ان سب باتوں پر حاوی ہوجانا بہت مشکل ہوتا ہے ۔

دوسرا نقص یہ ہے کہ بجز قرآن مجید کے اعراب عربی رسم الخط میں لکھے نہیں جاتے ۔ عربی زبان تو درجۂ کمال تک پہنچ چکی ہے ۔ کتب عربی پڑھنے میں چنداں دقت نہیں ہوتی لیکن اور زبانوں میں ایسا ہو نہیں سکتا ۔

انہیں وجوہات کی بنا پر ممالک اسلامی میں بعض لوگ لاطینی رسم الخط کے طرفدار ہیں ۔ ٹرکی میں لاطینی رسم الخط سرکاری طور پر ۱۹۲۸ء میں اختیار کیا گیا ۔ اس کے طرفداروں کا دعویٰ ہے کہ اس رسم الخط کے یہ مندرجہ ذیل فوائد ہیں :۔

(۱) دنیا کی تین چوتھائی سے زیادہ لوگوں نے لاطینی رسم الخط اختیار کیا ہوا ہے ۔ اگر کوئی شخص اس رسم الخط سے واقف ہو تو غیر زبانوں سے بلا دقت فائدہ اٹھا سکتا ہے آجکل تجارتی تعلقات زیادہ تر مغربی ممالک ہی سے ہیں اس لئے بھی لاطینی رسم الخط کا جاننا ہر فرد کے لئے ضروری اور مفید ہے ۔

(۲) ۔ اگر پشتو لاطینی رسم الخط اختیار کرلے تو غیر زبانوں کے الفاظ اور اصطلاحیں آسانی سے کھپ سکتی ہیں اور پشتو زبان ہر لحاظ سے مکمل اور متمول ہوجائے گی ۔

(۳) ۔ لاطینی رسم الخط میں حروف ساکن کی طرح حروف علت بھی ایک دوسرے کے ساتھ لکھے جاتے ہیں ۔ اس لئے اس کا پڑھنا اور سمجھنا زیادہ سہل ہے ۔

(۴) ۔ لاطینی رسم الخط میں کوئی حرف لفظ کے شروع میں واقع ہو خواہ بیچ میں خواہ اخیر میں لیکن حرف کی شکل ویسی کی ویسی ہی رہتی ہے ۔ اور اس سے نو آموز کو آسانی ہوتی ہے ۔

(۵) ۔ لاطینی رسم الخط بائیں سے دائیں طرف لکھا جاتا ہے اور عربی یا فارسی رسم الخط دائیں سے بائیں طرف ۔ اس لحاظ سے بھی اول الذکر طریقۂ تحریر زیادہ آسان ہے ۔

(۶) ۔ لاطینی ٹائپ اور چھپائی کے تمام لوازمات سستے اور بلا تردد دستیاب ہوسکتے ہیں ۔

مذکورہ بالا فوائد سے انکار ہو نہیں سکتا ۔ لیکن پشتو میں لاطینی رسم الخط کا اختیار کرنا بھی بعض عیوب

اور مشکلات سے مبرا نہیں۔ کیونکہ

(۱)۔ لاطینی حروف تعداد میں صرف چھبیس ہیں۔ اور پشتو حروف چالیس۔

(۲)۔ تعلیم یافتہ طبقوں کو مشکلات کا سامنا ہوگا۔ ممکن ہے رفتار امور میں سکتہ واقع ہو جائے

(۳)۔ کلام اللہ عربی رسم الخط میں ہے۔ ہمارے لئے محض ترجمہ کافی نہیں بلکہ اصل ضروری ہے۔ اور اصل کسی دوسرے رسم الخط میں لکھا نہیں جا سکتا

(۴)۔ اگر ہم لاطینی رسم الخط اختیار کر لیں تو اپنے پہلے علمی گنجینوں سے جو عربی رسم الخط میں موجود ہیں کیسے فایدہ اُٹھا سکیں گے؟

(۵)۔ لاطینی رسم الخط میں چار قسم کے حرُوف ہیں یعنی چھپائی میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی۔ اسی طرح تحریر میں بھی چھوٹے اور بڑے حروف ہیں۔ گویا ایک طفل کو ۱۰۴ حروف کا جاننا ضروری ہوگا۔

اس مسئلہ کا حل افغان علما اور فضلا کے ہاتھ میں ہے ان کو چاہیئے کہ نہائت سوچ بچار کے بعد بلا رو رعائیت محض قوم کے مجموعی مستقبل کو سامنے رکھکر صحیح راستہ اختیار کریں۔ خدا نے چاہا تو گوہر مقصود مل کے رہے گا۔ اور ہم بھی اپنے آپ کو دنیا کی مقتدر قوموں میں شمار کر سکیں گے۔

میرا شخصی عقیدہ تو یہ ہے۔ کہ اگر مذکورہ بالا عیوب اور مشکلات خاطر خواہ طور پر رفع ہو سکیں تو پشتو زبان کا رسم الخط لاطینی ہی ہونا چاہیئے +

(محمد علی)

آمد بہار

دُھوپ کی تیزی سے تانا بن گیا تھا آسماں
ذرے ذرے کے جگر سے اُٹھ رہا تھا اک دُھواں

اک قیامت تھی قیامت موسم گرما کی دھُوم
چل رہی تھی ہر طرف بھیری ہوئی بادِ سمُوم

آسماں بھوکا زمیں پیاسی فضائیں بے قرار
دیکھکر یہ حشر اُٹھی رحمتِ پروردگار

جھُوم کر برسی گھٹا ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
مضمحل خشکی پہ چھائی تازگی ہی تازگی

برف کے سانچے میں سوُرج کی تمازت ڈھل گئی
آگ کے شعلوں کی حدت سرد تر ہونے لگی

کونپلیں پھوٹیں فضا جھُومی جوانی آگئی
ذرے ذرے میں سمٹ کر زندگانی آگئی

(مس سحاب آغا شاعر)

بیگناہ قیدی

زندگی اپنی جب اس شکل میں گذری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

شہر ولادیمبر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اسکا نام ایوان ڈمٹرش آکسیانوف تھا۔ دو دوکانوں اور ایک مکان کا مالک تھا۔

آکسیانوف ایک شکیل جوان تھا۔ اس کے بال بھورے گنگھرالے تھے۔ مزاج میں بلا کی شوخی تھی۔ گانے بجانے کا دلدادہ تھا۔ نوجوانی میں بیکڑ رہا۔ کہیں زیادہ پی لیتا تھا تو خاصی دھماچوکڑی مچا دیتا تھا۔ جورو آئی اور شراب چھٹی مگر کبھی کبھار چکھ لیتا تھا۔ سے

غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی
پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

ایک دن نزنی میلہ جانے کی ٹھانی تو اس کی جورو نے کہا:۔ آج نہ جاؤ۔ میں نے برا سپنا دیکھا ہے۔

آکسیانوف (ہنسکر):۔ تمہیں شاید یہ کھٹکا ہے کہیں وہاں گلچھرّے نہ اڑانے لگوں۔

جورو:۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ مجھے کیا کھٹکا ہے۔ اتنا جانتی ہوں کہ سپنا برا تھا۔ میں نے دیکھا تم شہر سے لوٹے تو تمہارے سر کے بال سفید تھے۔

آکسیانوف (ہنسکر):۔ واہ! یہ تو اچھا شگون ہے۔ دیکھنا کہیں میں سب کچھ بیچ کر میلہ سے تمہارے لئے سوغاتیں ہی نہ لے آؤں۔

غرض آکسیانوف چل دیا۔ آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ اسے ایک اور سوداگر ملا جس سے جان پہچان تھی۔ دونو ایک ہی سرائے میں رات رہے۔ پہلے دونوں نے چائے پی۔ پھر اپنے اپنے کمرے میں جو ساتھ ساتھ تھے جا سوئے۔

آکسیانوف حسب عادت تڑکے اُٹھا۔ گاڑیبان کو کہا گھوڑے جوتو۔ خود مالک سرائے کو بل ادا کیا۔ اور سرائے سے چل دیا

کوئی پچیس میل جاکر پھر وقفہ کیا۔ تاکہ گھوڑے دانہ کھالیں۔ خود ذرا آرام کرکے برساتی کے نیچے آن بیٹھا۔ سرائے والے کو کہا سماوار میں کوئلے ڈالو۔ خود اپنی ستار بجانے لگا۔

اتنے میں گھنٹیوں کی جھنکار سنائی دی۔ ایک گاڑی آئی اور اس میں سے ایک افسر اور دو سپاہی اُترے۔ افسر نے آکسیانوف سے پوچھا:۔ رات آپ کہاں ٹکے تھے؟ اکیلے ہی تھے یا آپ کے ساتھ کوئی اور سوداگر بھی تھا؟۔ اسے آپ نے آج صبح دیکھا؟ آپ سرائے سے تڑکے ہی کیوں چل پڑے؟

آکسیانوف نے اس ساری جرح کے پورے جواب
دیئے۔ وُہ حیران تھا کہ ماجرا کیا ہے۔ افسر کو کہا:۔ آپ تو
اس طرح دریافت کر رہے ہیں جیسے کسی چور یا لٹیرے سے
کیا کرتے ہیں۔ میں اپنے کام جا رہا ہوں اس جرح کی
ضرورت ہی کیا تھی؟

تب اس افسر نے کہا:۔ میں اس ضلع کا افسر ہوں
میں آپ سے اسلیئے دریافت کر رہا ہوں کہ وہ سوداگر جو رات
آپ کے ساتھ رہا آج صبح مُردہ پایا گیا اور اس کا گلا کٹا
ہُوا تھا۔ میں آپ کے اسباب کی تلاشی لینا چاہتا ہُوں

اس پر اس افسر اور اس کے ساتھیوں نے اسکے
اسباب کی پڑتال شروع کر دی۔ ایک تھیلہ میں سے ایک
چاقو نکلا۔ افسر نے چلّا کر پُوچھا یہ چاقو کس کا ہے؟ یہ لہو
کیسا ہے؟

آکسیانوف نے دیکھا تو واقعی ایک خون آلُود چاقو
تھیلے میں سے نکلا۔ اس کے تو چھکے چھُوٹ گئے۔ آکسیانوف
نے رُک رُک کر کہا:۔ مجھے معلُوم نہیں۔ یہ چاقو میرا
نہیں ہے۔

افسر:۔ آج صبح دیکھا گیا کہ وہ سوداگر مرا پڑا ہے
اور اس کا گلا کٹا ہُوا ہے۔ تم ہی یہ فعل کر سکتے تھے۔ کیونکہ
مکان اندر سے مقفّل تھا اور کوئی اس کے اندر تھا نہیں
اب یہ خون آلُود چاقو تمہارے پاس سے نکلا اور تمہاری
وضع قطع بتا رہی ہے کہ تم ہی نے یہ قتل کیا ہے۔ بتلاؤ
تم نے اُسے کیسے مارا اور کتنا روپیہ اس کا چُرایا۔

آکسیانوف نے قسم کھا کر کہا:۔ یہ کام میرا نہیں ہے۔
چائے پینے کے بعد میں اس سوداگر سے ملا ہی نہیں۔ میرے
پاس آٹھ ہزار روبل ہیں سو میرے اپنے ہیں اور یہ چاقو
میرا نہیں۔

اس وقت آکسیانوف کا رنگ فق تھا۔ آواز لرز رہی تھی
بدن کانپ رہا تھا۔ گویا وہی مجرم تھا۔

افسر کے حکم سے سپاہیوں نے آکسیانوف کی مشکیں کسیں
اور اُسے چھکڑے میں دھکیلدیا۔ آکسیانوف زار زار رویا
کیا۔ مال اسباب سب چھن گیا اور وُہ خود حوالات میں ڈال
دیا گیا۔ ولادیمیر میں اس کے چال چلن کے بارے میں دریافت
ہوئی۔ وہاں سب نے بتلایا کہ اوایل میں البتہ پیکر اور
لااوبالی سا تھا لیکن اب نہایت نیک چلن ہے۔ قصّہ کوتاہ
مقدّمہ شروع ہُوا۔ اس پر فردِ جُرم یہ لگایا گیا کہ اس نے
اس سوداگر کو قتل کر کے اس کے بیس ہزار روبل سرقہ کر لیئے
اس کی بیوی آس چھوڑ بیٹھی تھی۔ کچھ بن نہیں آتی تھی
بچّے سب چھوٹے تھے ایک ننھا گود میں تھا سب کو ساتھ
اُٹھا میاں سے ملنے گئی۔ ملاقات کی اجازت نہیں ملتی تھی
بہت چیخی چلّائی۔ گڑگڑائی تب کہیں اجازت ملی۔ میاں
کو قیدیوں کا لباس پہنے اور بیڑیوں میں جکڑا دیکھا اور غش
کھا کر گر پڑی۔ ہوش آئی تو باتیں ہوئیں۔ آکسیانوف نے
آپ بیتی سُنائی۔ اب کیا کیا جاوے۔ زار روس کو عرضی
بھیجی جائے کہ ایک بیگناہ آدمی مارا جا رہا ہے۔ بیوی
نے کہا میں یہ عرضی بھیج چکی ہوں لیکن شنوائی نہیں۔

آکسیانوف اداس ہوگیا۔

بیوی:۔ میں نے نہ کہا تھا آج نہ جاؤ۔ اچھا پیارے مجھے سچ سچ بتاؤ کہ یہ سب کچھ تم نے تو نہیں کیا؟

آکسیانوف:۔ اچھا تو تم بھی مجھ پر شبہ کرتی ہو۔

یہ کہا اور ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر زار زار رونے۔ اتنے میں سپاہی نے آکر کہا کہ وقت ہوچکا ہے۔ بیوی اور بچے رخصت ہوئے۔ یہ اُن کی آخری ملاقات تھی۔

آکسیانوف نے زار روس کو عرضی بھیجنے کا خیال چھوڑ دیا۔ خدا ہی پر آسرا تھا۔ وہی اصلیت جانتا تھا۔ بیوی تک تو شبہ کرتی تھی۔

مقدمہ کی سماعت ہوچکی۔ آکسیانوف مجرم قرار پایا سزا یہ دی گئی کہ بید لگائے جائیں۔ اور اس کے بعد سائبیریا میں عمر بھر قید رہے۔

بید لگائے گئے۔ زخم اچھے ہوئے تو اور مجرموں کیساتھ اُسے سائبیریا بھیج دیا۔ چھبیس برس وہاں رہا۔ بال بالکل سفید ہوگئے۔ داڑھی لمبی ہوگئی۔ دل لگی سب جاتی رہی سر اور کندھے جھک گئے۔ چلتا بھی تھا دھیرے دھیرے۔ قہقہے چہچہے سب لد گئے۔ بات بھی کم کرتا تھا۔ ہاں خدا کی عبادت بہت کرتا تھا۔

قید خانہ کے اہلکار آکسیانوف سے اسکی مسکینی کی وجہ سے بہت خوش تھے اور قیدی اسے "ولی" اور "دادا" کہتے تھے حکام تک کوئی شکایت پہنچانا ہوتی تھی تو آکسیانوف ہی چنا جاتا تھا اور اپنے جھگڑے بھی وہ آکسیانوف ہی کے سامنے پیش کرتے اور اُس کے فیصلے کو مانتے تھے۔

گھر سے کوئی خبر نہیں آتی تھی۔ آکسیانوف کو یہ بھی پتا نہ تھا کہ اس کی بیوی اور بچے جیتے بھی ہیں۔

نئے قیدی آتے ہی رہتے تھے۔ ایکدفعہ ایک بہت باتونی قیدی آیا۔ دُوسرے قیدی بیٹھے اس کی باتیں سُننے لگے۔ آکسیانوف بھی موجود تھا۔ وُہ کہتا تھا کہ میں پہلے بھی سائبیریا قید ہوکر آیا تھا لیکن بہت جلد یہاں سے بھاگ گیا تھا۔ اس مرتبہ مجھے چوری کے الزام میں قید کیا ہے۔ حالانکہ میری کوئی خطا نہ تھی۔ اس سے پیشتر میں نے واقعی جرم کیا تھا لیکن اس جرم میں مجھے کسی نے نہیں پکڑا۔

باتوں باتوں میں اس نے بتلایا کہ میں رہنے والا ولادیمیر کا ہوں نام میرا ماکر ہے اور مجھے سیمونچ بھی کہتے ہیں۔ اس پر آکسیونوف کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے پُوچھا:۔ سیمونچ یہ تو بتلاؤ وہاں کے آکسیونوف نامی سوداگر کو بھی جانتے ہو۔ کیا وُہ جیتے ہیں؟

سیمونچ:۔ کیوں نہیں۔ خوب جانتا ہوں۔ وہ بہت دولتمند ہیں۔ گو اُن کا باپ سائبیریا میں کہیں قید کاٹ رہا ہے۔ آپ یہاں کیسے آئے؟ آکسیونوف نے اپنا ماجرا بتانا نہ چاہا۔ ایک آہ کھینچکر کہا:۔

چھبیس برس سے اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔

سیمونچ:۔ کیسے گناہ؟

آکسیونوف نے کچھ کہنا نہ چاہا۔ لیکن دوسروں نے بتایا کہ کسی نے ایک سوداگر قتل کیا تھا اور قاتل نے چاقو اس کے اسباب میں چھپا دیا اور یہ بیچارہ ناحق سزا پا رہا ہے۔

یہ سن کر سیموچ نے آکسیونوف کو غور سے دیکھا اور کہا:۔ یہ عجیب واقعہ ہے۔ لیکن آپ کتنے بوڑھے ہوگئے ہیں؟

دوسروں نے پوچھا کہ تمہیں تعجب کیوں ہوا اور کیا تم نے اس سے پہلے آکسیونوف کو دیکھا تھا؟

سیموچ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اتنا کہا کہ ہمارا یہاں ملنا بھی بڑا اچنبا ہے۔

آکسیونوف بھی سوچنے لگا کہ شاید اس شخص کو اصلی قاتل کا پتا ہے۔

آکسیونوف:۔ سیموچ۔ شاید تم نے وہ واقعہ سنا ہو۔ شاید تم نے مجھے پہلے بھی دیکھا ہو۔

سیموچ:۔ سنتا کیسے نہ۔ ہر طرف یہی چرچا تھا لیکن مدت ہوگئی ہے اب مجھے کچھ یاد نہیں آتا۔

آکسیونوف:۔ شاید تم نے سنا ہو کہ اس سوداگر کو مارا کس نے؟

سیموچ (ہنس کر):۔ وہی قاتل ہوگا جسکے تھیلے میں سے چاقو نکلا۔ اگر کسی اور نے چاقو وہاں چھپا دیا تو اس کا ثبوت ہی کیا ہے؟ آپ کا تھیلہ تو آپ کے سر کے نیچے تھا۔ اگر کسی نے چاقو رکھا ہوتا تو آپ ضرور جاگ اٹھے ہوتے۔

یہ سن کر آکسیونوف کو یقین ہوگیا ہو نہ ہو قاتل یہی ہے رات بھر سخت پریشان رہا۔ نیند نہ آئی۔ کبھی بیوی بچوں کا خیال آتا۔ کبھی اپنا شباب یاد آتا۔ کبھی اپنی رنگ رلیاں یاد آتیں۔ کبھی سرائے کی برساتی یاد آتی جس کے نیچے بیٹھا ستار بجا رہا تھا کہ پولیس نے اسے آن دبایا۔ اس سے پیشتر کیسی آزادی کیسی بے فکری تھی پھر اس کو وہ سماں یاد آیا جب کہ خلقت کھڑی تھی اور اسے بید پڑتے تھے۔ وہ بیڑیاں۔ وہ قیدی۔ چھبیس سالہ قید کی مصیبتیں۔ اپنا قبل از وقت بڑھاپا۔ غرض اپنی ساری زندگی کے اچھے برے واقعات یاد آتے رہے اور وہ اتنا غمگین ہوا کہ جان تک سے بیزار ہوگیا۔

رہ رہ کے خیال آتا تھا کہ یہ سب ابتلا اسی ناہنجار سیموچ کی لائی ہوئی ہے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھتی اور خیال آتا کہ ایک دفعہ تو اسے ٹھکانے لگا دے چاہے اپنی جان ہی سے ہاتھ دھونا نہ پڑے۔ کبھی رات بھر دعا مانگتا لیکن دل کو تسکین نہ ہوتی۔ دن میں وہ کبھی سیموچ کے پاس نہ پھٹکتا اور نہ اس کی جانب نگاہ اٹھا کے دیکھتا۔

پندرہ دن اسی طرح گذر گئے۔ نیند کافور ہوگئی اور کوئی چارہ نہیں سوجھتا تھا۔ ؎

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا
دل بھی یارب کئی دیئے ہوتے (غالب)

ایک رات وہ ٹہل رہا تھا۔ اس نے دیکھا جن تختوں پر قیدی سوتے تھے ان میں سے ایک کے نیچے سے مٹی نکل رہی ہے۔ ٹھہر گیا دیکھتا رہا۔ اتنے میں سیموئنچ اس تختے کے نیچے سے نکل کھڑا ہوا لیکن آکسیونوف کو دیکھتے ہی ہکا بکا رہ گیا۔ آکسیونوف نے چاہا وہاں سے چل دے لیکن سیموئچ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کہ میں نے دیوار کے نیچے سے ایک سرنگ کھودی ہے اور مٹی اپنے لمبے بوٹوں میں بھر کر باہر پھینک آتا رہا ہوں۔ بڑے میاں چپ رہو گے تو تم بھی بچ نکلو گے۔ اگر کہیں تم نے بھانڈا پھوڑ دیا تو مجھے تو کوڑے پڑیں گے ہی مگر اس سے پہلے تمہیں ٹھکانے لگا دوں گا۔

آکسیونوف مارے غصّہ کے کانپنے لگا۔ اپنا ہاتھ چھڑا کر اُس نے کہا:۔ مجھے یہاں سے بھاگنے کی مطلق خواہش نہیں۔ اب مجھے کیا مارو گے۔ مجھے تو عرصہ ہوا تم مار چکے۔ رہا یہ کہ یہ بات بتاؤں یا نہ بتاؤں یہ میرے بس کی بات نہیں ہے خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔

دوسرے دن سپاہیوں نے دیکھا کہ کوئی قیدی اپنے بوٹ میں سے مٹی پھینک جاتا ہے تلاش کرنے پر وہ سرنگ نظر آ ہی گئی۔ جیل کا گورنر آیا اور سارے قیدیوں سے پوچھتا رہا کہ کس نے سرنگ کھودی ہے ہ سب نے لاعلمی ظاہر کی۔ جنہیں پتا تھا وُہ بھی ننّے بن گئے۔ گورنر آکسیونوف کو اچھا آدمی سمجھتا تھا۔ اس سے کہا:۔

تم سچے آدمی ہو خدا کو حاضر اور ناظر سمجھ کر بتاؤ یہ سرنگ کس نے کھودا ہے۔ آکسیونوف کے لب اور ہاتھ کانپنے لگے۔ تھوڑی دیر کچھ بول نہ پایا۔ ایک خیال آتا ایک جاتا۔ جس نے میری زندگی برباد کر ڈالی اُسے کیوں بچاؤں ؟ میرا دل جلایا ہے تو اس کی یہ بھی سزا پائے۔

اگر بتاؤں تو اسے مار مار کر ٹھنڈا کر دیں گے۔ ممکن ہے یہ اس سوداگر کا قاتل نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ اسے پھنسانے میں مجھے کیا فائدہ ؟

گورنر نے پھر پوچھا تو آکسیونوف نے جواب دیا۔ میں بتا نہیں سکتا۔ خدا کی مرضی نہیں کہ میں بتاؤں آپ کو اختیار ہے جو چاہیں میرے حق میں کریں۔ گورنر نے بہتیرے جتن کئے پر آکسیونوف نہ مانا کہ نہ مانا۔

اسی رات آکسیونوف کی آنکھ لگی ہی تھی کہ کوئی شخص چپکے چپکے آیا اور اس کے بستر پر بیٹھ گیا اندھیرا تھا۔ آکسیونوف نے غور سے دیکھا تو سیموئچ کو پہچان لیا۔

آکسیونوف:۔ اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو ؟ سیموئچ کچھ نہ بولا۔ اس پر آکسیونوف نے اُٹھ کر کہا:۔

"تم کیا چاہتے ہو ؟ جاتے ہو یا سنتری کو بلاؤں"۔

دکوہ قاف پہ لمن کښې د بالو ښهر یو منظر۔ باکو د قفقاز (کاکیشیا) پہ علاقہ کښې د تیلو او فولادو اهم ترین مرکز گڼلے شی۔

کوہ قاف کے دامن میں شہر باکو کا ایک منظر۔ باکو علاقہ قفقاز میں تیل اور فولاد کا ایک اہم ترین مرکز گنا جاتا ہے۔

سیموئیخ نے جھک کر اس کے کان میں کہا:۔
"آکسیونوف مجھے معاف کر دو"
آکسیونوف:۔ معافی کیسی؟
سیموئیخ:۔ جس نے اس سوداگر کو قتل کیا اور چاقو تمہارے اسباب میں چھپایا وُہ میں ہی تھا۔ میں تو تمہیں بھی ٹھنڈا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس وقت باہر کچھ شور سنکر میں چاقو تمہارے تھیلہ میں رکھکر کھڑکی سے باہر نکل گیا تھا۔
آکسیونوف چپ سنتا رہا۔ سوچتا تھا کیا کہے۔ اتنے میں سیموئیخ بستر سے اُتر زمین پر گھٹنے ٹیک کر آکسیونوف سے کہنے لگا:۔
"مجھے معاف کر دو۔ خدا کے لئے مجھے معاف کر دو۔ میں خود اقبال جرم کروں گا تاکہ تم یہاں سے رہا ہو کر اپنے بال بچوں میں جا رہو۔
آکسیونوف نے جواب دیا:۔ باتیں کرنا آسان ہے۔ تمہاری وجہ سے چھبیس برس میں نے دُکھ ہی دکھ دیکھا۔ اب میں کہاں جاؤں؟ میری بیوی مر چکی ہے میرے لڑکے مجھے بھول چکے ہیں۔ میں کہیں جا نہیں سکتا۔
سیموئیخ زمین پر اپنا سر پٹخ پٹخ کر کہتا تھا:۔
آکسیونوف مجھے بخش دو۔ جب مجھے کوڑے لگ رہے تھے اس وقت مجھے اتنا دکھ نہیں پہنچا جتنا تمہیں دیکھکر مجھے اب ہو رہا ہے۔ تم نے مجھ پر ترس کھایا اور وُہ راز چھپائے رکھا۔ خدا کے لئے مجھ بدبخت کو معاف کر دو۔
یہ کہا اور لگا رونے۔ آکسیونوف اُسے روتے دیکھکر خود بھی رونے لگا۔ اس نے کہا:۔
خدا تمہیں بخشے۔ ممکن ہے میں تم سے سوگنا زیادہ گنہگار ہوں۔
ان الفاظ نے آکسیونوف کے دل میں تسکین پیدا کر دی اور گھر لوٹنے کی خواہش بھی جاتی رہی۔ اور یہی تمنا رہ گئی کہ اسی زندان میں رہے اور یہیں اس کا دم نکلے۔
لیکن سیموئیخ نہ ٹلا۔ اُس نے اقبال جُرم کر ہی ڈالا۔ جب آکسیونوف کی رہائی کا حکم پہنچا وُہ چل بسا تھا۔
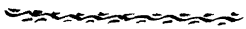
رباعی

تصویر ہوں درس تماشی کا لٹیا ہوں
بیچارہ ہوں چپ ہوں بے بس ہوں کسی کا لٹیا ہوں
ہے عمر زندگی پیمانہ سرشار لا
جو سکھ میں بھی کھوئے کوئی ہی لٹیا ہوں

(اثر صہبائی)

قفقاز

(۵)

قفقاز یا کاکیشیا بحیرۂ خزر اور بحیرۂ اسود کے درمیان ایک بڑا پہاڑی علاقہ ہے۔ اس علاقہ کی اہمیت تاریخی۔ جغرافیائی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے مسلمہ رہی ہے لیکن آجکل اس کا چرچا بہت زیادہ ہے کیونکہ جرمنی اس پر چڑھائی کیا چاہتا ہے۔ اس سے اس کی بین الملی اہمیت کہیں زیادہ ہوگئی ہے۔

اس علاقہ کے بارے میں عوام کے عجیب عجیب خیالات ہیں۔ بعض اسے نرے پہاڑوں کا سلسلہ سمجھتے ہیں بعض اسے تیل کا بے تھاہ مخزن تصور کرتے ہیں اور بعض اسے ارمنی عیسائیوں کا مسکن خیال کرتے ہیں بعض صحاب اب بھی ہیں جو اسے دیووں اور پریوں کی پُر راز بستی سمجھتے ہیں۔ ایسے دلچسپ علاقے کے بارے میں ہم اپنی معلومات نہایت اختصار کے ساتھ نذر قارئین کرتے ہیں۔

قفقاز کا کل رقبہ تقریباً دولاکھ آٹھ ہزار مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی چوراسی لاکھ کے لگ بھگ ہے اس آبادی میں سے چودہ لاکھ تو شہروں میں رہتے ہیں اور باقی سب دیہات میں۔ یہاں کے مرد بہت کڑیل اور عورتیں بہت حسین ہیں۔ اسی لئے شاید پُرانے افسانوں میں انہیں دیو اور پریاں بتایا گیا ہے۔

یہ پہاڑی علاقہ نوسومیل لمبا اور بیس میل سے لیکر ایک سو چالیس میل تک چوڑا ہے۔ اس میں بہت سی چوٹیاں ایسی ہیں جو آسمان سے ٹکراتی ہیں۔ سب سے اُونچا پہاڑ کوہ البرز کہلاتا ہے۔ یہ ۱۸۴۶۸ فٹ بلند ہے۔ ان پہاڑوں کے دامن گھنے جنگلوں سے بھرے ہُوئے ہیں۔ اُن جنگلوں میں بڑ۔ صنوبر وغیرہ پائے جاتے ہیں

قفقاز میں بہت سی قومیں آباد ہیں ان میں سب سے زیادہ قابل ذکر روسی۔ یونانی۔ ارمنی۔ گرجی۔ ترک۔ تاتار ایرانی۔ یہودی اور جرمن ہیں۔ اختلاف قومیت کے باوجود کاروباری اتحاد نمایاں طور سے پایا جاتا ہے۔ صنعت ترقی پر ہے لیکن اکثر لوگ زراعت پیشہ ہیں کیونکہ زمین زرخیز ہے اور بحیرۂ اسود اور بحیرۂ خزر کے پاس ہونے کی وجہ سے بارش بھی کافی ہوجاتی ہے شمالی حصہ میں گھوڑے "مرینو" بھیڑیں اور یوکرائنی مویشی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ مرینو بھیڑ کی بہت قدر ہے کیونکہ اس سے نہایت نفیس اُون بنتا ہے۔ ایسی بھیڑوں کی تعداد چار لاکھ سے زیادہ ہی ہوگی۔ معدنیات بھی بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ اس میں چاندی۔ تانبا۔ سکہ کوئلہ۔ لوہا اور تیل زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔

کوہ قاف میں کئی بڑے بڑے درّے ہیں جنہیں

سے آمد ورفت رہتی ہے۔ سب سے مشہور درّے دریال اور بیمبین کہلاتے ہیں۔ شہر دربند کے پاس ایک اور درہ ہے جو سطح سمندر سے سات ہزار فٹ اونچا ہے ان پہاڑوں اور دروں میں قدرت کے بہترین منظر دکھائی دیتے ہیں

فوجی نقطۂ نگاہ سے ان درّوں کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے۔ انہیں دروں سے شمالی اقوام نے جنوبی ایشیا پر حملہ کیا۔ سائرس اعظم نے بھی انہی دروں سے اپنی سپاہ گذاری اور ان ہی راستوں سے رومیوں نے ساسانیوں پر یورش کی۔ انہی واقعات کی رُو سے مورخین ان دروں کو جنوبی ایشیا کے قطبی دروازے کہتے ہیں۔ میلادِ مسیح سے چار سو سال پہلے شمالی حملہ آوروں کی روک تھام کے لئے کوہ قاف کے جنوب کی طرف ایک مضبوط دیوار بنائی گئی تھی جسمیں بجائے اینٹ اور گارے کے لوہا اور پگھلا ہوا تانبا استعمال کیا گیا تھا۔ یہ دیوار شہر دربند کے پاس سے جاتی تھی۔ کیونکہ اس کا ایک دروازہ وہاں ابتک پایا جاتا ہے عرب جغرافیہ دان اور مورخ از قسم المقدسی۔ البیرونی والہمدانی نے لکھا ہے کہ شہر دربند سلطنتِ ایران کے لئے بہت سیاسی اور فوجی اہمیت رکھتا تھا۔ یہ شہر ۸۰۰ھ میں عربوں کے قبضہ میں آیا تو انہوں نے اس کا نام باب الاجواب رکھا۔

یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ یہ دیوار کس نے بنوائی بعض مؤرخین کہتے ہیں کہ نوشیروان کے عہد میں بنی یہ صحیح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایک یونانی مؤرخ جو سفس جو نوشیروان سے پہلے گذرا ہے اسی دیوار کا ذکر کرتا ہے۔ اغلب یہ ہے کہ یہ دیوار سکندر اعظم سے بھی صدیوں پہلے موجود تھی۔ بڑی تحقیق کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد نے نے یہ رائے قائم کی کہ ۵۲۱ سنہ (قبل از مسیح) میں سائرس اعظم نے یہ دیوار بنوائی اور شاید نوشیروان نے اس کی مرمت اور توسیع کی۔

۱۹۰۴ء میں ولیم جیکس نے اپنے سفرنامہ میں اس دیوار کو بہت خستہ حالت میں ظاہر کیا ہے جس کی تائید مولانا ابو الکلام آزاد بھی کرتے ہیں۔

قدیم یونانی کاکیشیا کو معمّا ہی سمجھتے رہے۔ پہلی عیسوی صدی میں یہ علاقہ روم کے قبضہ میں آیا اور عرصہ تک رہا۔ چھٹی صدی میں قوم ہن نے اور تیرہویں صدی میں مغلوں نے اس پر یورش کی سب سے سنگین حملے روسیوں نے کئے جو پطرس اعظم کے عہد میں شروع ہوئے۔ اس خطہ کے لئے روسیوں۔ ترکوں اور ایرانیوں میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ آخرکار ۱۸۶۴ء میں یہ سارا علاقہ روسیوں کے حوالہ کردیا گیا۔

۱۹۱۷ء میں قفقاز کے باشندوں نے مکمل آزادی حاصل کرنے کے لئے سعی لاحاصل کی۔ ۱۹۲۱ء میں روس کی بالشویکی حکومت کا قبضہ ہوگیا۔ اور جارجیا۔ آرمینیا اور آذربائیجان کی تین

جمہوریتیں قایم ہو کر جمہوریت سوویٹ روس سے اُن کا الحاق ہو گیا۔ اس وقت سے قفقاز کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے اور تب سے قفقاز نے صنعت و حرفت میں نمایاں ترقی کی ہے۔

قفقاز کے بارہ میں کوئی مقالہ صحیح اور مکمل سمجھا نہیں جاسکتا جب تک اس میں وہاں کے تیل کا ذکر نہ ہو تیل کے چشمے زیادہ تر شہر باکو کے آس پاس پائے جاتے ہیں۔ وہاں تیل صاف کرنے کے بڑے بڑے کارخانے بنائے گئے ہیں۔ جب بالشویک باکو پہنچے تو انہوں نے تیل کے تمام چشموں اور کارخانوں کو تباہ پایا۔ لیکن فوراً باریناف نامی ایک بالشویک اور اُسکے چند پر جوش رفقا کے دماغ میں یہ سمائی کہ باکو کے تیل کی پیداوار دنیا میں سب سے زیادہ ہونی چاہیئے۔ انکی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۶ء میں باکو کے چشموں سے تیل کا نکاس ڈیڑھ لاکھ ٹن تھا اور اب ساڑھے بائیس لاکھ ٹن ہے (ایک ٹن ۲۸ من کے برابر ہوتا ہے) چشموں کے آس پاس جدید طرز کے کارخانے بن گئے ہیں جن میں تیل صاف کیا جاتا ہے

یہاں کے مزدور پہلے بھوکے مرتے تھے اب خوشحال ہیں پہلے ایک مزدور بارہ گھنٹے کام کر کے ۲۵ روبل ماہوار کماتا تھا۔ اب صرف سات گھنٹے روزانہ کام کرتا ہے اور مہینے میں ۵۰۰ روبل تک کما لیتا ہے۔ مزدوروں کی رہائش کیلئے مخصوص اور خوشنما مکان بنائے گئے ہیں جن میں گیس کی روشنی استعمال کی جاتی ہے۔

بالشویکی لیڈروں نے بجلی کی طرف بھی توجہ کی اور قفقاز کے تیز رو دریاؤں سے بجلی لینے کی ٹھانی سب سے پہلے یہاں کی سیون جھیل کی آبشاروں سے بجلی حاصل کرنے کیلیئے نو زبردست کارخانے بنائے۔ اسی بجلی سے قفقاز کے تمام صنعتی اور فوجی کارخانے چلتے ہیں اور تقریباً دو لاکھ ایکٹر زمین سیراب ہوتی ہے نئے کارخانے ہوں۔ شفاخانے ہوں۔ سینما ہوں۔ نہانے کے تالاب ہوں۔ مزدوروں کے مکان ہوں سب کے بنانے اور قایم رکھنے میں اسی بجلی کا اہم حصّہ ہے

زار روس نے اس خطہ کی اقتصادی حالت سدھارنے کی طرف کوئی توجہ نہیں کی تھی لیکن بالشویکوں نے اہالی قفقاز کو آزاد اور خود مختار کر دیا۔ افغانوں کی طرح قفقازی بھی آزادی کے دلدادہ ہیں۔ ادھر آزاد ہوئے ادھر بالشویکوں کے دوست بنے۔ جبھی سے اپنے وطن کی اقتصادی بالخصوص صنعتی قوت کو بڑھانے میں ہمہ تن سرگرم رہے ہیں اور اب محوریوں سے نبٹنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں:

آج اور کل

— اقبالؔ

وہ کل کے غم و عیش پہ کچھ حق نہیں رکھتا
جو آج خود افروز و جگر سوز نہیں ہے
وہ قوم نہیں لائق ہنگامہ فردا
جس قوم کی تقدیر میں امروز نہیں ہے

د رُوسي فوځ ديو ے حفاظتي دستے شاه خلمي پخپله چليد ذکي (آټو ميټک) ټوپکو نو ذکړه کوي .
نن ورځ د رُوس هر يو اوسيدونکے دخپل وطن او دخپلے آزادۍ په خاطر د دښمن مقابلے ته ځان تيار رُوي .

روسی دفاعی دستوں کے چند جوان "آٹو میٹک" رائفلوں سے مشق کررہے ہیں۔
آج کل ہر ایک رُوسی اپنی آزادی کو دشمن سے بچانے کے لئے تیار ہورہا ہے ۔

پشتو شاعری

اور

افغانوں کا اخلاقی فلسفہ

(۱)

اس مقالہ میں پشتو شاعری سے افغانوں کے اخلاقی فلسفہ کا اندازہ لگانا مقصود ہے ۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہے (اور بادی النظر میں بھی درست ہے) کہ اگر یہی مقصود ہے تو دائرہ تحقیق کو نظم تک ہی کیوں محدود کیا جائے اور ادب کے دوسرے اہم عنصر یعنی نثر کو اس دائرہ میں شامل کیوں نہ کیا جائے ۔ اگر ذرا بنظر غائر دیکھا جائے تو یہی عنوان صحیح دکھائی دے گا ۔ کیونکہ پشتو ادب ابھی تک "نظم" ہی تک محدود ہے اور پشتو نثر ہو بھی تو ابتدائی حالت میں ہے اور ابھی اسے کوئی ادبی حیثیت حاصل نہیں ہوئی ہے ۔

یہ کوئی اچنبھا نہیں ۔ پشتو زبان ابھی ابتدائی حالت میں ہے ۔ تاریخ السنہ بتاتی ہے کہ ہر زبان کی شعر سے ابتدا ہوئی ۔ ابتدائی خیالات اور جذبات شعر ہی میں اظہار ہوتے رہے ۔ جوں جوں ان میں وسعت پیدا ہوتی گئی نثر بھی بنتی گئی ۔ ملتِ افاغنہ کی تہذیب ابھی ابتدائی مراحل میں سے گذر رہی ہے اس لیئے اُن کی شاعری ہی اُن کے بہترین جذبات اور خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے ۔ اُن کے اخلاقیات کا سُراغ بھی ان کی شاعری ہی سے مل سکتا ہے ۔

اس عنوان میں تین الفاظ تشریح طلب ہیں :۔ شاعری ۔ اخلاق اور فلسفہ ۔

شاعری ایک فن لطیفہ ہے ۔ فن کیا ہے ؟ انسانی جذبات اور خیالات کا پسندیدہ طریقہ سے اظہار کرنے ہی کو فن کہتے ہیں ۔ اس اظہار کے طریقے جدا جدا ہیں ۔ آواز کے موزون زیر و بم سے راگ پیدا ہوتا ہے ۔ خاص موزونیت سے ہاتھ پاؤں وغیرہ ہلانے ہی کو ناچ کہتے ہیں ۔ اسی طرح الفاظ کی ایک خاص موزون ترکیب سے شعر بنتا ہے ۔

اخلاق کا تعلق عمل سے ہے ۔ یعنی وہ عمل جو ایک ذی شعور شخص سے بالارادہ ظہور میں آئے ۔ اگر ایک شخص کسی خاص نیت یا ارادہ کے بغیر پتھر ہوا میں پھینک دیتا ہے اور وہ پتھر کسی بچے کے لگے اور اُسے گھائل

کر ڈالے تو یہ فعل گناہ نہیں کہلائے گا۔ اگر وہی پتھر کسی سانپ یا بچھو پر آن گرے اور وہ مرجائے تو اس فعل کو فعل نیک نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں نیت یا ارادہ کو کوئی دخل نہیں تھا۔

پس اخلاق نیکی اور بدی پر حاوی ہے اور نیکی اور بدی کا انحصار نیت یا ارادہ پر ہے۔

اب رہا فلسفہ۔ تمام کائنات کی حقیقت معلوم کرنے کو فلسفہ کہتے ہیں۔ اس علم کے لئے اس قسم کے استفسار کا ہونا ضروری ہے:۔ میں کیا ہوں؟ دنیا کیا ہے؟ میں کہاں سے آیا اور کہاں جارہا ہوں؟ مادہ کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟ دنیا میں کوئی ہمہ گیر نظام ہے یا سراسر بے ترتیبی ہے۔ بشر کا کیا کام ہے اور وہ کیسے سرانجام پاسکتا ہے۔ ایسے استفسار اور تحقیق کی غرض یہ ہے کہ غور و مطالعہ کے بعد اس ساری موجودات میں کوئی خاص ترتیب یا نسبت کا پتا چلائے

ان مسائل کا صحیح حل نکالنا نہایت ضروری ہے کیونکہ یہ سوالات کم و بیش ہر ذی شعور انسان کے دماغ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ اپنی استعداد کے مطابق خود ان کا حل سوچتا رہتا ہے۔

"فلسفۂ اخلاق" وہ اصول قایم کرتا ہے جن کی رو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ فلاں فعل اچھا ہے یا برا۔ ان اصولوں کے وضع کرنے میں دنیا کے فیلسوف ہزار ہا سال سے مصروف رہے ہیں اب تک بھی کوئی متفقہ بنیادی معیار وضع نہ ہو سکا۔

بعض کہتے ہیں کہ کسی فعل کی کسوٹی اس کا نتیجہ ہونی چاہیئے۔ یعنی اگر کسی فعل کا نتیجہ اچھا وہ فعل بھی اچھا اگر اس کا نتیجہ برا وہ فعل بھی برا۔

بعضے یہ کہتے ہیں کہ جس فعل سے نوع بشر کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو زیادہ زیادہ خوشی حاصل ہو وہی فعل اچھا ہے۔ بعضے خدائے تعالیٰ کی خوشنودی کو نیکی اور بدی کا معیار قرار دیتے ہیں۔ اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ان تمام مسائل کی غرض و غایت ایک ہے یعنی بشر کی خوشی خواہ بالواسطہ ہو خواہ بلاواسطہ۔

رہا یہ سوال کہ آیا خوشی اور اخلاق حقیقت میں ایک ہی شے کے دو نام ہیں! یعنی خوشی ہی میں نیکی ہے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے کیونکہ خوشی اور نیکی دو علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں۔ ان کی بنیادیں بھی جدا جدا ہیں۔ خوشی کا واسطہ بشری جذبات سے ہے اور اخلاق کا واسطہ عقل و شعور سے ہے۔

انسان کی سرشت میں دو متضاد خاصیتیں موجود ہیں۔ ایک خاصیت تو حیوانیت یا بہیمیت ہے۔ جو دیگر حیوانات میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔

دوسری خاصیت انسانیت اور عقل و شعور ہے۔ یہ خاصیت صرف انسان ہی تک محدود ہے اور دیگر حیوانات میں پائی نہیں جاتی بلکہ

انسان کو حیوان سے علیحدہ اور برتر بناتی ہے پہلی خاصیت انسان کو ادنےٰ کاموں کی طرف مائل کرتی ہے۔ اور دوسری خاصیت انسان کو پاکیزہ بلند پایہ کاموں کی طرف ابھارتی ہے۔

انسان دونو خاصیتوں کی اطاعت کرتا ہے کبھی ایک خاصیت غالب رہتی ہے کبھی دوسری لیکن زیادہ تر بہیمیت کا حکم چلتا ہے۔ کیونکہ یہ خاصیت انسان کی خلقت ہی میں کمال کے درجہ تک پہنچ چکی ہوتی ہے اور برعکس اس کے دوسری خاصیت نامکمل ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہنچنے کی کوشش کرتی ہے یہی وجہ ہے کہ حیوانی خواہشات اور جسمانی جذبات کی تسکین میں ایک خاص لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور انسان اس خاصیت کی طرف زیادہ مائل رہتا ہے۔ برعکس اس کے وہ کام جن میں عقل وشعور یا رُوحانیت زیادہ غالب ہو وہ جسمانی لذت نہیں رکھتے۔ بُرے کاموں میں مزہ آتا ہے اسلیئے بُرے کام انسان کو اپنی طرف زیادہ کھینچتے ہیں۔

اس کے علاوہ نیک یا رُوحانی کاموں میں انسان ایک بوجھ سا محسُوس کرتا ہے اور حیوانی افعال میں آسانی اور سہولت رہتی ہے۔

اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے۔ ہماری عقلی اور رُوحانی فطرت ہماری حیوانی اور جسمانی فطرت سے بہت بلند ہے۔

دُوسرے الفاظ میں ہمیں چاہیئے کہ نیک کاموں کو بُرے کاموں پر ترجیح دیں۔ اور اپنے آپ کو حیوانی درجہ سے نکال کر انسانی زمرہ میں شامل ہو جائیں۔ بس اسی کا نام اخلاق ہے۔ یعنی یہ معلوُم کرکے کہ ہمارا کیا حق ہے ہمارا کیا فرض ہے اس کے مطابق مناسب عمل کرنا اخلاق ہے۔

انسان کے اخلاق کا تعلّق 'فرض' اور 'مستحب' سے ہے۔ لیکن انسانی خوشی یا راحت کا تعلّق 'فرض' اور 'مستحب' سے نہیں ہے۔

چونکہ بشری فطرت حیوانی فطرت سے بلند و بالاتر ہے اور بشری فطرت نے پورا کمال حاصل نہیں کیا اس لیے ہمیں چاہیئے کہ بشری خصُوصیّت کو ترقی دینے کے لئے کوشش کریں اور اس کے ضبط اور اقتدار کو اپنے لئے مفید تسلیم کریں۔

انسانی فطرت کی شان اس بات کی مقتضی ہے کہ اسے حیوانی فطرت پر ترجیح دی جائے اور حیوانی فطرت میں جو آرام اور آسانی کے پہلو ہیں انہیں نظر انداز کردیں۔

یہ کہنا کہ انسان کے لئے خوشی ضروری ہے اور اس کی زندگی کی غرض وغایت ہے ایک

فضول اور بے معنی بات ہے۔

خوشی تو انسان بغیر کسی دُوسرے کے ایماء سے خود بخود تلاش کرتا ہے اور حاصل کر لیتا ہے۔ اور جو چیز انسان اپنے لئے اپنی مرضی سے حاصل کرنا چاہے اس کو اپنے لئے "فرض" اور" لازم" قرار دینا ضروری نہیں ہے۔

پس ثابت ہُوا کہ خوشی اور اخلاق کا آپس میں کوئی رشتہ نہیں بلکہ یہ ایک دُوسرے سے سوا ہیں۔ خوشی اور اخلاق کو مترادف اور ہم معنی سمجھنا حماقت ہے۔

اگر بفرض محال خوشی اور اخلاق کو ایک مان لیا جائے تو نیکی اور بدی میں کوئی امتیاز نہ رہیگا کیونکہ کام وہی اچھا سمجھا جائے گا جس میں راحت ہو اور جس سے خوشی حاصل ہو۔ زکوٰۃ دینا اسلیئے اچھا سمجھا جائے کہ زکوٰۃ دینے والے کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ تو برا کام بھی اچھا ہے اگر اس برے کام سے خوشی یا راحت میسّر ہوتی ہو اس طرح سے زکوٰۃ اور سرقہ کا ایک ہی پایہ ہو گیا کیونکہ زکوٰۃ دینے والے کو بھی خوشی ہوتی ہے اور چور کو بھی خوشی ہوتی ہے اور دونو اپنی خوشی سے اپنے اپنے کام کرتے ہیں اور دونو کو راحت ہوتی ہے اگر اس استدلال کو مان لیا جائے تو نیک و بد میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

——— (ترجمہ از خیبر میگزین)

ظرائف

ایک خواندہ شخص مقطّع صُورت ریلوے اسٹیشن پر جا کر پُوچھنے لگا۔ کہ سات گھنٹے پینتالیس منٹ کی ریل کس وقت روانہ ہو گی۔ سٹیشن ماسٹر نے مسکرا کر جواب دیا "پُونے آٹھ بجے" تب یہ شخص چین بجبیں ہو کر کہنے لگا۔" واہ صاحب واہ۔ یہاں کا عجب دستور ہے کہ روز بدلتا ہے۔ ابھی تو ریل سات گھنٹے پینتالیس منٹ پر جاتی تھی اور ابھی پونے آٹھ بجے جانے لگی۔

———

ایک پادری صاحب مجمع عام میں وعظ سُنا رہے تھے مگر وہ لوگ دل لگا کر نہیں سنتے تھے اور پادری صاحب ہر فقرے پر فرماتے تھے "بھائیو یہ میرے نصائح سنو" جب شام کو پادری صاحب اپنے گھر آئے تو ایک مس صاحبہ نے کہا کہ آج تو آپ کا وعظ سننے کو آدمی بکثرت جمع تھے۔ پادری صاحب نے برہم ہو کر فرمایا "ایک بھی آدمی نہ تھا سب گدھے تھے"۔ مس صاحبہ نے ہنس کر ظرافتاً کہا کہ "جب ہی آپ بھائیو بھائیو کر کے ان کو مخاطب کرتے تھے"۔

پندرہ روزہ رسالہ اُردو

چندہ سالانہ
پنن پرو

سال دوم | ۱۰ اگست سنہ ۱۹۴۲ء | فہرست | ۲۶ رجب المرجب ۱۳۶۱ھ | نمبر (۷)

:۔ خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے :۔

ایڈیٹر ـــ نن پرون (اُردو ایڈیشن) راجپور روڈ۔ دہلی

برسات کی شفق

یہ شفق ہے؟ یا فرازِ چرخ پر عکسِ چمن
یا تصور میں کسی گل پیرہن کا بانکپن
یا غریبِ خستہ جاں کے قلب میں، یادِ وطن

یہ شفق ہے، عارضِ جاناں پہ یا موجِ شباب
خواب گاہِ خسروِ خاور کا یا زریں حجاب
روحِ انسانی کا یا بھولا ہوا جنّت کا خواب

یہ سنہری دھاریاں نیلم کے یہ نقش و نگار
یہ زمرد کی چٹانیں، یہ طلائی آبشار
دیدنی ہے منتہائے صنعتِ پروردگار

آہ اِن جلووں سے، دل کے زخم دیتے ہیں لہو
قلب میں انگڑائی لیتی ہے کسی کی آرزو
روح کے پردوں میں جل اٹھتی ہے شمعِ آرزو

اِن مناظر میں اُبلتی ہے ندی جذبات کی
تیز ہو جاتی ہے دل میں، آنچ محسوسات کی
خون کے آنسو رُلاتی ہے شفق برسات کی

مل رہا ہے سُرخیوں میں ایک ہلکا سا دُھواں
جھک رہا ہے رفتہ رفتہ آفتابِ زر فشاں
پستیوں میں سر بسجدہ ہے غرورِ آسماں

یاد آتی ہے کسی کی کم نگاہی، کیا کروں
چھائی جاتی ہے ہر اِک شے پر سیاہی کیا کروں
یہ مناظر کھائے جاتے ہیں، الٰہی کیا کروں

(جوش)

عجب نہیں کہ بدل دے اسے نگاہ تری (*) بلا رہی ہے تجھے ممکنات کی دنیا
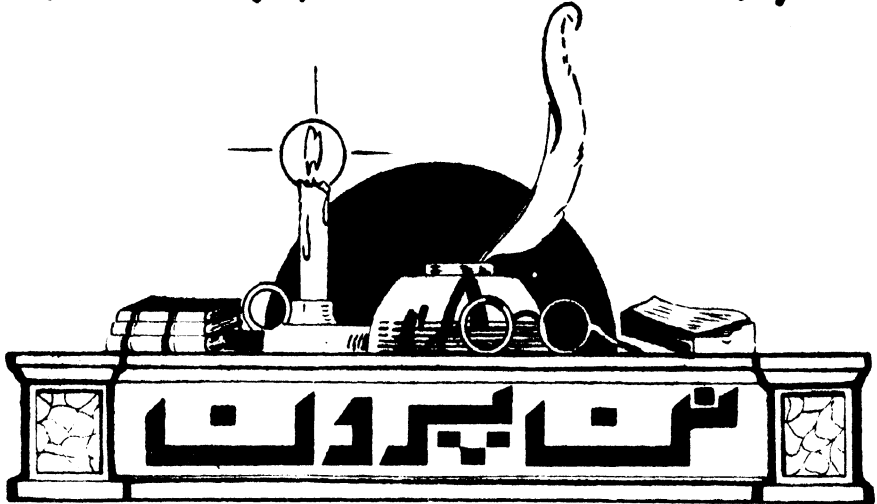
پشتو زبان کے معیار کا انتخاب

قندھاریوں، یوسف زیوں اور خٹکوں کے دعوے

"نن پرون" مورخہ ۲۵ر جون ۱۹۴۲ء میں تمام افغان علماء۔ ادباء اور دیگر اہل قلم حضرات کو مخاطب کرتے ہوئے میں نے پشتو رسم الخط کی اصلاح اور توسیع کے مسئلہ پر اپنے ناچیز خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اور یہ گذارش بھی کی تھی۔ کہ ہماری قومی زندگی کی بقاء اور ارتقا کے لئے جہاں اور بہت سے اہم مسائل تصفیہ طلب ہیں وہاں ایک اہم اور توجہ طلب مسئلہ پشتو زبان کا مسئلہ بھی ہے۔ یعنی پشتو کو آسان۔ دیدہ زیب بلکہ جامع بنانے کے لئے ازبس ضروری ہے کہ ساری قوم متفق الرائے اور متحد العمل ہو جائے۔ مضمون کے آخر میں میں نے درد بھرے مگر زور دار الفاظ میں اپیل کی تھی کہ اگر کسی کم علم اور ناسمجھ شخص کا نظریہ پسند نہ آئے

توجنہیں مادری زبان سے ذوق اور محبت ہوا نہیں چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ بلاوجہ اس شخص کو برا بھلا کہنے لگیں اس کے نظریہ کو غلط ثابت کریں یا اس میں اصلاح اور ترمیم کریں۔ تاکہ وہ نہ صرف عیب جوئی کے برے فعل سے بچیں بلکہ اپنی بلند فکری اور اجتہاد سے ایک گمراہ کی ہدایت کا باعث بنیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اپنی قدیم زبان کو کس مپرسی کی حالت سے نکالکر اور اسمیں نئی جان پھونک کر اسے شاہراہ ترقی پر ڈالنے میں مدد دے سکیں۔

خداوند کریم کا ہزار ہزار شکر ہے کہ تمام افغان علماء۔ ادباء اور بہی خواہان قوم نے میری معروضات کا قابل تحسین متانت اور سنجیدگی کیساتھ خیر مقدم کیا۔

اے کاش اگر ہم تمام موصول خطوط اور مضامین کو اکٹھا کرکے شایع کرسکتے تاکہ قارئین کرام پر ثابت ہوجاتا کہ جہاں افغان قوم میں عشق و غیرت ملی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہے وہاں یہ قوم استدلال اور معقولیت کی نعمت سے بھی مالامال ہے۔ افغان کی غیرت یا جوانمردی بارہا پرکھی جاچکی ہے اس کی علم دوستی کی آزمایش باقی ہے۔ وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر اس قوم کی دلی اور دماغی طاقت سارے اہم اور مفید ملی مسائل کیطرف مبذول ہوجائے تو دنیا ششدر رہجائیگی

رسم الخط کے متعلق سردست میں کچھ کہنا نہیں چاہتا کیونکہ اور کئی مضامین کی توقع ہے۔ ابھی تو انجمن پشتو افغانستان کے فاضل حضرات نے ہمیں اپنے زرین خیالات سے مستفیض نہیں کیا ہے نہ معلوم یہ بحث کتنا طول پکڑ جائے اور کب اس کا قطعی فیصلہ ہو۔ اغلب ہے کہ بزرگان قوم اور دردمندان ملت اس مسئلہ کے تصفیہ کیلئے تمام قبایل کا ایک مشترکہ جرگہ قندہار، کابل پشاور یا کسی اور مقام پر بلوائیں لیکن ایسے جرگہ کا منعقد ہونا رفتار زمانہ اور واقعات حاضرہ پر منحصر ہے۔

مگر ایک اور مسئلہ بھی ہے جو رسم الخط سے کم اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ادبی زبان کیلئے کونسا واحد معیار قایم کیا جائے۔ میری ناچیز رائے میں اس مسئلہ کا حل آگے چل کر قوم افغان کی دلی اور دماغی ارتقاء کا باعث ہوگا۔ لکھے ہوئے الفاظ کا شکل میں یکساں لیکن معنوی یگانگت اور اشتراک سے عاری ہونا کم مفید ہی نہیں بلکہ بیسود ہے۔ ظاہر ہے کہ لکھے ہوئے الفاظ سرحت اور ہر قبیلہ کے لوگوں کو ہمشکل تو دکھائی دینگے لیکن معنوی لحاظ سے قبائلی اصطلاح میں بعض کا مفہوم ایک ہوگا بعض قبیلوں میں معمولی سا اختلاف ہوگا۔ اور بعض میں ایکدوسرے کے متضاد ہوں گے اور ممکن ہے بعض قبائل اس تحریر کو تسلیم ہی نہ کریں۔ ایسے حالات میں قوم کی آئندہ زندگی میں تصورات اور جذبات کا یکساں ہونا بہت مشکل ہے اور اتحاد عمل بھی ناممکن ہے۔ اسلیئے ہمیں رہ رہ کے یہ خیال دامنگیر رہتا ہے کہ ہم جو بھی نئی زندگی اور نیا جذبۂ محبت قومی آئندہ نسلوں کیلئے بطور میراث چھوڑیں اور اس میراث کی وضع قطع ایسی ہو کہ سب اپنا اپنا حق پائیں اور یکساں طور پر مطمئن اور خوش ہوجائیں۔ قومی ادب کی ارتقاء کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ قوم کے بلند پایۂ علماء و ادباء آئندہ نسلوں کیلئے اپنے زمانہ کے بہترین خیالات۔ جذبات اور تصورات کا گرانقدر ذخیرہ کتب عمارات اصول جنگ اور

مراسم شہریت کی شکل میں چھوڑ جائیں تاکہ بلا کسی امتیاز کے قوم کے تمام افراد
اس کے یکساں وارث قرار پائیں۔ اس ساری میراث میں سب سے
زیادہ دیرپا خزانہ کاغذ پر لکھے ہوئے تصورات اور جذبات کا
بیش قیمت خزانہ ہے جس سے قوم کے آیندہ ادب پر گہرا نقش
ثبت ہوجاتا ہے۔ عمارات انتقال پذیر نہیں ہیں۔ کچھ دیر کیلئے
توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں وہ بھی اُن کی جو آس پاس رہتے ہوں
یا انہیں دیکھنے کے لئے سفر کی زحمت اور زیر باری گوارا کر
سکیں۔ عمارات کے بعد مراسم شہریت یعنی رسم و رواج کا درجہ
ہے۔ یہ بھی زمانہ کیساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ البتہ ادب کی بات اور
ہے۔ سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کے فلسفوں کو لیجئے یا پیغمبروں
کی الہامی کتابوں کو لیجئے۔ ہزاروں سال سے دنیا کی مختلف
اقوام کی معنویات پر کس حد تک اثر انداز ہوئے ہو رہے ہیں
اور ہوتے رہیں گے۔

افغان علماء اور ادباء کی توجہ اس مسئلہ کیطرف اسلئے دلانا
چاہتا ہوں کہ ملتِ افغان میں ایک نئی زندگی کے آثار نظر آرہے
ہیں۔ وہ اب کروٹ لے رہی ہے۔ ہزارہا سال کے تلخ تجربوں
کے بعد اس صحیح نتیجہ پر پہنچ گئی ہے کہ تیغ اور قلم کو ہمرکاب ہونا
چاہیئے ورنہ افغان نوجوان کتنا ہی خوش قامت کیوں نہ ہو
نہ اس کے چہرہ میں دبدبہ ہوگا اور نہ اس کے لباس میں سلیقہ۔ اور
اسکا ادب حیوانی منزل پر رہیگا۔

سلطنت خداداد افغانستان ہرشکریہ کی مستحق ہے
کہ کئی سال سے پشتو زبان کی ترقی کی دھن میں لگی ہوئی ہے
آج پشتو وہاں کی دفتری زبان ہوگئی ہے۔ تصنیفات اور
تالیفات کا سلسلہ اتنا وسیع ہوگیا ہے کہ اسکی تفصیل کیلئے علیحدہ
مضمون درکار ہے۔ یوسف زئیوں کے بیدار مغز بادشاہ
حضرت میانگل صاحب بہادر والیئے صوات نے بھی پشتو
زبان کی حوصلہ افزائی کرکے قوم پروری کا ثبوت دیا ہے۔
چنانچہ آج ریاستِ صوات میں عدالتی زبان بھی پشتو ہے اور
ذریعۂ تعلیم بھی پشتو ہی ہے۔ صوبۂ سرحد میں بھی کوئی پچیس سال
سے پشتو زبان کو ترقی دینے کی مہم جاری ہے۔ کئی اخبار
اور رسائل پشتو ہی میں چل رہے ہیں۔ کئی قابل قدر تصانیف
پشتو میں ہوچکی ہیں۔ درسی کتابوں۔ کہانیوں۔ ڈراموں وغیرہ
کی تو کوئی کمی ہی نہیں۔ الغرض تمام ادباء اور شعراء اور
مفکرین اپنی مادری زبان کی توسیع اور اشاعت میں سرگرم
ہیں۔ وہ مغرب کے شیدا یعنی انگریزی تعلیم یافتہ حضرات جو
پشتو سے چڑتے تھے اور پشتو میں لکھت پڑھت انہیں دو بھر
تھی۔ اب پورے شوق اور ذوق کیساتھ اپنی مادری زبان
کی خدمت کیلئے کمربستہ نظر آرہے ہیں۔ یہ ردعمل۔ یہ ذہنی
انقلاب دیکھکر میرا دل بلیوں اچھلتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ
مشیتِ ایزدی کو ہماری قوم کی فلاح اور بہبود منظور
ہے اور یہ تبدیلی اسی کا پیش خیمہ ہے۔

اس عالمگیر بیداری سے قدرتی طور پر ملتِ افغان
میں بھی تحقیق اور تجسس کا مادہ پیدا ہوگا۔ ذہنی اصلاح
ہوگی۔ ادبی ارتقاء کے لئے بھی فضاء ساز گار بن جائیگی
ادبی میدان میں افغان مبتدی ہے لیکن یہ میدان بھی
مار لیگا۔ اور اس غرض کیلئے موزوں وسائل بہم پہنچائیگا

اوّل اوّل مشکلات کا سامنا ہوگا بعض ہتھیار بیکار ثابت ہوں
بعض کی ہیئت بدلنی پڑے بعض کو حسب ضرورت تیز کرنا پڑے
کبھی کبھار کسی ہتھیار کے غلط استعمال سے گھایل بھی ہونا پڑے
اور کام بگڑ جائے۔ بچہ بھی تو گھٹنوں کے بل چلتا ہے
اور گرتا پڑتا رہتا ہے تب کہیں چلنا سیکھ پاتا ہے۔ لکھنا
سیکھنا شروع کرتا ہے تو "الف" لکھنے میں جو دقّت
اُسے پیش آتی ہے اُسے وہی جانتا ہے۔ بار ہا گر کر سائیکل
چلانا آتا ہے۔ تمام پرزوں کو الٹین پلٹین تب کہیں
مشین کی ساخت سمجھ میں آتی ہے۔ الغرض کھانا کھانے
سے جو ایک فطری عمل ہے ہوائی جہاز چلانے تک جو
ایک فنّی ہنر ہے جو کام انسان کرنا چاہے اسکے ابتدائی مراحل
طے کرنے میں بیشمار دقتیں پیش آتی ہیں۔ اگر قوم افغان
کی نئی زندگی کو کامیاب بنانے میں بعض اوقات ہم کم سمجھی
سے کام لیں یا کوئی لغزش سرزد ہو یا کسی ایک کام کو
سرے سے بگاڑ ہی دیں تو اس سے مایوس یا ہراسان ہونا
نہ چاہیئے۔ کیونکہ ہم نو آموز ہیں۔ آج نہیں تو کل گوہر
مراد ہاتھ آجائیگا۔

ان تمام امثال سے یہ دکھانا مقصود تھا۔ کہ گو اس اہم
مسئلۂ اصلاح کے سلسلہ میں قوم اور قبائل افغان میں
اختلافات کا پیدا ہوجانا یقینی ہے۔ تاہم قوم کے مفکرین
اور خیرخواہوں کو چاہیئے کہ ہراساں نہ ہوں بلکہ قدم آگے
بڑھاتے جائیں۔

یہ کوئی چھپی ہوئی بات نہیں کہ اگر افغان قوم میں
اتنے قبیلے اور گروہ نہ ہوتے اور اُن کے باہمی تعلقات خوشگوار
ہوتے تو یہ مقصد کبھی کا ہاتھ آگیا ہوتا۔ دنیا میں کوئی اور
اتنی بڑی قوم نہ ہوگی جس میں اتنے قبائلی اور لسانی اختلافات
موجود ہوں۔ انہیں خیالات کی وجہ سے افغان قوم ایک
قالب اور ایک جان نہیں ہوسکی۔ انشاءاللہ یہی اختلافات
اس قوم کیلئے اتفاق اور برکت کے باعث ہوں گے۔
کیونکہ افغان قوم یہ احساس کرچکی ہے کہ یہی اختلاف
اس کی ترقی میں حایل ہے۔ اور اس احساس نے اُسے
خوب بیدار کردیا ہے۔ بلاتشخیص مرض کا علاج عبث
ہے۔ یہ مرض لاعلاج نہیں بلکہ اطبا کی متفقہ رائے
ہے کہ یہ مرض ابھی تک صحیح تشخیص کا شرمندۂ احسان
نہیں ہوسکا ہے۔ یوں تو افغان قوم کا ہر قبیلہ اور ہر گروہ
لغت۔ محاورہ اور تلفظ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے
اختلاف رکھتا ہے لیکن جزئیات کو چھوڑکر ہم افغان
قوم کو اجمالی طور پر تین حصّوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ پہلے
حصّہ میں ہیں قندہار۔ وزیر۔ مسعود اور گنڈاپور۔ دوسرے
حصّہ میں یوسفزئی۔ خلیل۔ مہمند اور تیسرے حصّہ میں
قبیلۂ خٹک آتا ہے۔

یہ بات نظرانداز کرنی نہ چاہیئے کہ افغانستان کے
سیاسی حدود کے اندر تمام افغانوں کا تلفظ، محاورہ
اور لغت قندہاری ہے۔ اور خیبر سے اس طرف بسنے
والے افغان یوسفزئی لغت محاورہ اور تلفظ استعمال
کرتے ہیں۔ غزنی تک پہنچتے پہنچتے پشتو میں کئی تبدیلیاں

دَ مصر په محاذ دَ امریکائی فولادی ټانکونو یوه دسته چه دَ ضرورت په وخت میدانِ جنګ ته دَ تلو دَ پاره تیاره ولاړه ده۔

مصری محاذ پر امریکن زرہ پوش ٹینکوں کا احتیاطی دستہ جو اشارہ کا منتظر ہے۔

نمودار ہونے لگتے ہیں۔ ژ-ش اور خ میں فرق محسوس
ہونے لگتا ہے محاورہ میں بھی تمیز کی جاسکتی ہے اور
لغت میں بھی اختلاف نمایاں ہوجاتا ہے بسمت مشرقی
میں جائیے تو جلال آباد کے شنواریوں - بالائی علاقہ کے
مہمندوں ۔ ننگرہاریوں اور ملحقہ قبائل کی لغت اور وادئ
پشاور کی پشتو میں اچھی خاصی مشابہت دکھائی دیتی ہے
تیراہ کے پہاڑی قبائل مثلاً افریدی - توری - بنگش اپنی
ہی لغت۔ محاورہ اور تلفظ استعمال کرتے ہیں ممکن ہے
بعض قبائل جو قبیلۂ خٹک کے پڑوس میں رہتے سہتے ہیں
ان کی زبان خٹکوں سے کچھ مختلف ہو لیکن یہ بات وثوق
کے ساتھ کہی نہیں جاسکتی ۔ بہرکیف یہ اختلاف چلا ہی
آیا ہے ۔ اب بھی ہے اور آئیندہ بھی رہے گا۔ تاہم ان
سب میں اسلامی محبت ملی جذبہ اور قومی غیرت اتنی
مُشترک ہیں کہ تمام اصولی اور بنیادی امور میں ایک
واحد ملت کہے جاسکتے ہیں ۔ زمانہ ان کے درمیان کتنی ہی
خلیجیں حائل کرے کتنی ہی عداوتیں پیدا کردے اور اُن
کی ترقی میں کتنی ہی پریشان کن رکاوٹیں ڈالی جائیں لیکن
ملی وحدت کی برکت سے وہ ایک آواز سے بیدار ہو
سکتے ہیں ۔ قومی جذبہ اور غیرت کے نام پر کٹ مرنے کیلئے
تیار ہوسکتے ہیں ۔ اُن کا مذہبی جذبہ تو اور سب جذبوں
پر غالب ہے ۔ "پشتو ادب" کا اگر بہ غور ملاحظہ کیا جائے
تو معلوم ہوجائے گا کہ جہاں تک اس کا قومی جذبات
اور ان کے اسلوب اظہار سے تعلق ہے وہی وحدتِ ملی
کا جذبہ اس میں جلوہ فرما ہے ۔ مثلاً اُن کے ٹپے ۔ خمسے ۔ کہاوتیں
اور موسیقی کی طرزیں ہر گروہ میں تقریباً یکساں ہیں ۔
یوسف زئیوں کا "بدلہ"۔ قندھاریوں کا "لنڈہ" اور
خٹکوں کا "لوبہ" یہ سب ہر افغان کو جس نے افغان
گھر میں پرورش پائی ہو یکساں طور پر مرغوب ہیں ۔ ہماری
شعر وشاعری میں بھی بعینہ یہی کیفیت ہے کیوں نہ ہو
شعر ہر ملت کے فطری رجحانات اور بنیادی احساسات
کا آئینہ ہوتا ہے ۔ فطری حسیات عام طور پر ہر قوم کے
یکساں ہوتے ہیں ۔ لہذا افغان شاعر نے جہاں کہیں گیت
یا "ٹپہ" گایا یا "چاربیتہ" بنایا ہر جگہ کا افغان متاثر و
مسرور ہوا ۔ ان کے سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی ۔
خواہ مقامی لب ولہجہ یا سُر تال میں کسی قدر اختلاف
کیوں نہ ہو ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کے فطری احساسات
میں بنیادی اشتراک ہے ۔ خوشحال خان - عبدالرحمن غرض
سارے افغان شعرا کے کلام سے تمام افغان عام اس سے
کہ قندھاری ہوں یا خٹک یا توری یا یوسف زئی مساوی
حظ اٹھاتے ہیں ۔

نثر میں یہ خاصیت پائی نہیں جاتی ۔ فی الواقعہ پشتو میں
"نثر" کا فقدان ہے ۔ نثر میں ہماری جمع پونجی ہے ہی کیا؟
لے دے کے اخون درویزہ کا "تذکرۃ الابرار" یا "مخزن الاسرار"
یا اُنکے چند اور رسایل یا افضل خان خٹک کی تاریخ مرصع۔
اگر انہی چند مطبوعات کو ہم اپنا ادبی خزانہ سمجھ بیٹھیں
تو نری خود فریبی ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان ادبا

کے زمانہ میں پشتو نثر کی اپنی الگ کوئی حیثیت نہیں تھی۔ نثر
قوم کے دماغی اور ذہنی افکار کا ذریعہ ہے۔ جب تک کسی
قوم کا علمی معیار اتنا بلند نہ ہو کہ اپنا "ادب" اور "فلسفہ"
پیدا کر سکے نثر ہرگز کام نہیں آ سکتی۔ جذبات کے اظہار
کا بہترین ذریعہ شعر ہے۔ اگر کسی قوم میں خیالات اور
معنویات موجود نہ ہوں تو نثر پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور
ہو تو دوسری زبانوں کے خیالات اور معنویات کی محض
ترجمان ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اخون درویزہ بابا اور افضل خان
خٹک کی تحریرات بتا رہی ہیں کہ فارسی یا عربی کا ترجمہ کیا
گیا ہے۔ اور یہ قدرتی بات تھی کیونکہ اس وقت افغان
کا اپنا کوئی "ادب" نہ تھا۔ عربی اور فارسی ہی اس وقت
رائج تھیں۔ پشتو تحریران کے اثر سے بچ نہیں سکتی تھی
مثلاً افضل خان خٹک اپنی "تاریخ مرصع" میں لکھتے ہیں:

"راتلل دغوریه خیلو له قندهاره نقل کا
چه بیا یوه سبب یا دهزاره وولد میر خٹی
تنګ شول، یا د مغلو له بدئ، د قندهار
له ملک متفرقه تیت دار وانه وه، په
کابل په ننګرهار ے مقام اونیوه۔ چه
جمیعت ئے اوشه خانه کوچ پیښاور له راغله"

اخون درویزہ کی تحریر تو اور بھی نرالی ہے۔ "مخزن اسرار"
میں لکھتے ہیں:-

امام عمر نسفی هسے ویلی مبرهن دی
چه صوفیان رحق دوستان هم د زهو په پاک کردن دی
دوئی پریخے غیره مینه آشنائی ده
له خدائے موافق نهی له کتاب آراسته پاک سول په خدمتن دی

پرانی نثر کا اسلوب بیان قریباً یکسان ہے۔ اب میں عبدالحی
حبیبی صاحب کی نثر کا نمونہ پیش کرتا ہوں جو افغانستان
اور پشتو ٹولنہ کے مستند نوجوان ادیب اور ماہر ناشر ہیں
اور بلند پایہ مصنف بھی ہیں۔ اپنی کتاب "پښتانه شعرا"
میں لکھتے ہیں:-

"عوام هغه شاعران او ویونکی دی چه له قدیمی
زمانے سخه بیا تر اوسه د دی په سوچه ملی او زانو
او بحر و شعر نه ویلی دی او دغه ملی اشعار
تر اوسه په پښتو جبه کښی ژوندی وی
دغه ډله په او زانو او په ظاهری اسلوب کښی
دیخوانی ډلے تقلید کوونکی دی"

اب آپ خود اندازہ لگائیے کہ پرانی نثر اور آجکل کی قندھاری
نثر کتنی ملتی جلتی ہیں۔ میرے پاس اس وقت یوسف زئی
نثر کا مستند نمونہ موجود نہیں ورنہ آپ دیکھ لیتے کہ اس میں
اور مذکورہ بالا نثروں میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہے۔
مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ اب جو نثر لکھنے کا موقعہ
ہاتھ آیا ہے تو افغانوں کو کون سا اسلوب تحریر اختیار
کرنا چاہیئے۔ اس ضمن میں افغانستان کا دعوٰے وزن رکھتا
ہے۔ کیونکہ وطن بھی افغانوں کا ہے۔ حکومت بھی ان کی اپنی
ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ افغانستان پشتو زبان کی نشر و
اشاعت میں ہمہ تن مصروف ہے۔ قبیلہ خٹک کا دعوٰے

بھی کم وزنی نہیں۔ کیونکہ پشتو کے بڑے بڑے شاعر اسی قبیلہ میں پیدا ہوئے ہیں۔ یوسفزیئوں کا دعویٰ بھی کافی وزن رکھتا ہے کیونکہ اُن کی زبان ادبی معیار تصوّر کی جا چکی ہے چنانچہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں جتنی پشتو کتب وجُود میں آئیں وہ یوسف زئی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ یوسف زئی کہتے ہیں کہ پشتو قندہار میں پیدا ہوئی لیکن پالا اُسے یوسف زئیوں نے ہے۔ اور انہوں ہی نے اُسے ترقی کے آخری زینہ پر پہنچا دیا ہے۔

اس مسئلہ کا حل مشکل نظر آتا ہے۔ ممکن ہے خٹکوں کے حق میں ہی فیصلہ ہو کیونکہ ان کا تلفظ قندہاریوں سو ملتا ہے اور ان کا محاورہ یوسف زئیوں سے۔ تلفظ اور نحوی تراکیب کے لحاظ سے بنگش، توری، مروت اور افریدی قبائل بھی خٹکوں سے ملتے جلتے ہیں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ تمام قبائل کے مشترکہ لغت، تلفظ اور محاورہ خٹکوں کے حصّہ میں آئے ہیں اور سب قبائل کا خٹکوں کی زبان پر یکسان حق ہے۔ اور اس کو اپنی زبان سمجھیں تو حق بجانب ہوں گے۔ اب رہے یوسف زئی اور قندہاری میں خود یوسف زئی ہوں۔ قول مدعی سند نہیں۔ اسی طرح حبیبی صاحب جو قندہاری ہیں اگر قندہاری پشتو کے مدعی بنیں تو اُن کا قول بھی قابل اعتبار نہ رہا۔ آخر یہ عقدہ حل ہو تو کیسے ہو؟ یہ تو رسم الخط سے بھی زیادہ کٹھن نظر آتا ہے۔ کیونکہ رسم الخط کا تعلق محض الفاظ کی مخصوص شکل یا بناوٹ سے ہے۔ پشتو نثر کا معیار مقرر کرنا گویا اس زبان کی لغت اور تراکیب نحوی سے تعرض کرنا ہے۔

اور یہ یقیناً ناقابل برداشت ہے۔ کیونکہ ہر فریق اپنا فائدہ مدنظر رکھتا ہے۔ اگر بفرض محال کسی ایک فریق کا دعوےٰ فائق مان بھی لیا جائے تو بھی زبان میں بجائے ارتقاء اور توسیع کے تنزل شروع ہو جائیگا۔ کیونکہ ادیب ایک غیر لغت اور محاورہ کو اس آزادی سے استعمال نہیں کر سکتا جو اپنی لغت اور محاورہ میں اُسے میسّر ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ اکثر ادباء اور مفکّرین اپنے احساسات اور افکار کو خاطر خواہ طور پر موزون اور مؤثر پیرایہ میں پیش نہ کر سکیں گے۔ البتّہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایسے ادباء پیدا ہو جائیں جن کا خاص خداداد ذہن وذکا انہیں معیاری یا غیر معیاری زبان کی قید سے آزاد کر دے اور وہ اپنے انمول افکار اپنی ہی طرز میں ادا کر سکیں۔ راکھ لعل کو کیسے چھپا سکتی ہے؟

بہرکیف اس مسئلہ کا حل کچھ تو ہونا چاہیئے۔ اس بارہ میں میں تو قاصر ہوں۔ البتہ قوم کے بزرگوں علماء اور ادباء سے گذارش کرتا ہوں کہ وہ اس مسئلہ پر غور وخوض فرمائیں اور قوم کے لئے کوئی راستہ نکالیں۔ ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر تمام افغان قوم ایک عام جذبہ (مثلاً اپنی مادری زبان سے محبّت) سے متاثر ہو کر ایک دفعہ تمام کام پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں تو اغلب ہے چند روزہ خود غرضیوں کے بعد تجربہ اور تقاضائے وقت ان تمام اسلُوبی اختلافات کو مٹا دیں اور ادبی زبان ایک ہو جائے۔ انگریزی اور بعض دوسری

زبانوں پر بھی کچھہ گذر چکا ہے۔ مثلاً سکاٹ لینڈ۔ ویلز اور دیگر علاقوں میں لغت اور محاورہ کے اعتبار سے بہت کچھہ اختلاف تھا اور اب بھی ہے لیکن ادبی زبان سب کی ایک یعنی انگریزی ہے۔ ممکن ہے اسی طرح سے قندہاری اور یوسف زئی پشتو زبانوں کے آپس میں گھل مل جانے سے ایک مزہ دار معجون مرکب بن جائے۔ لیکن یہ صورت بھی بنتی نظر نہیں آتی۔ ہمارے قندہاری بھائی اپنے دعوٰی پر اتنے تلے ہوئے ہیں کہ دوسرے کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں پشتو میں تصرف کرنا صرف افغانستان کا حق ہے۔ قندہار میں اُگی۔ کوئی اور اُسے کیوں اپنائے؟ خیبر سے اِدھر کے افغان اس کا کرارا جواب دے سکتے ہیں اور ان کا معہود ذہنی اہل افغانستان سے پوشیدہ نہیں۔ عیاں را چہ بیاں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ پشتو سارے افغانوں کی زبان ہے۔ اور تمام قوم کو احاطہ کئے ہوئے ہے اگر اس احاطہ کے اندر چند قطعات مختلف نام رکھتے ہوں تو کیا مضائقہ ہے؟

تیسرا جواب یہ ہے کہ درخت کی شاخیں دُور دُور تک پھیل گئی ہیں اور اس کا بیج ہر طرف بکھر گیا ہے۔ رنگا رنگ قلمیں لگ گئی ہیں اور پھل اتنا لذیذ ہوگیا ہے کہ جڑ اپنے اس پھیلاؤ پر جتنا اترائے کم ہے۔ ایک خطرہ البتہ ہے۔ ایسا نہ ہو تو افغان قوم کی بیداری محض عارضی ثابت ہو اور پشتو زبان تشنۂ تکمیل رہ جائے۔ ہمارے قندہاری رفقاء ایک راستہ پکڑ لیں اور ہم کوئی اور۔ ان پر فرانسیسی وغیرہ کا رنگ چڑھ رہا ہو اور ہم پر انگریزی۔ اُردو اور ہندی کا۔ کہیں یہ قومی وحدت ہی کافور ہو جائے۔ جیسے ایرانی کبک کی چال چلتے چلتے اپنی ہی چال بھول گئے اور فرانسیسی الفاظ اور محاوروں سے اپنی زبان کو بدنما کر ڈالا۔ ممکن ہے ہماری پیاری زبان بھی دوسری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے بدنما اور بدمزہ ہو جائے۔ ایسی صورت میں نہ صرف ملی وحدت ہی فنا ہو جائے گی بلکہ افغان اُس کے ذریعہ سے اپنے قلبی اور ذہنی جوہر بھی دکھا نہ سکیں گے۔

اب میں اپنے تمام بزرگان قوم۔ علماء۔ ادباء اور دیگر ہمدردوں سے عموماً اور پشتو ٹولنہ کابل سے خصوصاً التماس کرتا ہوں کہ اس مسئلہ کو حل کر ہی ڈالیں۔ خواہ افغان قوم کے مفکرین کا ایک مشترکہ جرگہ طلب کرنا ہی پڑے۔ خواہ چند علماء اور مفکرین کو ثالث مقرر کیا جائے شاید مشکلکشائی کی کوئی اور صورت نکل آئے۔ افغان قوم اب جاگ اُٹھی ہے۔ اس موقعہ پر اگر قومی وحدت اور مرکزیت کا پودا لگا دیا گیا تو قوم کی فطری انتہا پسندی سے پوری توقع ہے۔ کہ افغان جوانمرد تحصیل علم و ہنر میں کئی گنا زیادہ نام پیدا کرلے گا۔

افغان قوم کا یہ خاصہ ہے کہ جس کام میں ہاتھ ڈالے اُسے ایسا پورا کر دکھاتی ہے کہ دنیا ششدر رہجاتی ہے۔ میدان علم وہنر میں بھی گوے سبقت لیجائے تو کوئی اچنبا نہیں۔

قدرتی بات ہے کہ ہر مدعی دعوٰی دائر کرنے کیوقت تصوّر کرنے لگتا ہے کہ دعوٰی کا فیصلہ اسی کے حق میں ہوگا۔ قندہاریوں۔ خٹکوں اور یوسف زئیوں کے دعوے اپنی اپنی جگہ معقول اور فائق ہیں کیونکہ ہر ایک کے دعوٰی کی پشت پر دلائل ہیں لیکن دل یہ کہتا ہے کہ فتح اسی فریق کی ہوگی امدادِ ربّانی جسکے شامل حال ہو۔ خدا نے چاہا تو اس کے کرم سے اس قوم میں ایک ایسا جیّد عالم۔ فاضل۔ ادیب۔ مفکر اور مصلح وجُود میں آئے گا جو اپنے علم وفن اور نرالے خیالات اور تصوّرات سے افغانوں کی قومی زندگی میں انقلاب پیدا کرڈالے گا۔ اس کے بعد ''ادب''۔ ''محاورہ''۔ ''تلفّظ'' وغیرہ یہ سب چیزیں پیدا ہوجائیں گی۔ سب قبائل اس مردِ مجاہد کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں گے۔ دُعا ہے قوم میں پھر ایک خوشحال خان یا سیّد جمال الدین افغانی پیدا ہو تاکہ مشکلیں آسان ہوں۔

انشاء اللہ کسی اور موقعہ پر ''عمدہ پشتو'' کے موضوع پر میں اپنے خیالات کا اظہار کرونگا۔ اور یہ بھی عرض کرونگا کہ کن اصُولوں کیمطابق ہم دوسری زبانوں سے الفاظ اخذ کریں۔ یہ بھی خیال ہے کہ اگر ہم پشتو کو ایک بلندپایہ علمی اور ادبی زبان کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہوں تو اس کیلئے کیا کیا ساز وسامان بہم پہنچائیں۔ اگر ''نن پرون'' کے قارئین کرام نے اپنے زرّین خیالات سے ہمیں مستفید کیا تو میں اصُول وضع کرتے وقت اُن کی رائے کو اپنے لئے مشعل ہدایت سمجھُوں گا اور بعد شکریہ ان کا ذکر کرونگا۔ مضمُون لمبا ہوگیا ہے اور ممکن ہے بارِ خاطر بھی ہوگیا ہو۔ چونکہ مسئلہ زیرِ بحث افغان قوم کے مستقبل کیلئے اشد ضروری ہے بغیر تفصیل کے کوئی چارہ نہ تھا۔ علاوہ اسکے یہ مسئلہ جتنا جلد طے پائے اچھا ہے کیونکہ آجکل کابل میں تصانیف کا چرچہ ہے اور افغان دیگر علاقوں میں بھی کتابیں لکھ رہے ہیں۔ بعض احباب اپنے دلوں میں یہ نیک خیال لبائے بیٹھے ہیں کہ قرآن شریف کی ایک جامع اور مستند تفسیر پشتو زبان میں تالیف کیجائے کیا یہ اچھّا نہ ہوگا کہ ایک رسم الخط اور حتے الامکان ایک ہی جامع ادبی اور معیاری زبان اور محُاورہ میں یہ تفسیر لکھی جائے تاکہ تمام افغان قوم کے لئے اس کی زبان یکساں اور آسان ہو اور سب کی دینی اور دنیوی نجات اور ترقی کا ذریعہ بن سکے۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

(پشتو سے ترجمہ)

پشتو شاعری :— (بقیہ مضمُون صفحہ ۲۱)

فطرت کو نیکی میں ڈھالے تو صحیح معنوں میں انسان ہے ایسی قومی اور اجتماعی زندگی بنائے کہ وطن سنور جائے اور اغیار بھی اسکی شان کو ماننے لگیں۔ اور ایک نہ ایک دن ایسی عظیم الشان ہستی بنا لیگا جس کی نظیر تاریخ بشر میں ڈھونڈے نہ ملے۔ بصُورتِ دیگر ساری عمر ذلت۔ جہالت اور غلامی میں کٹے گی اور آخر کار صفحہ ہستی سے مٹ رہے گا۔

(پشتو سے ترجمہ)

دَ مغربي صحرا په تازه جګړو کښ نیولی شوی دَ محوري سپاهیانو یو اوږد قطار په دوئ کښ اکثر جرمنیان دي -

رفتار زمانہ

العالمین کی لڑائی کے اول وقت میں جرنیل آکنلک نے خوب دفاعی چالیں چلیں۔ وہ چالیں اب وسعت پکڑ رہی ہیں۔ پہلے تو خاص خاص رقبوں میں جوابی وار ہوا کئے۔ لیکن ۲۱ جولائی کے بعد سے سارے کے سارے بیس میل لمبے محاذ پر حملہ شروع ہوگیا ہے۔ اس محاذ کے وسط میں دو گھنٹے گولہ باری کے بعد ہندوستانی سپاہ دشمن پر پل پڑی۔ ہندوستانی سپاہی کے پیچھے ہی برطانوی اور نوآبادیات کی افواج تھیں۔ اور ان کے پیچھے ٹینک تھے۔ ۲۵ جولائی تک اتحادی قوتوں نے جرمن مورچوں کی بیرونی قطار پر قبضہ کر لیا۔ اور میدان جنگ کے اہم ٹیلے دشمن سے چھین لئے۔ اب اتحادی افواج اس سارے رقبہ کے استحکام میں مصروف ہیں۔

دراصل بات یہ ہے۔ کہ اتحادیوں نے رومل کی رسدات بالخصوص پٹرول کے ذخیروں کو ایسے کرارے نقصان پہنچائے۔ کہ وہ یلغار بھول گیا۔ اور اپنے بچاؤ پر اتر آیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ دشمن میں اب جان ہی نہیں رہی یا یہ کہ اُسے ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔

روزنامہ "الدستور" (قاہرہ) لکھتا ہے:۔

"ان صحرائی لڑائیوں میں جو خموشی سی نظر آرہی ہے درحقیقت خموشی نہیں بلکہ یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ اتحادیوں کے حفاظتی دستے دشمن پر مار دھاڑ کرتے رہتے ہیں۔ دشمن کے مورچوں پر برابر گولہ باری ہوتی رہتی ہے۔ اور رایل ایر فورس کے جہاز آئے دن یورش کرکے اس کی گاڑیوں کے اڈوں اور سلسلہ رسد رسانی کو تحس نحس کرتے رہتے ہیں۔ اس عرصہ میں برطانوی سپاہ اس دھن میں رہتی ہے۔ کہ مورچوں کو مضبوط کرتی جائے۔ اپنے لئے اور اچھے ٹھکانے چنے اور موقع پائے تو دشمن پر اور وار کرتی رہے ہم سمجھتے ہیں کہ جنگی نقطۂ نظر سے اس موسم گرما میں جو دن گذرے غنیمت ہے۔

رُوس: ــــــــ روسی روستو چھوڑ گئے۔ اور جرمن سٹالین گراڈ اور قفقاز کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جرمنوں کا مقصد اب بھی یہی نظر آتا ہے۔ کہ روسی قوتوں کو نرغہ میں لاکر موت کے گھاٹ اتاریں لیکن روسی ایسی ہوشیاری سے نکل گئے

کہ جرمن ہاتھ ملتے رہ گئے۔ قرائن سے پایا جاتا ہے۔ کہ روسیوں نے ابھی تک اپنی احتیاطی توڑے کو میدانِ جنگ میں نہیں ڈالا ہے۔

فضائی حملے

فضائی عملیات میں نمایاں تیزی آگئی ہے۔ بالخصوص رائل ایر فورس نے شمالی فرانس۔ بلجیم۔ ہالینڈ۔ جرمنی اور لیبیا پر زیادہ شدت سے حملے کر دیئے ہیں۔

صرف ڈروسبرگ پر تین پے در پے حملے ہوئے پہلا ۲۱ر جولائی کو۔ دوسرا ۲۳ر جولائی کو اور تیسرا ۲۵ر جولائی کو۔ یہ ڈروسبرگ یورپ کی داخلی بندرگاہوں میں سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ علاقہ روہر کی بھاری صنائع کا نکاس اسی بندرگاہ سے ہوتا ہے۔ یہ کارخانوں کا مرکز ہے۔ اور نہروں اور ریلوں کا جنگشن بھی ہے۔ صرف آخری حملہ میں چوّن ہزار پونڈ وزن کے بمب برسائے گئے۔ جن سے بڑی دُور دُور تک آگ پھیل گئی۔ دوسرے دن صبح کے وقت بھی علاقہ روہر کے اُوپر دھوُاں ہی دھوُاں دکھائی دیتا تھا۔

ہزار ہزار بمباروں کے حملوں کو چھوڑ کر سب سے سنگین حملہ ۲۶ر جولائی کو ہیمبرگ پر ہوا۔ اس حملہ میں پانسو بمباروں نے حصہ لیا۔ اور پونے دو لاکھ بمب گرائے گئے۔ ۲۹ر جولائی کو سار برکن پر جو غربی جرمن میں بھاری صنائع کا مرکز ہے نہایت تباہ کن بمباری عمل میں آئی۔ اس کے بعد ایک اور حملہ جو اس جنگ کا سب سے دہشتناک حملہ سمجھا جاتا ہے۔ ۳۱ر جولائی کو ڈسلڈارف پر کیا گیا۔ یہ مقام فولاد سازی۔ اسلحہ سازی اور انجینئرنگ کا مشہور مرکز ہے۔ اس ایک حملہ میں ڈیڑھ سو بمب گرائے گئے ہر بمب کا وزن دو ٹن یعنی ۵۶ من تھا۔

جرمن طیارے بھی برطانیہ کے مختلف مقامات پر حملہ آور ہوتے رہے ہیں۔ سب سے سنگین حملہ برمنگھم پر ہوا۔ آگ تو بہت جگہ بھڑک اٹھی تھی لیکن جلدی ہی اس پر قابو پا لیا۔

بحرالکاہل کے اطراف میں اتحادی اور جاپانی طیارے بالمقابل حملے کرتے رہے ہیں۔ سب سے زیادہ قابل ذکر حملہ وہ ہے جو جاپانی طیاروں نے پہلی مرتبہ آسٹریلیا کے شرقی ساحل پر کیا۔ یہ طیارے غالباً نیوگنی سے آئے تھے۔

ہندوستان

مہاتما گاندھی نے "ہریجن" میں ایک مقالہ بعنوان "ہر جاپانی کے نام پیغام" لکھا۔ جس میں جاپان کے لئے انتباہ ہے۔ آپ لکھتے ہیں:۔

اگر آپ کا یہ خیال ہے۔ کہ ہندوستان آپ کو خوش آمدید کہے گا۔ تو میری یہ پرزور التجا ہے۔ کہ آپ اس خیال کو اپنے دماغ سے نکال دیں کیونکہ

"ایں خیال است و محال است وجنوں"

اگر آپ کو کسی نے یہ تبلایا ہے کہ ہم نے عین اس وقت میں جب کہ آپ ہندوستان پر یلغار کرنے کو ہیں اتحادیوں کو پریشان کرنے کی ٹھانی ہے تو آپ کو بہت غلط تبلایا گیا ہے۔

افغانستان تعمیری پروگرام کی وسعت کے پیش نظر وزارت فوائد عامہ نے فیصلہ کیا ہے کہ کابل اور مضافات میں بڑھئی اور معماروں کی کلاسیں کھولی جائیں۔ ہر طالب فن کو آٹھ مہینے کام سیکھنا پڑے گا اور اس عرصہ میں اسے ۱۷۰ افغانی ماہوار بطور وظیفہ ملے گا۔

— نائب سالار سید عبد اللہ خان نے والا حضرت وزیر حربیہ کی خدمت میں جو افغانستان کی اولمپک انجمن کے صدر بھی ہیں ایک چاندی کا کپ پیش کیا ہے تاکہ "افغان فوجی فٹ بال ٹورنامنٹ" قایم کیا جائے۔ جو ٹیم جیتے اس کپ کے علاوہ اس کے ہر فرد کو ایک ایک تمغہ بھی دیا جائے۔

— حال ہی میں لغلان میں خولہ غار نالہ طغیانی کی وجہ سے خراب ہو گیا ہے۔ اب اس کی مرمت کردی گئی ہے۔

پشتو رسم الخط: ——— بقیہ مضمون صفحہ (۳۹)

اسی طرح "زڑہ" (دل) کے کوئی ۵۲۸ مرکب الفاظ مہیا کرسکا ہوں۔ اگر پشتو میں اس قسم کی علمی اور ادبی کتابیں وجود میں آجائیں تو اسے اس کی ایک حقیقی ترقی سمجھنا چاہیئے۔ زبانوں کے فلسفۂ ارتقاء کو مدنظر رکھکر ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں۔ کہ زبان بذات خود ترقی نہیں کرسکتی۔ یہ تو پشتون قوم کا ذریعۂ اظہار ہے۔ قوم کی ترقی اور اس کی زبان کی ترقی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

(پشتو سے ترجمہ)

راضی بہ رضا

میں شوق سے آلام جہاں سہتا ہوں
اور تیرے ستم کو بھی کرم کہتا ہوں
کافی ہے مشیت کا نوشتہ مجھکو
ہر حال میں راضی بہ رضا رہتا ہوں

فلسفۂ عشق

خونریز تمناؤں کا حاصل معلوم
دریائے غم و رنج کا ساحل معلوم
تا عمر بہر سمت بھٹکتے رہنا
معلوم مجھے عشق کی منزل معلوم

(عبدالرشید شیدا گجراتی)

پشتو شاعری

اور

افغانوں کا اخلاقی فلسفہ

۲

(ڈاکٹر احسان اللہ خانصاحب۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی۔ پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور کے بصیرت افروز مضمون "پشتو شاعری اور افغانوں کا اخلاقی فلسفہ" کی پہلی قسط گذشتہ شمارہ میں شائع ہوچکی ہے۔ دوسری قسط اب ہدیۂ قارئین کرام ہے۔———: ادارہ)

ایک اور دقت یہ ہے کہ خوشی کی ماہیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ اس دقت کا ہم پہلے بھی ذکر کر چکے ہیں۔ خوشی کا مدار جذبات پر ہے۔ اور جذبات کا یکساں ہونا محال ہے۔

جذبہ انفرادی چیز ہے۔ کوئی کسی چیز سے خوش ہے کوئی کسی چیز سے۔ اس کے علاوہ کوئی ایک چیز خوشی کا دائمی ذریعہ نہیں ہوتی۔ اگر آج کسی چیز سے خوشی ہوتی ہے تو کل اسی چیز سے بیزاری اور نفرت ہوجاتی ہے۔ جو چیز کل بُری لگتی تھی آج اچھی لگتی ہے۔ اسلیئے یہ کہنا غلط ہے کہ تمام افراد کے جذبات کسی ایک محترک سے یکساں اثر لیتے ہیں یا یہ کہ تمام انسان کسی ایک چیز سے خوش ہیں اور کسی ایک چیز سے بیزار۔ ہر ملک اور ہر زمانہ کی تاریخ چھان مارئیے کوئی ایسی نظیر نہیں ملے گی جس کی رو سے یہ کہا جا سکے کہ کوئی ایک چیز دنیا کے تمام انسانوں کیلئے خوشی کا باعث ہوئی۔

فیلسوفوں کا ایک فرقہ یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ اعمال و اخلاق حسنہ وہی ہوسکتے ہیں جن سے انسان کمال حاصل کرسکے۔ یہ لفظ "کمال" کا مفہوم مبہم اور غیر محدود ہے۔ کمال سے مراد صرف اخلاقی بلندی بھی ہوسکتی ہے۔ اور "کمال" کا اطلاق نہ صرف اخلاقی بلندی پر بلکہ روحانی۔ جسمانی اور عقلی بلندی پر بھی ہوسکتا ہے۔

اب رہا "اخلاق"۔ "کمال" کی طرح اسکی ماہیت کا بھی پورا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ کہاجاتا ہے کہ 'اخلاق' سے مراد اعلیٰ اخلاق حاصل کرنا ہی ہے۔

یہ تعریف عرب فیلسوفوں کی اصطلاح میں "تعریف الشئی بنفسہٖ" ہے یعنی کسی لفظ کی تعریف ایسے الفاظ میں کرنا جو خود محتاج تشریح ہوں۔ پس یہ تعریف غلط بھی ہے اور ناکافی بھی۔

ایک نظریہ یہ ہے کہ اخلاق یا نیک عمل کا دارو مدار عامل کی اپنی نیت پر ہے۔ اور اس عمل کے نتیجہ اور انجام سے اخلاق کا کوئی سروکار نہیں۔ نتیجہ کچھ ہی ہو اگر نیت ٹھیک ہے تو عمل بھی نیک ہے۔ اس کی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ نتیجہ کسی کے بس کی بات نہیں۔ انسان نہ دنیا کا خالق ہے اور نہ ہی اس پر اتنا قادر ہے کہ اس کے ہر عمل کا نتیجہ اس کے ارادہ اور خواہش کے مطابق ہو عمل کے نتیجہ میں زمانہ کے بہت سے حالات اور واقعات کا دخل ہے جو انسان کی نظر سے اوجھل ہیں اور جنہیں انسانی فہم پا نہیں سکتی۔ انسان انہیں جان بھی لے تو بھی ان سب پر قابو پانا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ حالات کو اس طرح سے ڈھالنا کہ وہ ہماری یا دوسروں کی خوشی ہی کا باعث ہوں محالات سے ہے۔

ایک مثال لے لیجئے۔ ایک بچہ ندی میں گر گیا ہے اور ڈوبا چاہتا ہے اُسے بچانے کے لئے میں ندی میں کود پڑتا ہوں۔ ممکن ہے اسے بچا لاؤں۔ ممکن ہے میری اپنی جان جاتی رہے۔ اگر بچّے کو بچاتے بچاتے میں خود ہی چل بسوں تو اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چونکہ نتیجہ میرے ارادہ کے خلاف نکلا لہذا میرا عمل بُرا تھا۔ بلکہ نیت نیک ہونے کی وجہ سے میرا یہ عمل درحقیقت قابل تحسین ہے۔ میں نے اپنے نیک ارادہ کو پورا کرنے کے لئے پُوری کوشش کی۔ پانی کا دباؤ میری طاقت سے زیادہ ثابت ہوا۔ میں ناکام رہا۔ میں پانی کا خالق نہیں ہوں اور نہ اس پر میرا اتنا قابو ہے۔ کہ میری خاطر اپنی خاصیت بدل دے۔ میرا قابو تو لے دے کے اپنی نیت پر ہے۔ میری نیت نیک تھی میرا عمل بھی نیک تھا۔

پس نتیجہ یہ نکلا کہ عمل وہی نیک ہے جس کے کرنے میں عامل کی نیت نیک ہو۔ سچائی کا نتیجہ چاہے کچھ ہی ہو سچ صرف سچائی کی خاطر بولنا چاہیئے۔ زکوٰۃ اس نیت سے دی جائے کہ بجائے خود یہ عمل اچھا ہے نہ اس نیت سے کہ دنیا میں اسکا کوئی صلہ ملے۔

اگر کسی عمل کو اپنا فرض تسلیم کرلیا جائے تو اُسے اس نیت سے کیا جائے کہ اس کا کیا جانا ہی واجب ہے نہ کسی ڈر یا کسی لالچ سے۔ غرض نیت نیک

ہو۔ اسلام بھی یہی سکھلاتا ہے۔

حضرت رسالتمآب صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّات

میری دانست میں ہر لحاظ سے یہ نظریہ بجا اور درست ہے

اس مقالہ میں ہمارا مقصود یہ نہیں کہ کونسا نظریہ صحیح اور کونسا غلط قرار دیا جائے۔ ہمارا مدعا صرف یہ دیکھنا ہے کہ آیا اس قسم کے نظریے ہماری پشتو شاعری میں موجود ہیں یا نہیں۔ پشتو شاعری تو درکنار۔ پشتو نثریات میں بھی کہیں ان نظریوں کے بارہ میں کوئی مفصل علمی بحث نہیں پائی جاتی کہیں کہیں اشارے ہوں تو ہوں۔ پشتون قوم ابھی تک باہمی سر پھٹول اور کینہ سے فارغ نہیں ہو سکی ہے۔ ایسے دقیق مسائل پر غور یا بحث کرنے کی نہ فرصت ملی اور نہ ہی کبھی اطمینان نصیب ہوا۔ ان کا اخلاق رواجی اخلاق ہے (جیسا کہ زمانۂ جاہلیت میں عربوں کی حالت تھی)۔ ان کا فلسفۂ اخلاق محض نظری ہے۔ جو عربوں کی اصطلاح میں "حکمتِ نظری" کہلاتا ہے۔ وہی اعمال نیک سمجھتے ہیں جنہیں پشتہا پشت سے نیک سمجھتے آئے ہیں۔ پشتون اعمال کی نیکی یا بدی کے بارہ میں کسی اصولی بحث میں پڑتے ہی نہیں

پشتون قوم کا اخلاق کسی فلسفہ یا علمی اصول پر ہو یا نہ ہو۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کا رسمی یا رواجی اخلاق کیا ہے۔ ان کا رواجی اخلاق فیاضی۔ مہمان نوازی مردانگی۔ خودداری۔ غیرت۔ کینہ۔ انتقام وغیرہ جذبات پر حاوی ہے۔ پشتو نثریات میں ان خاصیتوں کا ذکر آتا ہے۔ لیکن پشتو شاعری تو ان سے لبریز ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں۔

(نوٹ)

(ان پشتو اشعار کا مفہوم اردو میں پیش کیا جاتا ہے۔ ادارہ)

فیاضی اور مہمان نوازی:۔ پشتو کے ملک الشعرا خوشحال خان خٹک فرماتے ہیں۔

— خان وہ ہے جو کمائے کھائے اور خدا کے نام دے۔

— اکیلے اکیلے ہی پیٹ بھرنا نہ کھانے کے برابر ہے

— دسترخوان وہ ہے جس پر کئی آدمی اکٹھے بیٹھکر کھائیں۔

— وہی شخص دولتمند کہلانے کا مستحق ہے جس کی دولت کے دریا سے بخشش کی نہر جاری ہو سکے۔

— میں اور دولت آپس میں بیری ہیں پھر ہم اکٹھے کیسے ہو سکتے ہیں؟

سخی کی تعریف میں حضرت رحمان بابا فرماتے ہیں

— سخی تلوار نکالنے سے پہلے بخشش کی دیگ چڑھاتا ہے تاکہ سرد آہوں سے چولہا ٹھنڈا نہ پڑ جائے۔

—— سخاوت سے خزانہ میں برکت ہوتی ہے۔ اگر کوئیں سے پانی نکالا جائے۔ تو کنواں اور زیادہ بھر جاتا ہے

مردانگی اور بہادری:۔ خوشحال خان خٹک فرماتے ہیں :۔

—— جوانمرد وُہ ہے جو تلواروں کی جھنکاریں نکلے

—— جوانمرد اپنے سے پہلے دشمن پر ہاتھ صاف کرتا ہے۔ نامرد حیل وحجت ہی کرتا رہتا ہے ۔

—— تم نے پشتون ماں کا دودھ پیا ہے۔ تمہارے لئے بہادری اچنبا نہیں ہے۔

—— کابل ہو یا کشمیر۔ سب تلوار کی کمائی ہے۔

—— وہی آدمی بہادر ہے جو گیتوں اور نوحوں میں برابر سراہا جائے۔

—— خوشحال خان کی خوشی کی اس وقت انتہا نہیں رہتی۔ جب تلواروں اور نیزوں کی چمک سے اسکی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں ۔

—— جو تلوار سے بہادری کرے وہ ہمیشہ کامگار رہے گا ۔

—— جو دل بہادر نہ ہو وُہ دل کس کام کا۔

—— .... مائیں اپنے اُن بیٹوں کا داغ نہ دیکھیں جو مرد میدان ہوں۔

خودداری اور غیرت:۔ خوشحال خان فرماتے ہیں :۔

—— سر جائے۔ مال جائے۔ آبرو نہ جائے۔ کیونکہ آبرو ہی بشر کی ساری خوبی ہے۔

—— جو آدمی آبرو کے کارناموں پر خوش نہیں ہوتا وُہ ہر چند مرد نظر آئے لیکن درصل مرد نہیں ہے

—— غیور آدمی اپنی آبرو پر سب کچھ نچھاور کر دیتا ہے۔ جس میں آبرُو نہ ہو وہ عمر خضر بھی پالے۔ پر رہیگا روسیاہ۔

—— شیر کا آسرا لشکر پر نہیں بلکہ اپنے بازوؤں پر ہوتا ہے۔

کینہ اور انتقام:۔ خان عالی فرماتے ہیں :۔

—— لکڑی کے وار کا جواب تلوار سے دینا بہادری ہے

—— یہ بات مجھے ہمیشہ یاد رہتی ہے کہ جب بھی بس چلے دشمن کا سر میخکوب کرکے چکنا چور کر ڈالوں۔

—— جوانمرد۔ جوانمرد ہی رہتا ہے چاہے اس کا سر شیر کے منہ ہی میں کیوں نہ دے دیا جائے۔

—— تیر و تلوار کی ہزاروں گھاؤ کھائے۔ لڑائی میں ہزیمت اُٹھائے۔ لیکن بدلہ لئے بغیر چین سے نہ بیٹھے تب مرد کہلا سکتا ہے۔

علوِّ ہمت اور استقلال:۔

—— میرا دل پہاڑ کی طرح اٹل ہے اور دنیا کے حوادث اور مسلح فوجیں اُسے ہلا نہیں سکتیں۔

—— جوانمرد کے لئے دو ہی راستے ہیں یا مدّعا پائے یا سر دے ڈالے۔

—— آسمان تمہیں شیر کے جبڑوں میں ڈال دے تو بھی ہمت نہ ہارو۔

— راستہ خون آلود ہی کیوں نہ ہو منزل مقصود
پر پہنچ ہی کے رہو۔

رحمٰن بابارحؒ فرماتے ہیں :۔

— جوانمرد کسی طرف رُخ کرے یہ نہیں دیکھتا
کہ راستہ میں کنواں ہے یا کھڈ۔

مذکورہ بالا صفات پٹھان کی گھٹی میں ہیں
نیکی کی طرف جھکیں یا بدی کی طرف۔ بہرحال پٹھان
کو بھاتی بہت ہیں۔ پٹھان کی مہمان نوازی ہی
اس درجہ ہے کہ اپنی ساری ہستی بگاڑ کر نوکری
سے اپنا پیٹ بھرنے لگتا ہے۔ اس میں وُہ اپنی ہیٹی
نہیں سمجھتا۔ اور دوسرے پٹھانوں میں تو اس کی آبرو
اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بخیل دولتمند اُن کو ایک
آنکھ نہیں بھاتا۔ اسی طرح اگر ایک پٹھان مردانگی
اور بہادری کی خاطر اپنی ساری ہستی کھودے
اور ناچار ڈاکو بن بیٹھے شرمانا تو درکنار
اترانے لگتا ہے۔

پٹھان کے نزدیک ڈاکہ زنی کنجوسی اور
بے غیرتی سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یہی وجہ ہے
کہ پٹھان اپنے حجروں میں بیٹھے آئے دن اپنی
ڈاکہ زنی۔ رہزنی اور ہر قسم اور کارناموں پر
بہت اتراتے اور بڑی آن بان سے اُن کا ذکر
کرتے رہتے ہیں۔ وُہ یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی ایسے کام
کرتے وقت اپنی جان جوکھوں میں ڈالتا ہے اور
اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا جتن کرتا ہے اُنکی دانست
میں یہ بھی بڑی مردانگی اور بہادری ہے۔

غیرت اور خودداری کے موقعوں پر تو پٹھان
حد سے گذر جاتا ہے اور پھر بجائے اس کے کہ
شرمسار ہو ڈینگیں مارتا ہے۔ عند۔ کینہ اور
بغض تو اس کے خمیر میں ہیں اور انہیں وُہ عین غیرت
یا "پشتو" سمجھتا ہے۔ یہ خیال کرتا ہے کہ میں انہیں
باتوں کے لئے پیدا ہُوا ہوں۔ ان باتوں کو وُہ بظاہر
قابلِ مذمت تو مانتا ہے لیکن چونکہ اُن میں خودداری
غیرت اور بہادری کی صفات بھی مضمر ہیں دل
سے اچھا ہی سمجھتا ہے۔

ہمیں چاہیئے اخلاق کی اصلی ماہیت پشتون
قوم کے دلنشین کریں تاکہ وہ محسوس کرنے
لگیں کہ یہ خوشنما "صفات" قابلِ فخر نہیں۔
یہ صفات طبیعی ہیں نہ کہ اخلاقی۔ طبیعی ہونے
کی بنا پر یہ اچھی ہیں بشرطیکہ نیت یا ارادہ نیک ہو
ورنہ بُری۔ بھلی نیت سے نہ ہو تو فیاضی اور مہمان
نوازی نہیں مستی اور بربادی ہے۔ مردانگی
یا بہادری نہیں ظلم۔ قتل۔ ڈاکہ۔ فساد اور
آدم خوری ہیں۔ خودداری اور غیرت
کینہ اور بغاوت کا گہوارہ بن جاتی ہے
پٹھان اخلاق کی ماہیت سمجھ جائے
تو ان قبیح عادتوں پر نہ اترائے۔ اپنی بلند پایہ

(بقیہ برصلا)

بدی کے بدلے نیکی

(بجنو)

جاڑا پورے جوبن پر ہے۔ رات کا وقت ہے
انگیٹھی دہک رہی ہے۔ کمرہ گرم ہو رہا ہے۔ بی بی
کھانا کھا چکی ہے۔ زیبا نوکرانی برتن اٹھانے
اندر آئی۔ صورت ذری مرجھائی ہوئی تھی۔ بی بی
بھانپ گئی ہو نہو کوئی بات ہے۔

بی بی:۔ زیبا کیا ہوگیا؟ ایسا دکھتا ہے کہ روتی
آئی ہو۔

زیبا:۔نہیں بی بی، نہیں۔ ایندھن ذرا گیلا تھا
دھواں بہت ہو گیا تھا۔ آنکھوں سے
پانی بہہ نکلا۔

بی بی:۔ ہو سکتا ہے لیکن تمہارا پیلا پن کچھ اور
ہی سجھا رہا ہے۔ سچ سچ بتاؤ۔ بات کیا ہے؟

زیبا (آہ کھینچکر):۔ بی بی۔ میرے رونے دھونے
اور پیلا پن کا آپ کیا پوچھتی ہیں؟ بیکس نہ
روئیں تو کیا کریں۔ کل رات میں نے خالد
کے ابا کو سپنے میں دیکھا۔ کہتا تھا۔ "زیبا
تمہاری یاد مجھے ستا رہی ہے"
باتیں کیا تھیں تازیانہ تھیں۔ بی بی کا شوق
اور بھی چمک اٹھا۔

بی بی:۔ زیبا آج تم اپنی آپ بیتی ساری کی ساری
سنا ڈالو۔

زیبا:۔ میری کہانی تو بہت درد بھری ہے۔ آپ کو
اصرار ہے تو سنائے دیتی ہوں۔

اور یوں بیان کرنے لگی:۔

"ایک دن تھا کہ میں بھی جوان تھی۔ میں اور
خالد کا ابا بڑے پیار محبت سے رہا سہا کرتے
تھے۔ خدا نے بہت کچھ دے رکھا تھا۔ خالد کا ابا
بیوپار کرتا تھا۔ دور دور مال لے جاتا۔ مہینوں بعد
لوٹتا۔ بڑا نفع کماتا اور بہت سامان اپنے ساتھ
لاتا تھا۔ مجھے چاہتا بہت تھا۔ ہر بار نئی نئی سوغاتیں
لاتا تھا۔ بارہا کہہ اٹھتا:۔

"کاش تم روح ہوتیں اور میرے من
میں سما جاتیں۔ تمہیں دیکھ کر جی رہا ہوں
بن تمہارے جینا کٹھن ہے"

عورت کو دنیا میں خوشی ہے تو یہ کہ میاں اسے چاہے
خالد کا ابا مجھے بیحد چاہتا تھا۔ میں اپنے بھاگ پر
اتراتی تھی۔ لیکن کیا خبر تھی کہ آگے آگے کیا
ہونے کو ہے۔

ایک دفعہ خالد کا ابّا حسب معمول باہر گیا۔ تین مہینے گذرے تھے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے اس کا خط آیا۔ لکھّا تھا کہ کاروبار بڑھ گیا ہے۔ اکیلے سے نبڑ نہیں سکتا۔ شیر گل کو بھیج دو۔ شیر گل ہمارا بڑا لڑکا تھا۔ میں نے اُسے روانہ کر دیا۔

شیر گل ڈیڑھ مہینہ باپ کے پاس رہا۔ ایک دن اچانک اس کے باپ کی چٹھی آئی۔ لکھّا تھا۔ ہم آ رہے ہیں۔ تیسرے دن دو نو آن پہنچے۔ دن گذر گیا شام کا کھانا کھا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ خالد کا ابا یکا یک چُپ ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد کہنے لگا:۔

" زیبا اگر جوانی کا بھوت میرے سر سوار ہو جائے اور میں اور بیاہ کر لوں تم بگڑو گی تو نہیں"؟

میں مسکرا کر خاموش ہو رہی۔ میں اسے نری دل لگی سمجھی۔ لیکن اس نے وہی بات پھر دُہرائی۔ تب تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے بگڑ کر کہا:۔

"کیا بُری عادت ہے ایسی بات کر ڈالتے ہیں کہ سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ مجھے ستانا آپ کو بھاتا ہے کیا"؟

خالد کا ابّا خاموش سنا کیا۔ اٹھ کے باہر گیا۔ آیا اور سو گیا۔ میں بھی سو گئی۔ آدھی رات کو کیا دیکھتی ہوں ؟ میرا لڑکا مجھے ہلا ہلا کر کہہ رہا ہے "اماں اماں وہ آ گئی۔ وہ آ گئی باہر صحن میں بیٹھی ہے"۔

میں اٹھی۔ حیران کہ کہتا کیا ہے۔ بیٹا مجھے صحن میں لے گیا۔ دیکھتی ہوں ایک لڑکی چادر اوڑھے بیٹھی ہے۔ میں پاس گئی تو وہ اُٹھی اور سلام کر کے پھر بیٹھ گئی۔ کیا کہوں۔ اس وقت میرے دل پر کیا گذری۔ میرے اوسان جاتے رہے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اسی گومگو میں خالد کا ابا آ گیا اور کہنے لگا:۔

"منہ ہاتھ دھونے کے لئے ذرا پانی گرم کر دو"۔ میں گئی۔ پانی گرم کر کے صحن میں چھوڑ آئی اور چپکے سے بستر پر لیٹ گئی۔ بھلا نیند کہاں! رات جاگتے کٹی۔ اُجالا ہوا تو دیکھا دلہن کمرہ میں آئینہ کے سامنے کھڑی بال سنوار رہی ہے۔ سنگار ہو چکا تو میرے پاس آئی گلے سے لپٹ گئی اور ہنسنے لگی۔ اور میرا غصّہ یہ جا وہ جا! وہ کہنے لگی۔ "تم میری بہن ہو"۔ میں بھی بول اٹھی! "تم میری بہن ہو"۔ اور جا صندوق سے ریشمی جوڑے لے آئی۔ اور اس کے سامنے دھر دیئے۔ ہم میں چولی دامن کا ساتھ ہو گیا۔

زمانہ یوں ہی گذرتا گیا۔ ہاں خالد کے ابّا کے لچھن اور ہوتے گئے مجھ سے روکھا ہوتا گیا نہ وہ آنکھیں رہیں نہ وہ زبان رہی ہر گھڑی نئی جورو کے ساتھ رہتا اور مجھ سے بھول کر بھی نہ بولتا۔

ایک دن میں ہمسایہ کے ہاں تنور پر روٹیاں لگانے گئی تھی۔ لوٹی تو خالد کے ابا کو صحن میں

واڼی فلانے بیدُ ورَ فلانی پہ خیرَ ے ۔ بہ او ربلہ و اولیدہ و گبن فرق وی

ے حٔہ وایم دا یو ماشوم دَے ، دَے واڼی چہ نہ

ھغہ واڼی جورہ دی ، زہ پہ نا شوہ فیصلہ

ایک ہی ہے ـــــ یا ـــــ دو ہیں ؟ ۔

داھم څما او داھم څما ۔ تالہ ئے درکړم ۔ وګَتے بہ دَدِ ے ببنکلے

ماشوم پہ لاس کبنی داوَ بہ ے ھم ببنکلے ښکاری ۔ مالہ ۔

اس پیارے بچّے کے ہاتھ میں یہ بھُٹّا کیسا بھلا لگتا ہے

آپ سارے ہی کو اڑایا چاہتے ہیں ۔

کھڑا پایا۔ تیور بدلے ہوئے تھے۔ للکار کر مجھے کہا:۔
"یہ لو طلاق نامہ۔ میں تمہیں اس گھر میں ایک آن دیکھنا نہیں چاہتا۔ جہاں چاہو چلی جاؤ"۔ میں ہکّی بکّی رہ گئی۔ پھر یکایک میری چیخیں نکل پڑیں۔ اور رو رو کر میں نے کہا:۔
"یہ کیا ظلم ڈھا رہے ہو۔ بیس سال تمہاری خادمہ بن کر رہی۔ زندگی کے سارے نشیب و فراز میں اکٹھے رہے۔ آخر ماجرا کیا ہے؟ مجھ سے قصور کیا ہوا؟ بقیہ عمر تمہارے ہی قدموں میں کاٹنا چاہتی ہوں۔ اس عمر میں اب مجھے گھر سے نہ نکالو۔ مجھ پر ترس کھاؤ"۔
بہت روئی۔ چیخی۔ گڑگڑائی۔ سب بیسُود اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ آخر بس کہنے لگا:۔
"میرا فیصلہ اٹل ہے۔ تم یہاں مطلق ٹھہر نہیں سکتی ہو"۔
ناچار اندھیری رات اس گھر سے نکل پڑی۔ بچے ساتھ اور کپڑوں لتوں کی گٹھڑی بغل میں۔ بہن کے گھر کا راستہ لیا۔ اور کہاں جاتی؟ رات بھر پیدل چلا کئے۔ آبلے پڑ گئے۔ خدا خدا کر کے تڑکے بہن کے ہاں پہنچے۔ ہماری حالتِ زار دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ میں نے سارا ماجرا سنایا۔ ہم دونو گلے لگ کر خوب روئیں۔ آخر کار بہن نے مجھے بہت تسلّی دی اور کہا:۔ "یہ سب مقدر کا پھیر ہے۔ خدا کی رضا پر شاکر رہو۔ اس گھر کو اپنا سمجھو۔ رُوکھی سُوکھی جو کھاتی ہوں دل و جان سے حاضر ہے"۔ مجھے ذری ڈھارس ہوئی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکرانہ کیا کہ "اندھیرے میں شمع تو مل گئی"۔
یہاں زیبا نے ایک لمبی آہ بھری۔ بی بی نے بھی پانسا بدلا۔ اور کہا:۔
"ایسے حالات میں جیتے رہنا تمہارا ہی حصّہ ہے اچھا زیبا۔ پھر کیا ہوا"؟
زیبا نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:۔
"ایک مدّت چین سے کٹ گئی۔ بہن ہمیشہ میری دلجوئی کرتی رہتی تھی۔ مقدر کو ہماری یہ راحت بھی منظور نہ تھی۔
گاؤں میں ہیضہ پھیلا۔ بہن بھینٹ چڑھی گئی اور بہنوئی کی آنکھیں بدلیں۔ میں نے اپنے بڑے بیٹے کو بلوا بھیجا۔ اور ہم وہاں سے چل پڑے۔ پھرتے پھراتے ایک شہر میں پہنچے۔ بیٹا کارخانہ میں ملازم ہو گیا۔ میں بھی مزدوری کرنے لگی۔ ایک روپیہ ماہوار کرایہ پر ایک تنگ و تاریک مکان لے لیا۔ سال گذر گیا۔ ایک دن خبر ملی کہ میری سوکن چل بسی اور دو ننھے بچے چھوڑ گئی ہے۔ دل بھر آیا۔ لیکن بے بس تھی۔ دو مہینے بعد میرے خاوند کی چھٹی آئی۔ لکھا تھا کہ میں بیمار پڑا ہوں۔ ننھے بچے بن ماں کے ہلاک ہوا چاہتے ہیں۔ ساری جمع پونجی اُن کی ماں

کے علاج میں ٹھکانے لگی۔ گھر بار سنبھالنے والا کوئی
نہیں۔ بے یار و مددگار تمہاری راہ دیکھ رہا ہوں۔ آخر میں
یہ بھی لکھا تھا۔

"میں نے تمہارے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا تم میری
بدی کے بدلے نیکی کرو پھر اپنے گھر لوٹ آؤ۔ گھر بار اور
بچوں کو سنبھالو۔ چند دن کا مہمان ہوں۔ میری آخری
گھڑیوں میں میرے اندھیرے گھر کا اُجالا بن جاؤ۔
یہ لکھ رہا ہوں اور آنسو بہ رہے ہیں۔"

خط پڑھنا تھا کہ زندگی بھر کے تمام واقعات
آنکھوں کے سامنے گذرنے لگے۔ بجھے ہوئے جذبات
پھر جل اُٹھے۔ یعنی خالد کے ابا کی ساری بدسلوکیاں بھول
گئیں۔ میرے کہنے پر خالد نے کارخانہ سے چھٹی لی دوسرے
دن ہم دونوں اپنے وطن پہنچے۔ وطن کی ہوا نے دل میں
پھر سرور پیدا کر دیا۔ اپنے گلی کوچے دیکھکر آنسو ٹپک پڑے
گھر کے اندر گئے۔ سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ خالد کا
ابا چارپائی پر پڑا بخار میں کراہ رہا تھا۔ کھانسی دم نہ
لینے دے۔ رنگ پیلا۔ بدن سوکھ کر کانٹا ہو رہا تھا
ہمیں دیکھتے ہی اُچھل پڑا۔ گرتے پڑتے آیا اور میرے
قدموں پر گر پڑا۔ میں نے دلاسا دیا۔ وہ رو رو کر کہتا تھا

"زیبا۔ میں مجرم۔ بہت بڑا مجرم ہوں۔ تم ایک
وفادار پٹھان عورت کی طرح میری تقصیریں
معاف کر دو۔"

میں نے کچھ جواب نہ دیا۔ اسے آرام سے بستر
پر لٹایا اور پاس بیٹھ گئی۔ میرا دل اس کی طرف سے
صاف ہو گیا تھا۔ بہت خدمت کی۔ علاج معالجہ
میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔ لیکن اجل نے آن ہی دبایا
دم توڑنے لگا۔ تو مجھے پاس بلا کر کہا:-

"تم نے میری بہت زیادہ خدمت کی ہے
دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ ایک وفادار عورت اپنے
خاوند کے لئے کیا کیا قربانیاں نہیں کر سکتی
افسوس میں دنیا چھوڑ رہا ہوں اور عمر نے اتنی مہلت
نہ دی کہ تمہارا صلہ ادا کر سکوں۔ میری ایک آخری
التجا ہے مان لو تو قبر میں میں چین سے رہوں گا
وُہ یہ کہ "میرے یہ بچے تمہارے سپرد ہیں"۔ یہ کہا۔
اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گیا۔ دو ماہ کے بعد
خالد بھی داغ مفارقت دے گیا۔ میں بے یار و یاور
رہ گئی۔ پھر بھی ننھے بچوں کو پالا۔ جوان ہو کر انہوں
نے گھر بار سنبھالا۔ میری طرف سے اُن کی نیت
بدلی۔ سوتیلی ماں ہی تو تھی۔ مجھے گھر سے نکال دینے
پر تل گئے میری ساری نیکیاں بھول گئے میں نے
ہزار منت سماجت کی۔ ایک نہ مانی۔ آخر گھر سے نکال
باہر کیا۔ دوسری دفعہ اس گھر سے نکلنا پڑا۔ اور
اب عمر بھر اس میں قدم نہ رکھوں گی۔ ماری ماری
پھرتی رہی پھرتے پھراتے آپ کے ہاں آگئی اور جب
تک دم ہے آپ ہی کے قدموں میں رہوں گی"

(پشتو سے ترجمہ)

ہسپانیہ کا نیلا ڈویژن

کہر سے زمین پتھر ہو رہی تھی اب برف بھی آن جمی ہے۔ بادل زمین کو چھو رہے ہیں۔ ناوگراڈ کے گھنے جنگلوں میں دیار اور صنوبر ساکت کھڑے ہیں۔ قصبۂ پوساد کے آس پاس گڑھوں اور خندقوں میں سینکڑوں آدمی سبز کوٹ پہنے مرے پڑے ہیں۔ کچھ تو برف میں سمٹے پڑے ہیں کچھ خندق کی دیواروں سے لگے کھڑے ہیں۔ ان کے کچلے ہوئے چہروں پر خون کے کالے کالے داغ دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موم کی ڈراؤنی مورتیں ہیں۔ دو آدمی مارے سردی کے ایکدوسرے سے لپٹ گئے تھے اور وہیں ٹھنڈے ہوگئے۔ ایک اپنے بازو پھیلائے پڑا ہے اور اسکی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے وحشت ٹپک رہی ہے۔ ان لوگوں نے ہٹلری اوورکوٹ تو پہنے ہوئے ہیں لیکن جرمن نہیں ہیں۔ اُن کی آستینوں پر کئی کئی رنگ کے نشان ہیں جن پر "ہسپانیہ" پڑھا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہسپانوی نیلے ڈویژن کے سپاہی ہیں۔

اس ڈویژن میں اٹھارہ ہزار سے زائد نفری تھی یہ ڈویژن پچھلے دسمبر مشرقی محاذ گیا تھا۔ فروری کے اخیر تک آٹھ ہزار سے اوپر ضائع گئے کچھ تو مارے گئے۔ کچھ گھائل ہوئے۔ کچھ پکڑے گئے اور کچھ برف سے بیکار ہوگئے تھے۔ بعض کمپنیاں ایسی تھیں جن میں ڈیڑھ سو میں سے تیس تیس ہی رہ گئے تھے۔

جب اس ڈویژن کی بھرتی ہو رہی تھی تو فرینکو کے پٹھو یہ اڑا رہے تھے کہ بالشویکوں کے خلاف رضاکار بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ تھا کہ ہسپانوی فوج کے سپاہی ہی اس ڈویژن میں بھرتی کئے جا رہے تھے۔

اس ڈویژن کی بھرتی کے بارے میں سپین کے وزیر جنگ جرنیل وریلا کی طرف سے ایک خاص حکم صادر ہوا تھا۔ میڈرڈ۔ سیویل۔ سنتاندر کیڈیز اور برگوس کی چھاؤنیوں میں جو احکام پہنچے ان میں صاف لکھا تھا کہ کتنے کتنے افسر اور سپاہی نیلے ڈویژن میں منتقل کئے جائیں۔ جو لوگ بھرتی ہوتے ان سے دلفریب وعدے کئے جاتے تھے۔ سپاہی سے یہ اقرار تھا کہ اُسے ایکہزار (ہسپانی) پسیو یا اسی (جرمن) مارک ماہوار دیئے جائینگے ہسپانیہ جیسے غریب ملک میں یہ رقم بڑی چیز تھی۔ اُن سے یہ بھی وعدہ تھا کہ مزے میں دن گذریں گے۔

اور لڑنا تو پڑے گا ہی نہیں۔ کیونکہ یہ ڈویژن تو مقبوضہ علاقوں میں محض پولیس کا کام دے گا۔

ہسپانیہ سے روانگی سے پہلے انہیں سُرخ ٹوپیاں اور نیلی قمیضیں پہنائی گئیں۔ اچھے خاصے کلاونت نظر آتے تھے۔ جرمنی پہنچے تو سُرخ ٹوپیوں کی جگہ خاکی ٹوپیاں اوڑھنے لگے۔ مشرقی محاذ بھیجتے وقت جرمنوں نے اس ڈویژن کے آدمیوں کو موعودہ الاؤنس وغیرہ ادا کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کرایہ کے ٹٹوؤں کو سوالکی سے ویٹے بسک تک (پانسو میل سے زائد) پیدل ہی جانا پڑا۔ اِلمن جھیل کے شمال کی جانب دریائے والخاف کے شرقی کنارہ پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ اس ڈویژن کو بھی وہاں بھیج دیا۔

اس ڈویژن میں جتنے اعلےٰ افسر تھے وہ سب ہسپانی فوج کا نچوڑ تھے اور نچلے عہدیدار اور سپاہی نرے لفنگے، اوباش اور اچکّے۔ لیکن بہت سے سپاہی بیچارے اَن پڑھ تھے پچیس فیصدی کے لگ بھگ تو ضرور ایسے ہوں گے۔ افسر سپاہیوں کو یہ دَم دیتے تھے کہ رُوسی تو قیدیوں کو زندہ چھوڑنا جانتے ہی نہیں۔ جان چاہتے ہو خوب لڑو۔ سپاہیوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو ہسپانیہ کی جمہوری فوج میں رہ چکے تھے۔ اُن کے بھرتی ہونے کی بس اتنی غرض تھی کہ موقعہ ہاتھ آئے اور ہتھیار سمیت سُرخ فوج سے جا ملیں۔

کہاں ہسپانیہ کی معتدل ہوا کہاں رُوس کی ٹھٹھرن۔ بس کچھ نہ پُوچھئے کیا گذری۔ اس سے تو فاقہ مستی۔ افسروں کی مار پیٹ۔ گندگی۔ جُوئیں یہ سب کچھ بہتر تھا۔ فرانسیسکو سانٹا کروز بیلین ایک قیدی سے ہم نے پُوچھا: "گولی اچھی یا سردی؟" اس نے جواب دیا: "گولی"۔ اس کا متورّم چہرہ بار بار پھڑکتا تھا گویا ہول و ہراس کی تصویر تھا۔ وُہ شخص کہتا تھا: "آدمی کو گولی لگی اور مر گیا۔ لیکن سردی کی موت تو ہزار موتوں کے برابر ہے۔ ہمارے ہاں بھی علیکانٹ میں سردی پڑتی ہے۔ بہت پڑی تو نقطۂ انجماد سے دو تین درجے گر گئی۔ یہاں تو بلا کی سردی ہے۔ بالکل ناقابلِ برداشت ہے"۔

یہ سردی اور نیم گرم وردیاں اور وُہ بھی آگ کی سینک سے جُھلسی ہوئیں اور خندقوں میں رہنے سہنے سے پھٹی پھٹائی۔ جوتے ہیں تو پُرانے۔ ہسپانی بھی واقعی عذاب میں ہیں۔ بعض کُشتوں اور قیدیوں کے پاس سے کچھ چِٹھیاں اور ڈائریاں ملیں۔ ان میں زیادہ تر ایسے فقرے پائے جاتے تھے "ایسی قیامت کی سردی ہے کہ کبھی سان گمان بھی نہ تھا۔ کوسیٹو کو سارجنٹ نے صرف اتنی بات پر گرفتار کر لیا کہ اس نے اپنے کمانڈر کا اوور کوٹ خود اوڑھ لیا اور ڈیوٹی چھوڑ ذرا آگ سینکنے لگ گیا تھا"۔

پوساڈیں اِلمَن جھیل کے کنارے جرمنوں کی ہدائیت کے مطابق بڑے زبردست مورچے بنائے اور جگہ جگہ مشین گنوں کے ایسے محفوظ اڈے بنائے تھے کہ جدھر سے بھی دشمن گاؤں کی طرف بڑھے ادھر ہی گولیاں برسنے لگیں۔

ایک رُوسی افسر (میجر قازانتسیو) کو حکم ہُوا کہ ہسپانیوں کو مار بھگائے۔ اس کے ساتھ ساتھ کمانڈر لیگورووڈلیسیو کی کمان میں توپخانہ بھی بڑھا۔ ذرا گولے برسے اور سنگینوں کے وار ہُوئے اور ہسپانی چمپت ہُوئے اور جو بیس توپیں۔ پانچہزار گولے۔ پانچ لاکھ کارتوس اور بہتیرا سامان چھوڑ گئے۔ جو رہ گئے وُہ گھر گئے۔ موت سامنے کھڑی تھی۔ جان پر کھیلا کئے۔ غرض اس نیلے ڈویژن کی داستان بھی ختم ہُوا چاہتی ہے ؛

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہُوا پیچ و تاب میں
کیا جانے لکھدیا اُسے کیا اضطراب میں

ذوقؔ

نظر لگے نہ کہیں اُن کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

غالبؔ

بعد فنا بھی سوزِ دروں کا یہ رنگ ہے
کملا گئے ہیں پھُول ہمارے مزار کے

آغا شاعرؔ

کہتے ہیں آ گے تھا بتوں میں رحم
ہے خدا جانئے یہ کب کی بات

میرؔ

حسرت پہ اس مسافرِ بیکس کے روئیے
جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

مصحفیؔ

تسلّی دم واپسیں ہو چکی
ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

مومنؔ

آپ سے، ہم سے، رنج ہی کیا
مُسکرا دیجئے صفائی ہے

جوشؔ

خدا جانے مجھے کیا ہو گیا ہے
خرد بیزار دل سے دل خرد سے

اقبالؔ

ایک آفت سے تو مر مر کے ہُوا تھا جینا
پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

سوزؔ

بربادِ رفتگانِ محبت کی خاک ہے
اے قیس دشت میں یہ بگولا نہیں اُٹھا

نصیرؔ

دَ هسپانیه نیلی پوش ډویژن، مشرقی محاذ ته دَ روانیدو په وخت - (سنه ۱۹۴۱ء)
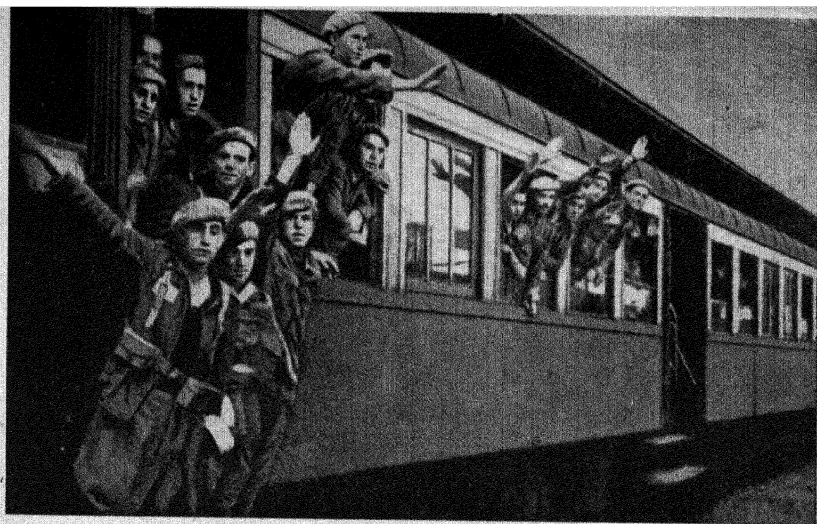
سنہ ۱۹۴۱ء - ہسپانوی نیلا ڈویژن رُوسی محاذ کو جارہا ہے -

رُوسی محاذ ته دَ رسیدو نه پس دَ نیلی پوش ډویژن انجام -

رُوسی محاذ میں اس نیلے ڈویژن کا حشر -

پشتو رسم الخط

("پشتو رسم الخط" پر خاصی بحث چھڑ گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے مقالے اور مراسلے پہنچ چکے ہیں۔ جنہیں ہم بشرط ضرورت و گنجائش شایع کرتے رہیں گے۔ میاں سید رسول صاحب بی اے بی ٹی۔ اور پروفیسر محمد علیخان صاحب ایم اے کے مضامین گذشتہ اشاعتوں میں درج کئے جا چکے ہیں۔ اب ہم ڈاکٹر سید انوار الحق صاحب کے محققانہ مضمون کا اردو ترجمہ شایع کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب موصوف بارہ سال سے اپنی پشتو جامع اللغات کی تالیف میں مصروف ہیں۔ پشتو زبان کے متعلق آپ کے کئی بصیرت افروز مقالے ہمعصر "اتحاد افغان" (لدھیانہ) میں شایع ہوتے رہے ہیں۔ امید ہے کہ قارئین کرام اس مقالہ کو غور سے پڑھیں گے۔ ہم ڈاکٹر صاحب موصوف کے آیندہ مقالوں کا پر شوق انتظار کرینگے۔ (ادارہ)

"نن پرون" مورخہ ۲۵ رجون میں پشتو رسم الخط کے موضوع پر مولانا عبد القادر صاحب کا مضمون نظر سے گذرا۔ مولانا صاحب تقاضائے وقت کے مطابق پشتو رسم الخط کے چند حروف میں ترمیم و تنسیخ کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ دوسری قوموں کی دیکھا دیکھی پشتون قوم بھی اپنی زبان کی ترقی کے لئے کوشش کرے۔

صاحب موصوف یہ بھی چاہتے ہیں کہ پشتو زبان پر غور و خوض کے بعد جامع اصول مرتب کئے جائیں۔ اُن کے نزدیک چار باتیں ایسی ہیں۔ کہ اگر اُن کے بارے میں اس وقت کوئی قطعی فیصلہ کیا جائے۔ تو ایک بڑا کارنامہ ہوگا وہ باتیں یہ ہیں:-

۱۔ وہ حروف جو لکھے ایک طرح جائیں اور بولے اور طرح زبان سے نکال دیئے جائیں اور حروف جیسے بولے جاتے ہوں ویسے ہی لکھے جائیں۔

۲۔ پشتو رسم الخط اردو نستعلیق کے مطابق ہو کیونکہ ایسی صورت میں (ا) پٹھانوں کا موجودہ نفاق اور انتشار جاتا رہے گا۔ آیندہ نسلوں میں رشتہ محبت قایم ہو جائیگا اور قلبی اور ذہنی تعلقات استوار ہو جائیں گے۔ (ب) پشتو زبان اردو اور فارسی میں جذب ہو جانے سے بچ رہے گی۔ (ج) پشتو بولنا اور لکھنا سہل ہو جائے گا۔ (د) حروف تہجی کم ہو جائینگے اور (ہ) سب سے اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ پشتو پٹھانوں کی ایک واحد علمی اور ادبی زبان ہو جائے گی۔

حسب ظاہر یہ تحریک بھی معقول ہے اور اس کے دلائل بھی معقول ہیں۔ یہ ایک عوت فکر ہے۔ اور امید کی جاتی ہے کہ پشتو کے علماء اور ادباء اپنے

زرّین خیالات سے قوم کو مستفید کرینگے ۔ یہ مسئلہ نہایت اہم اور توجہ طلب ہے ۔ صوبہ سرحد اور افغانستان کی پبلک اور حکومتیں اس مسئلہ پر پوری توجہ صرف کر رہی ہیں ۔ اگر شروع ہی میں پورا سوچ بچار ہو جائے تو اسے اس مسئلہ کا آدھا حل سمجھ لینا چاہیئے ۔ میں نہ عالم ہوں نہ شاعر نہ ادیب ۔ البتہ یہ مضمون پڑھکر کچھ باتیں سوجھیں جن کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں ۔

دس بارہ برس ہوئے ہندوستان میں اردو رسم الخط کے لیے نستعلیق معین کرنے کا مسئلہ چھڑا تھا ۔ غرض یہ تھی کہ اردو حروف تہجی میں سے ہم آواز حروف نکال دیئے جائیں (یعنی ہم آواز حروف میں سے صرف ایک ایک حرف رہنے دیا جائے) تاکہ اردو الفاظ کی ترکیب اور بندش میں سہولتیں پیدا ہو سکیں اخبارات میں عرصہ تک لے دے رہی ۔ آخرش ٹیں ٹیں فش بات جہاں تھی وہیں رہی ۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کسی زبان کو بدلنا کسی ایک آدمی کا کام نہیں بالخصوص ایسی قلیل مدت میں تو اور بھی دشوار ہے ۔

تحریر کی ایجاد کا یہ مقصد بتایا جاتا ہے کہ جو کلمے زبان سے نکلیں وہ آنکھوں سے بھی دکھائی دیں یعنی وہ آواز ۔ وہ حروف ۔ وہ الفاظ ایسے محفوظ ہو جائیں کہ پڑھنے والا جب چاہے انہیں محرر کے لب و لہجہ میں نہایت آسانی سے پڑھ سکے اور ان جملوں اور فقروں کو بھی اچھی طرح سمجھ سکے ۔ یہ مقصد اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ رسم الخط جامع ہو ۔ اور اس میں ہر قسم کی آواز ۔ آواز کے انداز اور زیر و بم کے باریک سے باریک تغیرات کیلئے نشانات اور علامات موجود ہوں ۔ یہ بات بھی مدنظر رہے کہ بولنا لکھنے پر مقدم ہونا چاہیئے یعنی کتابت تلفظ کے تابع ہو ۔ اس وقت اردو رسم الخط فارسی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے اور پشتو رسم الخط عربی رسم الخط سے ۔ پشتو زبان قدیم ہندی ۔ فارسی اور عربی کلمات سے مرکب ہے اور پشتو کی تکمیل میں ان تینوں زبانوں کا مساوی حصہ رہا ہے ۔ اس لئے پشتو حروف تہجی میں ان تینوں کے حروف تہجی شامل ہونے چاہئیں ۔

کوئی زبان لے لیجئے ۔ اس میں بہت سے تو ایسے حروف ملیں گے ۔ جو دوسری زبان میں بھی موجود ہیں لیکن بعض حروف یا ان کے مجموعے ایسے ہوتے ہیں جو اسی زبان میں پائے جاتے ہیں اور اس کی مقامی ضرورتوں کے مطابق مخصوص شکلیں اختیار کر لیتے ہیں ۔ پشتو زبان میں بھی چار مخصوص حروف ہیں اور اس کے حرف تہجی میں آٹھ حروف ایسے ہیں جو محض اس زبان میں پائے جاتے ہیں لیکن ان آٹھوں حرفوں میں سے چار ایسے ہیں جو بالکل الگ دکھائی دیتے ہیں مثلاً ټ ۔ ډ ړ اور ګ ۔ یہ حروف عربی زبان سے لئے گئے تھے جب کہ پشتو میں اردو ۔ فارسی رسم الخط موجودہ ترقی نہ کر سکا تھا ۔ اب جب کہ ان چاروں حروف کی شکلیں معین

ہو چکی ہیں۔ اور اُن کی آوازوں میں اختلاف بھی نہیں رہا۔ مناسب نظر آتا ہے کہ پشتو زبان ان اشکال کو تسلیم کرلے۔ یہ چار حروف ٹ۔ ڈ۔ ڑ اور گ ہیں دُوسرے چار حروف میں صوری اختلاف ہی نہیں بلکہ صوتی اختلاف بھی ہیں اور یہ حروف خاص ضروریات کو پورا کرتے ہیں۔ مثلاً ځ۔ ښ۔ ږ۔ ښ۔ ان میں سے آخری دو حروف خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ وُہ اس لئے کہ "ژ" اور "ش" کے تلفظی اختلاف کی بنا پر پشتون قوم کے دو طبقے ہو گئے ہیں۔ ایک طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو "ژ" اور "ش" کا تلفظ ان کی اصل آواز کے مُطابق کرتے ہیں۔ دوسرے طبقہ کے لوگ "ژ" کو "ج" یا "گ" اور "ش" کو "خ" یا "ے" تلفظ کرتے ہیں یہ اختلاف ایک قدرتی امر ہے۔ دونوں طبقے بلحاظ تعداد کافی اہمیت رکھتے ہیں اور اُن میں سے کوئی ایک نظر انداز کیا نہیں جا سکتا۔ جس طرح ایک یوسفزئی "ڈلئی" کو "گلئے" اور "ژ وند" کو "جوند" تلفظ کرنے میں آزاد ہے۔ اسی طرح ایک خٹک "یکبنی" کو "یکئے" یا "کبنیہ" کو "کشینہ" اور "ماښام" کو "ماشام" بولتا اور لکھتا ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کو روک نہیں سکتا اور نہ ہی روکنے کی کافی وجہ پائی جاتی ہے۔ بھلا کس قانون یا ضابطہ سے کسی کو مجبور کیا جا سکتا ہے کہ وہ منہ سے تو "ژامہ" کہے اور لکھے "حامہ"۔ کہے "میشہ" لکھے "میخہ" یا (جیسا کہ یوسفزئی) کہے "خانہ" اور لکھے "شہر"۔ جیسے پنجابی میں ایک مثال ہے کہ م ریش = مُر + غین سے زیر = غی = گکڑی۔

اسکے علاوہ پشتو حروف تہجی میں چند ہم آواز حروف اور بھی ہیں جو اُردو۔ فارسی اور عربی میں یکساں طور پر مستعمل ہیں۔ مثلاً (ا - ع) و (ث - خ - س - ص) و (ځ - ذ - ز - ض - ظ) و (ح - ه) ا - ع میں اور ح - ہ کی آوازوں میں ہلکا سا فرق ہے۔ دوسرے حروف کی آوازیں بہت ملتی جلتی ہیں۔ اگر میں یہ سمجھ بیٹھوں کہ مجھے اپنی مادری زبان میں ترمیم اور تنسیخ کرنیکا حق حاصل ہے اور "ځان" کی جگہ "زان" اور "ځیرے" کی جگہ "سیرے" لکھنا شروع کردوں۔ تو ہر اہل زبان کو حق حاصل ہوگا کہ وہ "ځوان"۔ "ذات" "ضامن"۔ "ظلم" وغیرہ الفاظ "ز" سے یعنی "زوان"۔ "زات"۔ "زامن"۔ "زلم" لکھے۔ "طور" کو "تور"۔ اور "ثالث"۔ "ثاور" اور "صاحب" کو "س" سے یعنی "سالس" "ساور" اور "ساحب" لکھے۔ "حرام" کو "ہرام"۔ "عقل" کو "اقل" اور "ضلع"۔ "موضع" کو "زلا" اور "موزا" یا "زلہ" اور "موزہ" لکھے۔ آپ خود ہی سوچیں کہ اس آزادی کا کیا انجام ہوگا۔

۱۔ وُہ الفاظ جو لکھے ایکطرح اور پڑھے دوسری طرح جاتے ہیں۔ بعض ترقی یافتہ زبانوں سے چند ایسی مثالیں پیش کرتا ہوں جن میں کلمات کے تلفظ اور تحریر میں اختلاف ہے۔ عربی میں "ا"۔ "ل"۔ "ال"

"دو" "دوی" "د" "و" "ی" لکھے ایک طرح جاتے ہیں اور پڑھے جاتے
ہیں اور طرح۔ یا بعض موقعوں پر لکھے تو جاتے ہیں لیکن پڑھے نہیں
جاتے۔ عربی میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں۔ ڈکشنری اُٹھا کر دیکھئے
تو آپ کو ہزاروں انگریزی۔ فرانسیسی۔ روسی۔ جرمنی اور
اطالوی الفاظ ایسے ملیں گے جن کے تلفظ اور تحریر میں ذرہ
بھر تعلق نہیں۔ طوالت کے خیال سے چند مثالوں پر قناعت
کرتا ہوں۔ ان زبان والوں کے دل میں ابھی تک یہ خیال
نہیں آیا کہ وہ "اولو الامر" کو "اُل امر"۔ "ذوالقرنین"
کو "زلقرنین" اور "مشکواۃ" کو "مشکات" لکھتیں
انگریزی زبان جو آجکل معراج ترقی پر ہے اور
علم کے ہر شعبہ پر لاکھوں کتابیں رکھتی ہے اس میں ابھی
تک ایسے بھی الفاظ ہیں جو لکھنے اور بولنے میں بالکل
مختلف ہیں۔ مثلاً DOUCHE کو DOOSH

KNOWLEDGE کو NOLEJ

PNEUMA کو NUMA

پڑھتے ہیں۔ ہندی میں लक्ष्मी لکھی۔ لچھمی
اور لکشمی پڑھا جاتا ہے۔

۲۔ پشتو اور اُردو رسم الخط تمام قابل ذکر زبانوں
کے اپنے اپنے مخصوص رسم الخط موجود ہیں۔ گو ایک
زبان دوسری زبان کے رسم الخط میں بھی لکھی جا سکتی
ہے۔ اگر پشتو زبان کو اُردو رسم الخط میں ادا کیا جائے
تو چنداں ہرج نہیں۔ قدیم کتابوں کے مطالعہ
سے پایا جاتا ہے کہ کبھی پشتو فارسی رسم الخط میں لکھی
جاتی تھی۔ لیکن اب مدت سے لوگ موجودہ رسم الخط سے آشنا
ہو چکے ہیں۔ اُردو نستعلیق کا ٹائپ بھی ابھی تک تیار نہیں ہوا ہے،
اگر ہو بھی تو رائج نہیں ہو سکا۔ برخلاف اسکے عربی کا مکمل
ٹائپ موجود ہے اگر اس میں چار پشتو کے زائد حروف
بڑھا دیئے جائیں تو پشتو کیلئے بھی بخوبی استعمال ہو سکتا ہے اور
ساتھ ہی یہ کہ چھپائی میں بھی بہت آسانی رہے گی۔

(ا) اگر موجودہ رسم الخط پٹھانوں کے موجودہ نفاق
اور انتشار کا باعث ہے تو رسم الخط سے پہلے تلفظی
اختلاف کا دُور کرنا ضروری ہے کیونکہ بولنا لکھنے پر ہر حالت
میں مقدم ہے۔

(ب) جب تک پشتو کا مخصوص رسم الخط ہے۔ پشتو
فارسی اور اُردو میں مدغم ہونے سے بچ سکتی ہے اُردو
اور فارسی رسم الخط پشتو سے علیحدہ ہے اگر پشتو
رسم الخط سے یہ خصوصیت جاتی رہے اور
اس میں سادگی اور عامیت آجائے تو یقیناً پشتو اپنی
انفرادی حیثیت کھو بیٹھے گی۔

(ج) اور زبانوں سے چند حروف کا زیادہ ہونا
پشتو زبان کے لکھنے اور پڑھے جانے میں کوئی
دقت کا باعث نہیں۔ اصلی دقت یہ ہے کہ صحیح
تلفظ کے لئے پشتو کے حروفِ تہجی نامکمل ہیں۔
اور نہ ہی اعراب و سکنات یعنی زیر۔ زبر۔ پیش
وغیرہ کافی ہیں۔ مثلاً "شوے" کے چار معنی ہیں
اور اس کے تلفظ ہی سے معنی بدلتے ہیں۔

(۱) "دکارشو ے دے" ۔کام ہوا ہے) (۲) "تہ دخہ شوئے" ۔تم کہاں گئے)
(۳) دہ ما لیکلے شوے نوشتہ بہ دہ ۔(اگر میں لکھ سکتا تو اچھا ہوتا)۔
(۴) دا دے شوے و نہ دہ ۔(یہ شیشم کا درخت ہے)۔اسی طرح لفظ "تلہ" چار معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔
(۱) تہ غنم تلہ (تم گیہوں تولو) (۲) تلہ خہ شوہ (ترازو کیا ہوا)
(۳) ھغہ نن تلہ حو ما پاتے کرو (وہ آج جاتا تھا لیکن میں نے اُسے روک لیا)
(۴) ھلتہ تلہ پکار دی (وہاں جانا چاہیئے)۔اسی طرح اور کئی الفاظ ہیں جو لکھنے میں ایک ہیں لیکن ان کا تلفظ مختلف ہوتا ہے۔اور مختلف تلفظ سے لفظ کے معنی بدلتے رہتے ہیں۔

(د) بشر کا اشرف المخلوقات ہونا محض اسلیئے نہیں کہ وہ قوت ناطقہ رکھتا ہے بلکہ اسمیں قوت ناطقہ کے علاوہ اور دماغی قوتیں از قسم عقل وشعور بھی ہیں۔

بولنے میں معنی پیدا کرنا اور بات کو خود سمجھنا اور دوسروں کو سمجھانا دماغی قوت پر موقوف ہے۔یہی صفت ہے جو انسان کو حیوانات پر ممتاز کرتی ہے۔بشری دماغ میں ایک قوت حافظہ بھی ہے۔اس قوت سے بشر نے کئی زبانوں کے حروف سیکھے اور یاد کیئے۔پشتو کے چالیس حروف یاد کرنا کونسی بڑی بات ہے سنسکرت اور جنوبی ہندوستان کی زبانیں اور بالخصوص چینی زبان بیشمار حروف پر مشتمل ہے لیکن کروڑوں انسانوں کو ان زبانوں پر عبور ہے۔میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ رسم الخط اظہار خیالات کا محض ایک ذریعہ ہے۔زبان آسان ہو تو اس کا لکھنا بھی آسان ہوتا ہے۔زبان آسان نہ ہو تو اس کا لکھنا بھی مشکل۔عرب لوگ حروف "پ۔ٹ۔ چ ڈ۔ڑ۔ژ۔گ وغیرہ نہیں بول سکتے اسلیئے عربی رسم الخط میں یہ حروف نہیں ہیں۔عربوں کے بالمقابل ہندوستانی ان سب حروف کو ادا کرتے ہیں اور انکے علاوہ اور بھی پیچیدہ آواز بن حلق سے نکالتے ہیں اسلیئے ہندوستانی میں یہ حروف موجود ہیں۔اگر پشتو زبان بھی ضرورت وقت سے مجبور ہوکر اپنی انفرادی حیثیت قایم رکھنے کیلیئے دو چار حروف وضع کرے تو انہیں نکال باہر کرنا مناسب نہیں۔

یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ پشتو زبان کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔یہانتک کہ پشتو کی کوئی ایسی مستند لغات بھی موجود نہیں جو کسی اہل زبان کی مرتب کی ہوئی ہو جو ہماری زبان کا معیار ہو اور لغوی تنازعات میں حکم ناطق رکھتی ہو۔مناسب ہے کہ ہم اپنی زبان کا صحیح جائزہ لیں اور معلوم کریں کہ یہ کس قسم کی زبان ہے۔اسمیں کیا کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں فنی حیثیت سے اس کا کیا پایہ ہے۔ادبیات میں اُسنے کیا کچھ پیدا کیا ہے۔مختلف قبایل کی زبانوں میں کتنا اختلاف ہے اور اس اختلاف کی بنا پر ہم زبان کو کتنے حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

ہمیں چاہیئے پشتو کی مستند اور صحیح تاریخ مرتب کرنے کے لئے تمام ذرایع فراہم کریں۔میں خود بارہ سال سے اپنی "جامع اللغات" کی تالیف میں لگا ہوا ہوں۔اس طولانی تحقیقات سے میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ پشتو ایک وسیع زبان ہے۔صرف لفظ "اُبہ" (پانی) کی کئی سو ترکیبیں فراہم کرچکا ہوں۔اسی طرح "زڑہ" (دل) کے کوئی

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر دیکھو)

دیوارِ چین

پرانے زمانہ میں بشر نے اپنے بچاؤ کے لئے بڑی بڑی دیواریں بنائیں۔ ان میں سے اچھی بُری حالت میں بہت سی اب بھی موجود ہیں۔ لیکن سب سے بڑی دیوار چین میں ہے اور اُسے "دیوارِ چین" کہتے آئے ہیں۔ اس دیوار کو شی ہوانگی خاقان چین نے میلاد مسیح سے تین سو برس پہلے بنوانا شروع کیا۔

غرض یہ تھی کہ چین کو اس زمانہ کے مغلوں اور تاتاریوں کی لوٹ مار سے نجات ملے۔ شاہان مینگ کے عہد میں اس دیوار کی نہ صرف مرمت ہوئی بلکہ اسکی توسیع بھی کی گئی۔ گیارہویں صدی میں پھر اس کی مرمت ہوئی اور سولہویں صدی میں یہ دیوار تین سو میل اور بڑھا دی گئی۔

یہ دیوار بحیرۂ زرد سے صحرائے گوبی کے درمیان تک جا نکلی ہے۔ پرانی روایتوں کے مُطابق تو اس دیوار کی لمبائی پانسو فرسنگ تھی لیکن تحقیق سے پایا گیا کہ اس کی لمبائی تین سو دس فرسنگ ہے جو ایک ہزار پانسو تیس میل ہوتی ہے اس کی اونچائی سات سے دس گز ہے۔ ہر دو سو گز کے بعد تیرہ گز اونچا ایک بُرج بنا ہُوا ہے۔ اس دیوار کی اوپر کی سطح چار گز چوڑی ہے لیکن زمین کے پاس اس کی چوڑائی آٹھ گز ہو جاتی ہے۔

یہ دیوار اُونچے اُونچے پہاڑوں اور درّوں کو عبُور کرتی ہُوئی وادیوں اور بیابانوں میں سے گذرتی ہے۔ کہیں کہیں تو سطح سمندر سے کوئی ڈیڑھ ہزار گز کی اُونچائی پر پائی جاتی ہے اور بادلوں میں چھپی رہتی ہے یہ دیوار کہیں تو چور رُخے سنگ سماق کی بنی ہوئی ہے کہیں بڑے بڑے ناتراشیدہ پتھروں کی۔ پیکن سے لیکر دریائے ہوانگ ہو تک ایک کی بجائے دو متوازی دیواریں ہو جاتی ہیں۔

پرانے زمانہ میں تقریبًا ایکہزار سپاہی اس دیوار کی حفاظت کیلئے مقرر ہوتے تھے اب بھی بہت سے نقاط پر فوجی چوکیاں بنی ہوئی ہیں۔

اہرام مصر سے مقابلہ کیا جائے تو دیوار چین کی عظمت کا دُرست اندازہ لگ سکتا ہے۔ اہرام مصر (کیوپس) کا رقبہ تیس لاکھ مکعب میٹر ہے اور اس دیوار کا تیس کروڑ مکعب میٹر۔ یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ ایک لاکھ مزدور تیس برس روزانہ کام کرتے رہے تب اہرام مصر بنا۔

تصوّر فرمائیے کہ اس دیوار کی تعمیر میں کتنے مزدُور کتنی مدّت تک مصرُوف رہے ہونگے!

ـــــــــــــ ٭ ـــــــــــــ

پندرہ روزہ رسالہ اردو

سال دوم	۲۵ اگست ۱۹۴۲ء	فہرست	۱۲ شعبان المعظم ۱۳۶۱ھ	نمبر (۸)

(خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے)

ایڈیٹر :- نن پرون (اردو ایڈیشن) راجپور روڈ - دہلے

مرزا غالب

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا ہے پرِ مُرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا رُوح تو، بزمِ سخن پیکر ترا زیبِ محفل بھی رہا، محفل سے پنہاں بھی رہا
دید تیری آنکھ کو اُس حُسن کی منظور ہے
بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

محفلِ ہستی تری بربط سے ہے سرمایہ دار جس طرح ندی کے نغموں سے سکوتِ کوہسار
تیرے فردوسِ تخیّل سے ہے قدرت کی بہار تیری کشتِ فکر سے اُگتے ہیں عالم سبزہ وار
زندگی مضمر ہے تیری شوخیٔ تحریر میں
تابِ گویائی سے جُنبش ہے لبِ تصویر میں

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لبِ اعجاز پر محوِ حیرت ہے ثرّیا رفعتِ پرواز پر
شاہدِ مضموں تصدّق ہے ترے انداز پر خندہ زن ہے غنچۂ دلّی گُلِ شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہُوئی دِلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہمنوا خوابیدہ ہے

لُطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں ہو تخیّل کا نہ جب تک فکرِ کامل ہمنشیں
ہائے! اب کیا ہوگئی ہندوستاں کی سرزمیں آہ! اے نظّارہ آموزِ نگاہِ نکتہ بیں
گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے
شمع یہ سودائیِ دل سوزیِ پروانہ ہے

اے جہاں آباد! اے گہوارۂ علم و ہنر ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرّے ذرّے میں ترے خوابیدہ ہیں شمس و قمر یُوں تو پوشیدہ ہیں تیری خاک میں لاکھوں گہر
دفن تجھ میں کوئی فخرِ روزگار ایسا بھی ہے؟
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے؟

اقبال

ویمر: جرمنی کا مشہور شاعر گوئٹے اس جگہ مدفون ہے

رشتۂ تارِ نظر دیدۂ وحدت بیں سے ٭ ہم نے شیرازۂ مجموعۂ عالم باندھا

(صبا)

نن پرون

وحدانیت

خدا کی وحدانیت میں کیسے شک ہو سکتا ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے کہ وُہ ایک ہے اور اس کے برابر اور کوئی نہیں۔ میری مختصر سی زندگی میں فقط یہی بات میرے ذہن نشین ہو چکی ہے جس پر میرے فہم و ادراک اور احساسات کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ غالباً انسانی زندگی کی مذہبی۔ ذہنی۔ اجتماعی اور سیاسی ارتقاء میں پہلا تصور یہی ہو سکتا ہے جو ایک معصوم بچّے کے ذہن میں نقش اولیں بن کر ٹھہر جائے۔ باقیماندہ تصورات تو انسان کے آیندہ ماحول۔ تعلیم۔ تفکّر اور تدبّر کا نتیجہ ہیں۔ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی خواہ اس کا تعلق اس کی رُوحانیت یا ذاتی علم۔ فکر اور حکمت سے ہو یا اس کی سیاسی اور بین الاقوامی زندگی سے ہو بہرحال یہ چیزیں بعد میں پیدا ہوتی ہیں اور نشو و نما پا کر افراد۔ اقوام بلکہ کائنات کے نظام پر عملاً اثر انداز ہوتی ہیں۔ مختصر یہ کہ احسن الخالقین کی اس تمام کائنات میں بنیادی اور اصُولی تصور یہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شارعِ اسلام نے یہ حکم صادر فرمایا ہے کہ بچے کے پیدا ہوتے ہی اُس کے کان میں لا الٰہ الا اللہ کی آواز پہنچا دی جائے۔ تاکہ اس نئی رُوح کی زندگی کی تعمیر میں سنگِ بنیاد ہو کر رہے۔

قارئین کرام کا تو میں کہہ نہیں سکتا۔ باوجود اس تھوڑی بہت دینی اور دنیوی تعلیم کے نہ تو میں اس حقیقت کی تہ کو اچھی طرح پہنچ چکا تھا اور نہ کلی طور پر یہ محسوس کر سکا تھا۔ بلکہ عقیدتاً یہ تصور میری زندگی کا جزو لاینفک بنا ہوا تھا۔ میں اس راز کو نہ سمجھ سکتا تھا کہ خدا کو واحد لاشریک سمجھنا صرف اقرار باللسان تک محدود نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھنا اور اس کا کما حقہٗ احساس کرنا اصل چیز ہے۔ اس کا صحیح تصور دل میں آتے ہی انسان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اور انسان پر یہ راز افشاء ہو جاتا ہے کہ وہ حالات اور واقعات جو انسان کو اپنے خویش و اقارب بلکہ تمام کائنات کے نظام ترکیبی پر اثر انداز ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں حقیقت میں وحدانیت کے اس جامع تصور کا پرتو بلکہ ایک عملی مظاہرہ ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ ہماری فکر سے بالا و برتر اور ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے جونہی خداوند کریم کا فضل شامل حال ہوا اور انسان کا دل و دماغ ذات باری کی وحدانیت کے تصور سے منور ہوا تو وہ اپنی کج فکری پر ششدر ہو کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً اگر ایک شخص اپنے کان اور آنکھیں بند کر لے۔ تو یقیناً وہ باغ میں پھولوں کی چمک دمک اور بلبلانِ خوش نوا کے چہچہوں سے بے بہرہ رہیگا جب اپنے کان اور آنکھیں کھول دے اور اپنے ماحول کو سمجھنے اور محسوس کرنے لگے تو اس پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ کس قدر تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔

میری منشا اس مسئلے کو چھیڑنے سے یہ نہیں کہ اس پر فلسفیانہ نکتۂ خیال سے بحث کی جائے کیونکہ یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس ساری کائنات کا خالق صرف ایک ہے

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ خداوند کریم کی وحدانیت کا جو ردِ عمل عملاً انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر ہوتا ہے۔ اُسے کھول کر بیان کیا جائے۔ یعنی اگر انسان اس خدائی نظامِ کائنات کو بنظر غائر ملاحظہ کرے تو نظام شمسی یعنی سورج۔ چاند تارے۔ زمین و آسمان وغیرہ کی معین اور منظم حرکات خدا کی وحدانیت کے اصول کو ثابت کرتے ہیں۔ نظام شمسی کے یہہ اراکین ابتدائے آفرینش سے قدرت کی خاص منشا کو پورا کرتے آئے ہیں۔ اگر کوئی یہ کہدے کہ آج سورج بجائے مشرق کے جنوب سے نکل کر شمال میں جا چھپا یا چاند کی جگہ آج رات مشتری چاند کے فرائض ادا کر رہا تھا یا کہکشاں رات کو آسمان پر جلوہ افروز نہیں ہوا یا آسمان کا اپنا رنگ سبز سے زرد ہو گیا یا زمین اڑ کر چلی گئی تو کون نادان ایسی باتوں کو باور کر سکے گا یہ توقع تو پاگل سے بھی نہیں ہو سکتی۔ کائنات عالم کے یہ کارکن روز ازل سے جس کام پر مامور ہیں ممکن نہیں کہ اپنے معیّنہ فرائض منصبی سے سرمو ہٹے ہوں۔

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ نظام عالم صرف ایک اصول کے تحت چل رہا ہے۔ اور وہ اصول وحدانیت ہے جس سے زمین۔ آسمان۔ سورج۔ چاند سب اپنی اپنی جگہ پر ایک ہی اصول کے ماتحت کام کر رہے ہیں۔ اور لاکھوں برس سے دن رات۔ گرمی سردی ایک ہی اصول سے آتے جاتے ہیں۔ خالق حقیقی نے فرمایا ہے

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا

اگر دنیا میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو زمین اور آسمان کا نظام

بگڑ جاتا) اللہ تعالیٰ بار بار اس اصول کی طرف اپنی مخلوق کو متوجہ فرماتا ہے۔ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۔ ترجمہ:۔ (زمین اور آسمان کی پیدائش اور دن رات کے اختلاف میں بہت نشانیاں ہیں جس سے صاحب فہم لوگ سبق لے سکتے ہیں)

پھر فرماتا ہے:۔ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ یَسْجُدَانِ ۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَھَا لِلْاَنَامِ فِیْھَا فَاکِھَۃٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَکْمَامِ ۔ ترجمہ۔ (جب چاند اور سورج باقاعدہ نکلتے اور غروب ہوتے ہیں تارے اور درخت سربسجود ہیں اور میں نے زمین بنائی ہے سب مخلوق کے لئے جس میں ہر قسم کے پھل ہیں اور کھجور کے خوشے ہیں)۔

اس کے بعد حیوانات اور دیگر علامات کی تخلیق کیطرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ اَفَلَا یَنْظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیْفَ رُفِعَتْ وَاِلَی الْاَرْضِ کَیْفَ سُطِحَتْ ترجمہ۔ (کیا لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اونٹ کیسے پیدا ہوا اور آسمان کیونکر اونچا رکھا گیا ہے اور زمین کیونکر نیچی رکھی گئی ہے)۔ قصہ مختصر خداوندکریم نے تخلیق اشیا کائنات اور وظائف کائنات کی طرف بار بار انسان کی توجہ منعطف کرا کر بتاتا ہے کہ اس ساری کائنات میں توحید عمل کارفرما ہے اور اس میں ذرا سا فرق پیدا ہو جائے تو تمام شیرازہ بگڑ جائے گا۔

اللہ تعالیٰ انسان کی توجہ اپنی علامات کی طرف مبذول کرنے کے بعد فرماتا ہے "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا" خدا کے سمجھدار بندے سمجھتے ہیں کہ ان تمام آیات الٰہی کا عالم وجود میں آنا بیہودہ نہ تھا بلکہ انسان کی زندگی پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس توحید عمل کا اثر بھی انسان کی زندگی پر ضرور پڑ رہا ہے بلکہ یوں کہئے کہ انسان کی زندگی کے ہر ایک شعبہ میں اس کو کارفرما ہونا چاہئے۔ کیونکہ کائنات کے دائرہ میں رہ کر اگر وحدت عمل کے اصول کا اطلاق اس پر نہ ہو سکے تو انسان کی ہستی ہیچ ہے اس لئے کہ اس نظام ہست و بود میں کوئی چیز اس زمرہ سے باہر نہیں۔

قرآن مجید انسانی زندگی اور نظام کائنات کے درمیان گہرے تعلق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَھُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ ۔ ترجمہ (قریب ہے کہ ہم دکھائیں اپنی تمام نشانیاں اس جہان میں اور ان کے اپنے نفسوں میں یہاں تک کہ ان پر یہ صاف ظاہر ہو جائے کہ یہ سچ ہے) کانٹ فلاسفر نے اس کی تصدیق یوں کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ

"کائنات عالم میں اس کو دو چیزوں نے متحیر کر رکھا ہے ایک روشن ستاروں سے منور آسمان اور دوسری انسان میں ودیعت شدہ اخلاقی اصول"!

ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس عالم بالا کے نظام اور انسانی نظام کی بنیاد ایک ہے۔ اور یہی اصولی وحدت تمام دینی اور دنیوی کاموں میں یکساں نظر آ رہا ہے۔

سورج۔ چاند۔ زمین۔ آسمان۔ حیوانات اور نباتات کی دنیا سے ذرا ہٹ کر اپنی زندگی پر ایک غور کی نظر ڈالیں

کہ یہ اصول وحدت ان پر کہاں تک اثر انداز ہے۔ دنیا کی کثیر آبادی کا آغاز ایک ہی ماں باپ سے ہوا۔ پس جو لوگ خواہ ایک گھر میں پیدا ہوئے ہوں یا ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں یا ایک ہی قصبہ یا شہر میں رہتے ہوں یا ایک ہی قوم کے جزو ہوں اس زریں اصول پر کاربند ہوں گے وہ ہمیشہ مرفع الحال۔ سرفراز اور ممتاز ہوں گے

برعکس اس کے اگر ایک باپ کی موجودگی اور سرپرستی میں گھر آباد ہے۔ غلہ بافراط ہے میوہ دار درخت بھی ہیں۔ مہمان نوازی اور دیگر مذہبی کاموں میں سرگرمی بھی دکھائی جا رہی ہے اور سارا گھرانا فائدہ اور نقصان۔ رنج اور راحت میں یکساں طور پر شریک ہیں لیکن باپ کے مرنے کے بعد اگر بھائیوں میں نفاق پڑ جائے تو وہی گھر ہے اور وہی لوگ ہیں لیکن ساری کایا پلٹ جاتی ہے۔ نہ وہ خوبی رہتی ہے نہ وہ آسودگی۔ نہ وہ چین۔ وحدت گئی اور سارا نقشہ بدل گیا

پس جس خاندان کا ایک سردار ہو اس کی آواز ایک۔ عمل ایک۔ نتیجہ ایک۔ یہی کیفیت قبیلہ اور قوم اور ملک کی نظر آئے گی۔ بشرطیکہ ان کے عمل میں وحدت ہو۔ دنیا میں بگڑے کام کے سدھارنے کے لئے صرف ایک ہی مسلمہ طریقہ ہوتا ہے۔ اس لئے صراط المستقیم یعنی صحیح راستہ بھی ایک ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ سب سے چھوٹا اور سیدھا راستہ ہے۔ اس لئے جہاں کہیں اس کے برعکس ہو یعنی جتنے منہ اتنی باتیں ہوں تو نظریہ میں وحدت نہیں رہتی جس کا لازمی نتیجہ انتشار ہوتا ہے

دنیا ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ قارئین کرام ذرا غور فرماویں تو سمجھ سکتے ہیں کہ عمل کے لئے صرف ایک ہی صحیح راستہ ہے اور اس راستہ پر چلنے کے لئے صرف ایک نصب العین ہے۔ خواہ فرد ہو یا قبیلہ جب تک ان کا نصب العین ایک نہ ہو منزل مقصود تک پہنچنا محال ہے۔

وحدت عمل جاتی رہے تو ہلاکت ضروری ہے دانا کہتے ہیں علاج ایک طبیب سے کرانا چاہیئے۔ ایک وقت میں ایک ہی خوراک دوائی کی پینی چاہیئے۔ خاندان ہو یا قوم سردار صرف ایک ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ وحدانیت شیرازہ بندی کے لئے اشد ضروری ہے۔ میں تو یہ ایمان رکھتا ہوں کہ دنیا کی موجودہ تکالیف کا علاج بھی اسی اصول وحدت میں مضمر ہے یعنی ہم اس اصول پر عمل پیرا ہو جائیں۔ یہی نصب العین ہمارا مقصد پورا کر سکتا ہے میرے خیال میں یہی حقیقی مذہب ہے اور بس۔

یہ مختصر سا مضمون صرف اس لئے لکھا گیا ہے کہ قارئین کرام میں نیا احساس پیدا ہو اور وہ اصول وحدانیت کو اپنی زندگی کا نصب العین قرار دیں تاکہ انہیں بصیرت حاصل ہو۔ اور وہ دنیا اور آخرت دونو میں کامیاب اور سرخرو ہوں۔ آمین ؛

(مولانا) عبدالقادر

نیویارک میں فوجی نمائش کے موقعہ پر رُوسی مرد اور عورتوں کا مظاہرہ۔
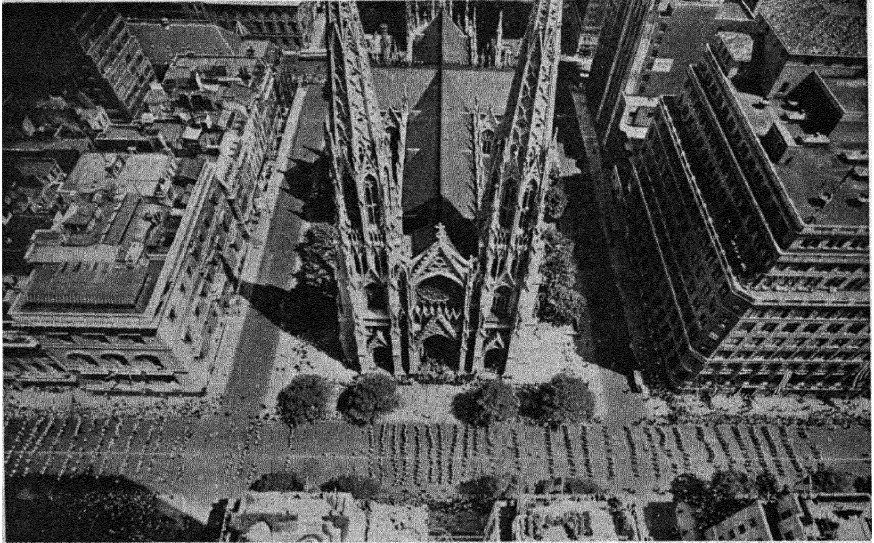
امریکہ کے پانچ لاکھ سپاہیوں کی جنگی نمائش ۔ ہوائی جہاز سے ۔

رفتارِ زمانہ

رُوس :- تازہ ترین خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ گو جرمن قفقاز میں بہت بڑھ نکلے ہیں لیکن اب ان کی رفتار سُست پڑگئی ہے ۔ روسی جانباز بھی اس محاذ کی اہمیت کو خوب سمجھتے ہیں اور قدم قدم پر جان توڑ مقابلہ کر رہے ہیں اور اُن کے جوابی حملوں کی شدت بھی بڑھ رہی ہے ۔

جرمن ٹینک سالسک اور مائیٹیز اَلنی کی طرف بڑھ تو آئے ہیں لیکن انہیں لینے کے دینے پڑگئے ۔ جرمن قفقاز اور وہاں کے تیل کے چشموں پر جلد از جلد قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے ہر ممکن کوشش اور قربانی پر تلے ہُوئے ہیں ۔ اُدھر روسی بھی انتہائی جرأت اور فداکاری سے ان کے مقابلہ پر ڈٹے ہُوئے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن اپنے اس بڑے یلغار میں خاطر خواہ طور پر کامیاب نہیں ہو سکے ۔

دورونیش کے مورچہ پر روسیوں کے شدید حملے جاری ہیں اکثر مقامات پر تو جرمن سورما جان بچا کر بھاگ رہے ہیں ۔ جرمن تین مہینے سے اپنا پُورا زور اس مورچہ پر لگا رہے ہیں لیکن ابھی تک والگا والی سڑک تک پہنچ نہیں پائے ۔

پچھلے سال جرمنوں نے لینن گراڈ ، ماسکو اور رَنیف تینوں مورچوں پر بیک وقت ایک طوفانی حملہ کر ڈالا تھا ۔ اس وقت یہ نظر آتا تھا کہ یہ نازی سیلاب سب کچھ بہا لیجائیگا ۔ اس سال انہوں نے اپنی رہی سہی طاقت ساری روسی محاذ کے جنوبی حصہ پر صرف کر دی ۔ اور اس محاذ کے دوسرے حصّوں پر بڑھنے کی انہیں ہمت نہ ہو سکی ۔ اس سے ظاہر ہے کہ پچھلے سال رُوسی محاذ پر جرمنوں کو کتنا نقصان اُٹھانا پڑا ۔

سمندری قافلہ :- حال ہی میں ایک بڑا سمندری قافلہ برطانیہ سے مالٹا پہنچا ہے ۔ اس قافلہ کو تباہ کرنے کیلئے محوریوں نے بہت سے جنگی جہاز ، آبدوز کشتیاں اور بمبار وغیرہ بحیرۂ روم میں چھوڑ رکھے تھے ۔ انہوں نے پُورا زور مارا ۔ مگر یہ قافلہ مع اپنے جنگی ہوائی جہازوں اور دیگر سامان کے مالٹا پہنچ ہی گیا ۔ نقصان پہنچا مگر معمُولی سا ۔

محوری بحری بیڑے کو تو اس قافلہ پر حملہ کرنے کی اسلیئے ہمت نہ پڑی کہ برطانوی ہوائی جہاز بھی آن پہنچے ۔ ادھر یہ آئے اور اُدھر وُہ کھسکا البتہ دشمن کے بمبار اور تارپیڈو مار طیارے اس قافلہ پر پل پڑے قافلہ کے حفاظتی طیاروں اور ہوا مار توپوں نے ان کی خوب آؤ بھگت کی ۔ اس سمندری حرب میں برطانیہ کا ایک طیارہ بردار جہاز ایگل اور ایک ہلکا گشتی جہاز مانچسٹر ڈُوب گئے ۔ اور محوریوں کی دو آب دوز کشتیاں اور بہت سے بمبار تارپیڈو مار جہاز تباہ ہُوئے ۔

مصر :- اس محاذ پر طرفین خاموش ہیں ۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جرنیل آکنلک اور جرنیل رومل دونوں آنے والی ٹکّر کے لئے تیاری کر رہے ہیں حال ہی میں برطانوی گشتی دستوں نے اس محاذ کے تمام مورچوں پر حملہ کیا اور درمیانی حصّہ کے چند مورچوں اور چوکیوں کو تباہ کر ڈالا اور بہت سے جرمنوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ۔ علاوہ اسکے برطانوی بمبار دشمن کے فوجی ٹھکانوں ، بندرگاہوں اور سامانِ جنگ کے اہم ذخیروں کو تباہ و برباد کرتے رہے ہیں ۔

دُوسرا محاذ :- یُورپ میں دوسرا محاذ قایم کرنے کیلئے اضلاع متحدہ امریکہ سے بہت سی فوجیں برطانیہ آئی ہوئی ہیں اور سخت سے سخت مشقیں کر رہی ہیں ۔ ان کے سب سے بڑے کمانڈر نے ایک براڈکاسٹ پیغام کے

دوران میں کہا:-

ہم آئے ہی اس غرض سے ہیں کہ مغرب کی طرف
سے یورپ پر حملہ کردیں اور ہم میں ہر ایک نہایت
بے صبری سے اس گھڑی کا منتظر ہے کہ دشمن سے جلد
دو دو ہاتھ کر سکے اور اس فیصلہ کن لڑائی میں سرخروئی
کے ساتھ اپنے وطن لوٹے۔"

بحر الکاہل:-

—— جاپان نے بحر الکاہل کے جزائر سلیمان کو آغاز جنگ ہی میں فتح کر لیا تھا۔ حال ہی میں امریکن سمندری بیڑے نے وہاں فوجیں اُتار دی ہیں۔ اور اب تک کئی مقامات پر جاپانی فوجوں کو شکست ہوئی ہے۔ ان جزائر میں لڑائی اب بھی جاری ہے مفصّل حالات ابھی تک دستیاب نہیں ہوئے ہیں ہاں اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ امریکن فوجیں لگاتار آگے بڑھ رہی ہیں اور جاپانیوں کے دعوے نرے زٹل قافیے ہی ثابت ہو رہے ہیں۔

عراق:-

—— عراق کے سیاسی حلقے دنیا کے حالات کا نہایت غور سے مطالعہ کیا کرتے ہیں اور بین الاقوامی واقعات کا صحیح جائزہ لیا کرتے ہیں۔ ان حلقوں میں ترکی کی نئی وزارت کی ترتیب پر اظہار امتنان کیا جا رہا ہے۔ ترکی نے اس سارے نازک دور میں ایسا اچھا رویّہ رکھا ہے کہ آج دنیا کے ہر فرد و بشر کو ترکی سیاست دانوں کی بیدار مغزی اور سیاسی قابلیت کا اعتراف ہے۔ عراقیوں کو کامل یقین ہے کہ ترکی اپنے عہد ناموں پر قائم رہے گا چاہے کتنی ہی قربانی نہ دینی پڑے۔ چنانچہ عراق کا ایک مشہور اخبار لکھتا ہے:-

"ترکی کی بیرونی اور درونی سیاست سورج
کی طرح عیاں اور چٹان کی طرح مضبوط اور
اٹل ہے۔ کوئی وزارت ہو حکمتِ عملی وہی رہیگی
کیونکہ یہ حکمت عملی ترکی کے قومی اصولوں پر مبنی ہے۔"

افغانستان:-

—— فراہ کے آس پاس کے علاقوں میں زرعی پیداوار کو بڑھانے اور نئے میوہ دار درخت لگانے کیلئے وسیع انتظامات ہو رہے ہیں نئی اسکیم کی رُو سے دریا کا پانی کافی مقدار میں اور نہایت آسانی سے مہیا ہو سکتا ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ دو لاکھ ایکڑ نئی زمین زیر کاشت آجائیگی۔ یہ تجویز بھی ہے کہ بیس نئے باغ لگائے جائیں اور نہر کے دونوں کناروں پر بیس لاکھ درخت لگائے جائیں۔

—— قلعہ نو میں بھی نئے باغات لگانے کے بارہ میں احکام صادر ہو چکے ہیں

—— جو طلبہ پشتو مدرسوں میں پڑھتے ہیں ان کیلئے یہ حکم جاری کیا گیا ہے کہ تعلیمی اوقات کے بعد کھیل کود خاص کر والی بال میں حصہ لیں۔

جرأت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا
ہیں بحرِ خودی میں ابھی پوشیدہ جزیرے
کھلتے نہیں اس قلزمِ خاموش کے اسرار
جبتک تو اسے ضربِ کلیمی سے نہ چیرے

(اقبال)

میرویس خان

افغان قوم خوش قسمت ہے کہ افغانستان نے تاریخ عالم میں بہت بلند پایہ پایا ہے۔ افغانستان نے اپنی زندگی کے مختلف ادوار میں ایسے کارنامے کر دکھائے ہیں کہ جب تک دنیا قایم ہے اُن کی یاد زندہ رہے گی افغانستان آریائی۔ باختری۔ برہمنی اور بدھی تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے۔ ہمارا پرانا تمدن۔ ہمارے نامور بزرگوں کے کارنامے اور افغانستان کی بین الاقوامی شہرت۔ تاریخ عالم میں ان سب کا ذکر سنہری الفاظ میں موجود ہے۔ افغانستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ہر افغان کی رگ رگ میں آزادی کا جذبہ بھڑکتا رہا ہے۔ اور اس جذبہ نے مردانگی۔ شجاعت اور سرفروشی کا جذبہ پیدا کر دیا۔ انہی جذبات کیوجہ سے افغان قوم دنیا کی نظروں میں سرخرو ہے۔ ہم بجا طور پر اپنے بزرگوں کے وجود اور ان کے شاندار کارناموں پر اترا سکتے ہیں اور اپنے آپ کو اُنکی قابل فخر اولاد سمجھتے ہیں

افغان قوم کو سب سے پیاری چیز افغانستان کی آزادی ہے۔ ہزارہا سال سے یہ پہاڑی خطہ آزاد رہا ہے کیونکہ اوروں کے سامنے جھکنا اس کی سرشت ہی میں نہیں ہے۔ نفاق اور خانہ جنگی کی وجہ سے اگر کبھی افغانستان کی آزادی پر کالی گھٹائیں چھائیں تو اُسے بچانے کے لئے ساری قوم باہر نکل کھڑی ہوئی۔ قومی خطرہ یا مصیبت کے وقت تو گھل مل کر ایسی ٹھوس ہو جاتی ہے کہ گویا سر پھٹول تو در کنار کبھی نفاق سے بھی آشنا نہ تھی۔ اور ارادہ ایسا پکا۔ کہ مدعا حاصل کرنے تک نہ چین ہے نہ فداکاری سے دریغ۔

اٹھارہویں صدی کے شروع میں قلمرو افغانستان کے بہت سے حصے اسی نفاق اور خانہ جنگی کی نذر ہوئے مغلوں نے ولایات شرقی پر قبضہ جما لیا تھا۔ ایرانیوں نے ہرات اور قندہار لے لئے۔ ازبکوں نے ولایات شمالی میں ادھم مچا رکھی تھی۔ غرض دشمنوں نے ہر طرف سے غلبہ پا لیا تھا اور افغانستان اغیار کے شکنجہ میں آگیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ افغان قوم مٹی کہ مٹی۔ ہر سمت یاس تھی جو کوئی آزادی کے لئے سر اُٹھاتا وہیں ٹھنڈا کر دیا جاتا۔

ان لگاتار مصیبتوں اور بدبختیوں سے خیال ہوتا تھا کہ سرزمین افغانستان پر عذاب الٰہی نازل ہوگیا ہے۔ اور افغان قوم کی قسمت میں غیروں کی ٹھوکریں کھانا لکھا ہے۔ چھٹکارے کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی بجز اس کے کہ

مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

اور قوم کو تباہی اور فلاکت کے بھنور سے نکال کر امن اور آبرو کے کنارے پہنچا دے۔ قدرت کو یوں ہی منظور تھا۔

——— (باقی آیندہ) ———

نیو یارک کی جنگی نمائش ۔ اَمریکن عورتیں آگے آگے جارہی ہیں۔
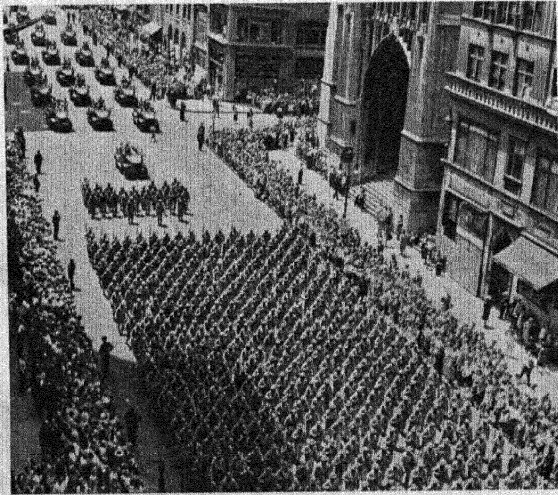
موجودہ جنگ میں شامل ہونے کے بعد اَمریکن فوجوں کی ایک زبردست جنگی نمائش شہر نیو یارک میں۔

پشتو سے ترجمہ

قدیم اور جدید اخلاق

(از خاطر شاعر)

زمانہ کئی رنگین انقلاب دیکھ چکا ہے۔ نسل آدم اس خدا کی زمین پر اور اس نیلے آسمان کے نیچے کئی انقلابات میں سے گذر چکی ہے۔ اقوام کا مدّ و جزر اور ان کی خونی داستانیں دنیا کے ذرّہ ذرّہ پر نقش ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ جس قوم کو ذرا طاقت میسر ہوئی اُسے فوراً حکومت کی دھن لگی۔ اور کمزور قوموں کو پامال کر کے اور اُن کے مال و متاع چھین کر ایک عرصہ تک خود اُن پر حکومت کرتی رہی۔ باوجود اس کے اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو سیاسی اور اقتصادی برتری سے قطع نظر اخلاق کے بنیادی اصولوں کے بارہ میں غالب اور مغلوب قوموں کا نظریّہ ایک ہی رہا ہے دنیاوی دولت اور نعمتوں میں مغلوب سے غالب کا حصہ ہمیشہ زیادہ رہا ہے اور اس فرق سے تقاضائے وقت کے مُطابق اخلاق میں بھی فرق آجاتا ہے لیکن اخلاق کے بنیادی اصُولوں کی سچائی کو کوئی ٹھیس نہیں لگتی یعنی عملی طور پر غالب اور مغلوب قوموں کے اخلاق خواہ کچھ ہی ہوں لیکن اعتقاداً دونو کا اخلاقی نظریّہ ایک ہی رہا ہے۔ اس لیئے غالب اور جابر قوم کی اطاعت قبول کرنا کسی محکوم اور کمزور قوم کو چنداں ناگوار نہ تھا۔ محکوم قوم غالب قوم کو اخلاقی لحاظ سے برتر سمجھتی تھی اور جانتی تھی کہ جب تک اخلاق میں غالب قوم سے بڑھ نہ جائے سوائے اطاعت کے کوئی چارہ نہیں۔

اس اخلاقی نظریہ کی رو سے موجُودہ قیامت خیز جنگ ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس جنگ میں قدیم اصُول کارفرما نہیں بلکہ طاقت کے حصُول کے لیئے فریقین میں ایک رسّہ کشی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ عالمگیر جنگ پرانے اور نئے فلسفۂ حیات یعنی اُن کے معاشرتی سیاسی اور اخلاقی نظریات کے درمیان ایک بہت بڑی کشمکش ہے موجُودہ دنیا کا معاشی اور اخلاقی توازن بگڑ چکا ہے اور تبدیلی کا محتاج ہے۔ ایسی نازک حالت میں جان، مال، ملک اور قوم خطرے میں پڑجاتے ہیں بلکہ اس کے مذہب اور تمدّن میں بھی انقلاب رونما ہوجاتا ہے۔ گویا ہر قوم اور ہر ملک کے دینی اور دنیوی مفاد کا دارومدار اس بات پر ہے کہ اس جنگ عظیم میں کس فریق کو فتح ہوتی ہے اور کس کو شکست۔ اور اس جنگ کے نتیجہ کا اثر ہر انسانی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر پہلو پر پڑے گا۔

دُنیا کے قدیم نظام حکومت اور مذہبی عقائد سے

سبھی واقف ہیں۔ لیکن ایسے لوگ بہت کم ہیں جو نئے فلسفۂ حیات یعنی نئے سیاسی، اخلاقی اور معاشرتی نظریات کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔

میں موجودہ جنگ کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پُرانے اور نئے فلسفۂ حیات کا موازنہ کیا جائے۔

درحقیقت نیا فلسفۂ اخلاق پُرانے مذہبی اخلاق کا اُلٹ ہے۔ بلکہ پُرانے مذہبی اخلاق کی بیخکنی کے لئے وجود میں آیا۔ وہ تمام اعمال و افعال جو مذہب کی رُو سے صحیح سمجھے جاتے تھے اب بیکار ہیں۔ بلکہ نیک و بد۔ ثواب، گناہ اور ان کے مفہوم سب بدل چکے ہیں۔ یعنی وہ افعال و اعمال جو ذریعۂ نجات سمجھے جاتے تھے اب باعث عذاب سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کام جو کل تک ممنوع تھے آج تمدن و تہذیب کی ترقی اور تکمیل کا باعث ہیں۔ الغرض پُرانا مسلمہ اور مصدّقہ مذہبی اخلاق نئے فلسفہ کی رو سے انسانی تمدن اور اخلاق میں ایک رکاوٹ بن گیا ہے۔ نئے فلسفۂ حیات کا علمبردار اور استاد کل جرمنی کا مشہور و معروف فلسفی اور شاعر نٹشے ہے جو قرون وسطے کے یورپ کی مذہبی اور اخلاقی پستی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ اصلاح کی صورت نکالتا مذہبی عقاید اور اخلاقی نظریات کی سچائی پر ہی معترض ہو گیا۔ اور کہتا تھا کہ مروجہ اخلاق کی دیوار ہی ٹیڑھی ہے۔ اور یہ اس لئے کہ اس کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی گئی ہے۔ پُرانے مذہبی اخلاق کے مقابلہ میں اس نے اپنا نیا نظریہ اور نیا فلسفۂ حیات پیش کیا اور کھلے بندوں کہنے لگا کہ تمام پُرانے مذہبی نظریے پُرانے اخلاق۔ پرانی تعلیمات۔ سب غلط ہیں۔ پرانے مذہبی خیالات کی مذمت میں بہت بڑھ نکلا۔ یہاں تک کہ حضرت عیسےٰ علیہ السلام کو بزدل اور کمزور قرار دیا۔ اور کہا کہ انہوں نے انسانوں کو ایک کمزور اور زنانہ فلسفۂ حیات کی تلقین کر کے غلط رہنمائی کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مسیحی اخلاق اور تہذیب دنیا کے موجودہ حالات میں ہرگز قائم نہیں رہ سکتی۔ اور مسیحی تعلیم بوجہ غیر فطری اور جمودی ہونے کے ناقابل عمل ہے۔ مذہبی اخلاق تو جذبات کا محض دوسرا نام ہے غور و فکر کو جذبات سے کیا سروکار؟ جذبات انسانی ارتقاء اور تکامل کے باعث نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے سدّ راہ ہیں۔ یہ جذبات تو صرف اُن فلسفیوں کی عیاری اور چالاکی کو ثابت کرتے ہیں جنکو ڈاکٹر اقبال "گوسفندان قدیم" کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ تاریخ اخلاق پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ابتدا میں کمزور لوگوں کو طاقتور قوموں کا مقابلہ کرنا پڑا اور مغلوبوں نے محض اپنے بچاؤ کیلئے یہ مذہبی اخلاق وضع کئے۔ اس خیال سے کہ بھیڑ کو شیر بنانا مشکل مگر شیر کو بھیڑ بنانا آسان ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ مغلوب قوم کو جہد للبقاء کے لئے تیار کرتے انہوں نے ان روباہی حیلوں سے شیر کو بھی اس کی خوبیوں سے محروم کر دیا اور یہ دکھا دیا کہ بھیڑ شیر پر فضیلت رکھتی ہے۔ ---------- باقی آئندہ۔

سوات

(از عبدالرؤف خان صاحب ایم۔اے بی ٹی)

شمال مغربی صوبہ سرحد میں ریاست سوات کو جو حیثیت حاصل ہے وہ یقیناً محتاج بیان نہیں لیکن چونکہ جغرافیائی اعتبار سے بھی وہ کسی لحاظ سے کم قابل توجہ نہیں۔ اسلئے موجودہ ریاست کے نظام اور دیگر مسائل پر ذکر کرنے سے پہلے اس کی جغرافیائی پوزیشن اور اہمیت سپرد قلم کرنا ضروری ہے۔

یہ ریاست ضلع پشاور کے شمال و مشرق میں کئی ریاستوں سے محصور چند خوبصورت اور سرسبز وادیوں اور گھنے قیمتی جنگلات پر مشتمل ہے اس کے شمال میں کوہستانی قبائل مشرق میں دریائے سندھ جنوب میں پشاور اور مردان کے اضلاع اور مغرب میں باجوڑ اور دیر ہیں ضلع پشاور اور سوات کے درمیان مالاکنڈ ایجنسی واقع ہے جو گو سیاسی لحاظ سے حکومت ہند کے زیر نگیں ہے لیکن جغرافیائی، اقتصادی اور باقی ہر لحاظ سے ریاست سوات کا ایک حصہ ہے۔ علاقہ سوات اپنی قابل رشک شادابی کیلئے دریائے سوات کا مرہون منت ہے جس نے اپنی فیاضی اور دریا دلی سے ریاست دیر کے دریا پنجکوڑا اور چترال کے دریائے چترال کو مات کر دیا ہے یہ ۱۳۰ میل لمبے اور قریباً ۱۲ میل چوڑے رقبہ کو سیراب کرتا ہوا چکدرہ کے قریب پنجکوڑا سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔

موجودہ والئے سوات کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ریاست سوات سے مراد صرف وہ علاقہ تھا جس کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں یعنی زیریں سوات۔ سوات بالا اور کوہستانی سوات لیکن اب والئے سوات کی غیر معمولی قابلیت نے اسکی حدود کو توسیع دیکر بنیر کا وسیع علاقہ اور زیریں کوہستان یعنی کالام کا علاقہ بھی اپنی حکومت میں شامل کر لیا ہے اور اب ریاست کا رقبہ تقریباً ۷ ہزار مربع میل ہے۔ ریاست کے کوہستانی علاقے میں عمارتی لکڑی کے گھنے جنگلات قیمتی اور نایاب جڑی بوٹیاں پائی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ چارے کی فراوانی سے بھیڑ بکریاں اور مویشی بھی پائے جاتے ہیں۔ وادیاں تو اپنی زرخیزی اور زرریزی کے لئے اپنی مثال آپ ہیں۔ چنانچہ موسم گرما میں دریائے سوات کے دونوں طرف چاول کے خوبصورت اور ہرے ہرے کھیت سبزے سے ملبوس مخملی پہاڑ اور دیگر قدرتی مناظر ایک مسافر کے دل میں وہ کیفیت اور سماں پیدا کرتے ہیں جو ناقابل بیان ہے۔ ہر قسم کی پیداوار کے علاوہ یہ وادیاں میوہ جات اور باغات میں کشمیر اور کانگڑہ کا مقابلہ کرتی ہیں۔ اسلئے اس کو صوبہ سرحد کا کشمیر کہنا بیجا نہ ہوگا۔ سطح کے لحاظ سے زیریں سوات قریباً ۲ ہزار فٹ سطح سمندر سے بلند ہے لیکن سطح اوپر کو بتدریج بلند ہوتی جارہی ہے یہاں تک کہ بعض پہاڑوں کی چوٹیاں قریباً ۲۲ ہزار فٹ بلند ہیں۔ سوائے زیریں حصہ کے جس کی آب و ہوا گرمیوں میں ذرا گرم مرطوب اور موسم خزاں میں ملیریا زدہ ہے باقی تمام ریاست کی آب و ہوا بحیثیت مجموعی گرمیوں میں خوشگوار اور سردیوں میں سرد ہے۔

تاریخی اعتبار سے سوات کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ وہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ کسی زمانے میں موریہ بادشاہوں کا مرکز تھا۔ سکندر اعظم اسی راستہ سے ہندوستان آیا۔ مغلوں نے یہاں کئی بار ناکام حملے کئے۔ یہ کئی تاریخی دوروں سے گذر چکا ہے۔ اس کا سینہ زمانے کے انقلابات سے چھلنی ہو چکا ہے۔ اور پچھلی چند صدیوں میں تو یہ گوناگون آلام اور مصائب کا شکار رہا ہے لیکن موجودہ والئے سوات کے برسر اقتدار آنے کے بعد کہیں جا کر اس علاقہ کو امن و امان کی نعمت نصیب ہوئی۔ والئے موصوف کے والد اعظم بھی اپنے وقت کے بہت بڑے عالم اور بزرگ گذرے ہیں۔ ان کا مزار شریف شمالی ہندوستان کے چند چوٹی کے مشہور مزاروں میں سے ہے۔

حضرت صاحب سوات کے فوت ہونے پر موجودہ والئے سوات نے جن مشکلات کا جس بہادری اور قابلیت سے مقابلہ کر کے ایک بہت بڑی ریاست کی بنیاد ڈالی اس کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے ان کو اگر وقت کا شیر شاہ کہیں تو عین انصاف ہوگا۔ اسلیئے ضروری ہے کہ والی صاحب کی قایم کردہ ریاست کے انتظامی حالات پر بھی ایک طائرانہ نظر ڈال دی جائے۔

والئے سوات باوجود خود مختار حاکم ہونے کے جمہوریت کے اصول کا سب سے بڑا علمبردار ہے تمام قبائل اپنا اپنا کوڈ یا ضابطۂ قانون خود باہم مشورہ سے مرتب کرتے ہیں اور والی صاحب ایک آئینی بادشاہ کی طرح اس پر صرف مہر منظوری ثبت کرتے ہیں اس طرح پر قبائل کے احساسات اور جذبات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ملکی نظام کو موثر طریقہ پر چلانے کیلئے ریاست کئی ضلعوں اور تحصیلوں میں منقسم ہے ہر ضلع میں ایک حاکم اور ہر تحصیل میں ایک تحصیلدار مقرر ہے جو فراہمی مالگذاری اور امن کا ذمہ دار ہے حکومت کے ناظم اعلیٰ خود والی صاحب ہیں اُن کے مشورہ اور امداد کے لئے وزیر اعظم۔ وزیر صاحب اور سپہ سالار صاحب ہیں۔ ولیعہد صاحب علاوہ سپہ سالاری کے فرائض کے مقدمات بھی فیصلہ کرتے رہتے ہیں اپیلوں کی سماعت والی صاحب کے ہاں ہوتی ہے اور وہ علاوہ اپیلوں کے دوسرے مقدمات بھی سنتے ہیں۔ ملکی قانون شریعت ہے۔ اور تمام مقدمات اور تنازعات شریعت کی رُو سے فیصلہ کئے جاتے ہیں۔

ریاست کی سالانہ آمدنی ۱۸ لاکھ روپے ہے اور کل آبادی ۴ لاکھ ۴۷ ہزار ہے۔ ریاست تعلیم میں خاصی دلچسپی لیتی ہے چنانچہ یہاں تعلیم مفت ہے۔ کئی پرائمری سکولوں کے علاوہ ایک ہائی سکول بھی ہے اسکے علاوہ کئی قسم کے وظائف بیرون ریاست بھی دیگر درسگاہوں میں پڑھنے والے سواتی طلبا کو دیئے جاتے ہیں حکومت کی عدالتی زبان پشتو ہے اسکو ترقی دینے کی انتہائی کوشش کی جارہی ہے غالباً عنقریب پشتو زبان ذریعہ تعلیم ہو جائے۔ پشتو کی اشاعت اور توسیع کے دیگر وسائل پر بھی غور و خوض کیا جا رہا ہے۔ ریاست نے محکمہ حفظان صحت بھی قایم کر رکھا ہے خاص سیدو شریف میں ایک مردانہ ہسپتال کے علاوہ ایک زنانہ ہسپتال بھی کھولا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ایک بڑا ہسپتال مویشیوں کے علاج کیلئے بھی موجود ہے۔ ذرائع آمد و رفت کا محکمہ بھی قائم ہے چنانچہ ریاست میں تقریباً دوسو میل پختہ سڑکوں کے علاوہ کچی سڑکوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ ریاست کی مختلف جگہوں کو ٹیلیفون سے بھی ملایا گیا ہے۔

ریاست کی کل فوج دس ہزار ہے اسکے علاوہ تمام قوم بوقت ضرورت فوج میں منتقل ہو سکتی ہے کیونکہ قوم کا بچہ بچہ بندوق چلا سکتا ہے مختلف مقامات پر ۸۵ قلعے تعمیر ہیں اور ہر قلعہ میں مسلح فوج کا ایک دستہ

ہر وقت تیار رہتا ہے۔ قارئین کرام یہ سُن کر حیران ہونگے کہ ریاست کے تمام
قلعے۔ پل۔ سڑکیں اور دیگر عمارات مقامی مزدوری اور سامان سے تیار ہوتے
ہیں۔ لکڑی کے اسقدر مضبوط پُل تو یقیناً فنِ تعمیر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔

مالگذاری کی وصُولی بھی عین شریعت کیمطابق ہے اور رعایا کی
بہبُودی کیلئے جنس میں وصُول کی جاتی ہے جو عُمّال حکومت کو تنخواہ میں
دینے کے بعد شاہی گوداموں میں جمع رہتی ہے۔ ریاست کی پیداوار اور
دیگر تمام اشیاء پر بھاری محصول برآمد لگایا جاتا ہے جس سے ریاست
میں چیزیں نہائیت ہی ارزاں اور بافراط ہیں۔ میرے خیال میں دُنیا بھر
میں کھانے پینے کی چیزیں اتنی سستی آپ کو کہیں بھی نہ ملیں گی۔

اس ریاست کو دیگر ریاستوں پر ایک اور فوقیت حاصل ہے
وُہ یہ کہ سوات یوسف زئی قوم کا مرکز ہے اور یہ قوم سوات کے علاوہ
ضلع مردان۔ مالاکنڈ ایجنسی۔ ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ اور ملحقہ
علاقہ غیر میں کثیر تعداد میں آباد ہے۔ یہ سب اس ریاست کو اپنی
قومی ریاست تصوّر کرتے ہیں۔

آخر میں تمدّن کے زرّین پہلو یعنی "امن" کے سوال کو مدِّ نظر رکھکر
ریاست پر ایک نظر ڈالیں تو یہ سب ہندوستانی ریاستوں میں ممتاز نظر
آئیگی۔ کیونکہ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ جرائم اور دیگر واردات
کی کمی میں ریاستیں تو کیا کوئی مہذّب سے مہذّب ملک بھی اس کا مقابلہ
نہیں کرسکتا۔ ایسے امن کو اگر شیر شاہی دور کا امن کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

پس ایسے برگزیدہ اور مجاہد انفاس کی قائم کردہ حکومت پر
آئیندہ کے لئے حاکم ہونے والے ولیعہد کی زندگی پر اگر ایک مختصر سا
مقالہ لکھا جائے تو ہمارے خیال میں یہ امر ایک تاریخی فرض سے
سبکدوش ہونے کے مترادف ہوگا۔ تاکہ قارئین کرام پر یہ واضح ہو
جائے کہ ایک وسیع ریاست پر حکومت کرنے والے میں ایک صالح نوجوان
کی تمام اوصاف حمیدہ کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں اور وہ خدا کے
فضل سے تمام طُرق جہانبانی سے باخبر اور صفات حکمرانی سے
موصوف ہیں۔

ولیعہد محترم ۵ رجون ۱۹۰۸ء میں میاں گل گلشہزادہ موجودہ
والئے سوات کے گھر پیدا ہوئے اِن کا نام عبدالحق رکھا گیا لیکن وہ
زیادہ تر اپنے لقب جہاں زیب سے مشہور ہیں ان کو پانچ سال کی عمر
میں ہی یعنی ۱۹۱۳ء میں اسلامیہ کالیجیٹ سکول پشاور میں تعلیم و تربیت
کے لئے بھیجدیا گیا۔ انہوں نے ۱۳ سال صوبہ سرحد کے اس
عظیم الشان درسگاہ اور دارالعلوم میں گذارے۔ یہاں یہ مولانا
سید عبداللہ قطب شاہ عباسی ایک جیّد عالم اور کالج کے ناظم دینیات
کی سرپرستی میں دینی اور دنیاوی علوم سے برابر بہرہ اندوز ہوئے
ملکی مُعاملات میں حصّہ لینے کے لئے ۱۹۲۶ء میں وُہ بی۔ اے
تک تعلیم کے بعد گھر تشریف لے آئے اور مکمل دینی تعلیم مولانا عبدالجلیل
صاحب سے حاصل کی۔ گھر آتے ہی ان کے ولیعہد ہونے کا اعلان کیا گیا
جسے برٹش گورنمنٹ نے خوشی سے تسلیم کرلیا۔ وُہ خزانہ اور ملکی معاملات
کے انچارج ٹھیرائے گئے جن کے سرانجام دینے میں انہوں نے اپنی خداداد
قابلیّت سے والئے سوات کو متاثر کرکے سپہ سالاری کا
عہدہ بھی حاصل کرلیا۔

شہزادہ جہاں زیب نہایت ہی رعنا، وجیہہ اور بارعب
جوان ہیں علاوہ اسکے ایک اعلیٰ شاہسوار ماہر نشانہ باز اور فنونِ
جنگ کے اصُولوں سے کماحقہ آشنا ہیں۔ فوج کی موجودہ ترتیب
اور تنظیم اور دیگر اصلاحات اُن کی قابلیّت کی مرہونِ منّت ہیں

اس کے علاوہ وہ ایک اعلیٰ درجہ کے کھلاڑی ہیں خاص کر اسلامیہ کالج کی ٹینس ٹیم کی طرف سے تو مدت تک نمائندگی کرتے رہے ہیں۔

مقدمات کے فیصلہ میں نہایت غور وخوض سے کام لیتے ہیں اور کسی قسم کا دباؤ یا لحاظ ان کے انصاف پر اثر انداز نہیں ہوسکتا ان ہی صفات نے ان کو رعایا کا ایک محبوب حاکم اور سردار بنا دیا ہے۔ باہر کا مہمان بھی اُن سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا کیونکہ وہ مغربی اور مشرقی آداب محفل اور طرز تمدن سے بطریق احسن واقف ہیں۔ اور ان کی دلداری اور دلجوئی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ دوستوں اور احباب کے ساتھ وہ بے تکلف اور نہایت مخلصانہ اور صادقانہ طور سے پیش آتے ہیں۔ پُرانے دوستوں کے ساتھ وُہی آزادانہ راہ ورسم اور مخلصانہ رویہ روا رکھتے ہیں۔ اُن کی ملاقات میں آسانی اور سہولیت کو دیکھکر خلفائے راشدہ کا عہد آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

گھریلو زندگی بھی انسان کے صحیح اخلاق کا آئینہ ہے۔ صاحب موصوف کی ایک بیوی اور تین لڑکے ہیں۔ بڑا لڑکا ڈیرہ دون میں زیر تعلیم۔ منجھلا حافظ قرآن اور چھوٹا پرائمری سکول میں تعلیم پا رہا ہے۔ پبلک میں اور ماتحت افسران کو وہ ہمیشہ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے ہیں کہ وہ ہمیشہ خداوند کریم کے احکام اور اس کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھیں جو امور سلطنت میں انصاف۔ رعایا کی خوشنودی اور رفاہ عام کے کاموں میں دلچسپی سے حاصل ہوسکتی ہے۔ الغرض ولیعہد محترم غریبوں کا دوست۔ کمزوروں کا ہمدرد ہر معاملہ میں خیر الامور اوسطہا کا پابند۔ شریعت حقہ کا علمبردار اور ملکی معاملات میں بطریق احسن تجربہ کار ہے چونکہ راعی کے اوصاف کا پرتو رعایا پر پڑنا لابدی ہے اسلیئے رعایا خوش قسمت ہے کہ انکی قسمت ایک ایسے راعی کیساتھ وابستہ ہوچکی ہے۔

آنکھ

کیا چھپائے گی ہم سے یار کی آنکھ
تاڑ لیتے ہیں ہم خمار کی آنکھ

غیر کو تم بُرا کہو نہ کہو
کبھی چھُپتی نہیں ہے پیار کی آنکھ

اب تو آجاؤ تم مرے دل میں
دیکھ لی اب تو تم نے چار کی آنکھ

کیا تصور ہے واہ رے تصویر
اُتر آئی ہے دل میں یار کی آنکھ

تجھ کو دیکھا خدا کو دیکھ لیا
ایک پائی ہے یہ ھزار کی آنکھ

تم نہ آئے یہاں یہ نوبت ہے
گر پڑی تھک کے انتظار کی آنکھ

اپنی قسمت پہ ناز ہے شاعر
چاہ کا دل ملا ہے پیار کی آنکھ

شہزادہ عبدالحق جہاں زیب ولیعہد ریاستِ سوات۔

معصوم

اے معصوم! تجھے ہر ایک دیکھتا ہے۔ کون ایسا ہے جسے تو پیارا نہیں لگتا۔ تو ایک کلی ہے نرم و نازک۔ تو پاک صاف اور دنیا کے تفکرات سے بے پروا ہے۔ تیری یہ بڑی بڑی آنکھیں! خدا نظرِ بد سے بچائے تو تو رشکِ آہو ہے۔ جب تو مسکراتا ہے تو دلوں کو مسخر کرلیتا ہے اور جب تو روتا ہے تو دل لرزتے ہیں۔ یہ تیری والدہ ہے جس کے خون سے تو بنا ہے یہ تیرا والد ہے جس کا تو سہارا ہے۔ یہ تیری بہن ہے جو تجھے ہر وقت گود میں لئے کھلاتی رہتی ہے اور پڑوس کی سب لڑکیاں تجھے درمیان میں بٹھا کر کھیلتی کودتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ سب تیرے ہی نوکر چاکر ہیں۔ جب تیرا سر دکھتا ہے تو تیری والدہ کے پیروں تلے زمین نکل جاتی ہے۔ اور جب تو روتا ہے اور ضد کرتا ہے تو تیری ماں کا سیروں خون خشک ہوتا ہے۔ اے معصوم بچے تجھے ہر ایک دیکھتا ہے۔

اے معصوم بچے۔ تو اتنا پیارا ہے کہ غیر بھی تجھے پیار کرتے ہیں۔ راہ چلتے ہیں پھر ذرا آگے بڑھ کر پوچھتے ہیں "یہ کس کا بچہ ہے"؟ تجھے لینے کے لئے ہاتھ آگے بڑھاتے ہیں۔ تو مسکراتا ہے۔ "آؤ بچے۔ میرے پاس آؤ"۔ تو انہیں دیکھتا ہے۔ اپنی بہن کی گردن کے پیچھے سر چھپا لیتا ہے۔ کن انکھیوں سے اسکی طرف دیکھتا ہے۔ پھر چھپتا ہے۔ مچلتا ہے۔ ٹانگیں مارتا ہے۔ کبھی چیختا ہے اور کبھی ویسے ہی ریں ریں کرتا ہے۔ وہ ہنس پڑتے ہیں۔ دور ہی سے تجھے پیار کرکے راہ چلتے لوگ آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اے معصوم بچے تجھے ہر ایک دیکھتا اور پیار کرتا ہے۔

اے معصوم بچے، جب تیرے والد باہر سے گھر آتے ہیں تو تیرے لئے کوئی نہ کوئی کھانے یا کھیلنے کی چیز ضرور جیب میں ڈال کر لاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ تو اُن کی انتظار میں ہوگا۔ وہ دُور ہی سے تجھے چیز دکھا کر کہتے ہیں "بیٹا۔ چیچی (چیز)"۔ تو انہیں دیکھکر جلدی سے اپنی ماں کی گود میں سے اتر کر ان کی طرف دوڑتا ہے۔ وہ تجھے اٹھا لیتے ہیں۔ سینے سے لگا کر تیری آنکھوں اور پیشانی کو چومتے ہیں۔ اُن کا دل مسرت سے لبریز ہوتا ہے اور تیری معصوم خوشیوں کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ اے پاک اور معصوم بچے تجھے ہر ایک دیکھتا ہے۔ میں بھی تجھے دیکھتا ہوں۔ مجھے تو بہت پیارا معلوم ہوتا ہے۔ جی چاہتا ہے ہمیشہ تو میرے سامنے رہے اور میں تجھے دیکھا ہی کروں۔

جب میں یہ کہتا ہوں کہ ”ہمیشہ تو میرے سامنے ہو اور میں تجھے دیکھا کروں تو میرے دل پہ ایک ہول سا اُٹھتا ہے۔ سوچتا ہوں، پیارے بچّے۔ تو بھی تو دو دن کا مہمان ہے۔“ آج تو معصُوم بچّہ ہے، کل کو ذرا بڑا ہو کر چلنے پھرنے لگیگا۔ دو دن بعد ذرا سمجھدار ہو جائے گا۔ دو چار روز اور گئے نوجوان ہو جائیگا اور پھر قابل فخر جوان۔ اچھا یہ جوان بھی تو ہی تھا۔ اچھا۔ یہ بات ہے۔ بڑی حیرت میں ڈال دیا تو نے تو۔ یہ آجکل جو جوان نظر آتے ہیں یہ سب ہی ایکدن تیری طرح معصُوم کلیاں تھے اور یہ جو بڑے بوڑھے اور معمّر لوگ ہیں یہ بھی تو شاید تیری ہی طرح تھے۔ اچھا تو یوں کیوں نہیں کہتے کہ یہ سب کچھ تو ہی ہے۔ پھر تو یہ سب لوگ بھی تو ہی ہیں اور اگر اور زیادہ غور کیا جائے تو سب دنیا ہی تجھی سے ہے۔ لیکن اے معصُوم بچّے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو تو ایسا پیارا ہے کہ آنکھوں میں بٹھانے کو جی چاہتا ہے۔ تجھے تو ہر ایک دیکھتا ہے اور پیار کرتا ہے۔ میں بھی تجھے دیکھتا ہوں۔ مجھے بھی تو بہت پیارا لگتا ہے۔ میں حیران ہُوں کہ یہ باقی کے لوگ کسطرح تجھ سے بنے ہیں یہ کیسے مانوں؟ تو اپنے آپ کو ذرا دیکھ! تو یہ سب کیسے بن سکا اے معصُوم بچّے۔ مجھے تو تو نے حیرت میں ڈال دیا۔ یہ سب تجھ سے بنے۔ تعجب ہے!۔ تُو تو نرم و نازک شاخ گل ہے۔ تازہ کلی ہے۔ پھر یہ کانٹوں بھری جھاڑیاں یہ سخت و خار دار درخت یہ سب تجھ سے کیسے بنے! یہ تو عجیب بھید ہے۔ تجھے تو کسی نے ابھی تک پہچانا ہی نہیں کہ تو کیا ہے لیکن باوجود ان سب باتوں کے تیری کتنی ناز برداری کی جاتی ہے! اگر کسی کو یہ معلُوم ہو جائے کہ تو یہ بھی بن سکتا ہے اور وُہ بھی تو سچ کہتا ہوں اے معصُوم کوئی تو تیرے ناز اٹھاتا اور کوئی تجھے دُور پھینکتا۔ لیکن پھر بھی اے معصُوم بچّے۔ تجھے ہر ایک دیکھتا اور پیار کرتا ہے۔

لیکن اے پیارے بچّے۔ یہ تو ذرا بتا کہ وُہ بھی تو تیری ہی طرح معصُوم اور پاک بچّے تھے جو بنی بنے، کوئی خدا کے برگزیدہ ولی ہُوئے۔ کوئی عالم، فلسفی، شاعر، ادیب، حکیم اور سائینسدان بنے۔ وُہ بھی تو کبھی تیری طرح معصُوم بچّے ہی تھے اور جب بڑے ہُوئے تو نام کر گئے۔ اگر تُو بھی اُن کیطرح بزرگی چاہتا ہے تو ان کے نقش قدم پر چل سکتا ہے۔ لیکن اے معصُوم بچّے۔ تجھے وہ راستہ کون دکھائیگا؟ تو بیشک اس راستہ پر جا سکتا ہے۔ وہ ایسا عجیب راستہ ہے کہ وہ لوگ بڑے ہو کر بوڑھے بھی ہو گئے لیکن آجتک لوگ ان کو تیرے ہی نام سے بلاتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ وُہ تو معصُوم ہیں یعنی پاک ہیں۔ بھئی اگر تو بھی انہیں کی طرح پاک اور معصُوم رہ کر ہی بڑا ہُوا تو کتنا پیارا لگیگا۔ دیکھ تجھے اب بھی ہر ایک دیکھتا ہے۔ تجھے سب پیار کرتے ہیں اے پیارے بچّے۔ میری بات مان لے اور ہمیشہ ہی معصُوم رہ۔ بڑا ہو کر بھی معصُوم ہی رہ۔

دیکھ۔ جسے دنیا سکندر کہتی ہے وہ بھی ایکدن تو تھا وہ قیصر و کسرٰے بھی تو ہی تھا۔ اور فرعون، ہامان اور نمرود

بھی ایک دن تیری طرح گھٹنوں کے بل چلتے تھے اور تیری
ہی طرح ہنستے تھے ۔ چنگیز خان بھی کبھی ماں کی گود میں تیری
ہی طرح رویا کرتا تھا ۔ ابوجہل نے بھی کبھی تیری ہی طرح
مٹی کے گھر ونڈے بنائے اور بگاڑے تھے اور دنیا کے
تمام ظالم و جابر لوگ ایک دن تیری ہی طرح دکھائی دیتے
تھے ۔ جو ڈاکے اور چوریاں ، قتل و خون اور غارتگری
کرتے تھے وہ بھی تجھ سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتے ہیں
جو یتیم کا مال کھاتے ہیں طاقتور کی طرفداری اور کمزور
پر جو زیادتی کرتے ہیں اور جو امانت میں خیانت کرتے
ہیں ۔ یہ بھی سب تجھ سے کچھ نہ کچھ نسبت رکھتے ہیں
مگر یہ تو سب خدا کے دشمن ہیں ان پر تو لعنت اور پھٹکار
برستی ہے ۔ انہیں تجھ سے کیا واسطہ ؂

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

تُو تُو ہے ۔ تُو تو ہر ایک سے گلے ملتا ہے ۔ اور یہ لوگ ؟ یہ
تو منافق ہیں ۔ ان کے دل میں کچھ ، زبان پر کچھ ۔ یہ ہاتھ کے
بجائے خالی آستین پکڑانے والے دغا باز ہیں ۔ ظالم ہیں ،
بھائی بھائی کا خون پیتا ہے ۔ بیٹے اپنی ماؤں کو مارتے
ہیں ۔ بھائی اپنی بہنوں کو ذبح کرتے ہیں ۔ تو ایسی کیسے
ہوسکتا ہے ؟ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ۔ لیکن اگر تو ایسا ہوا
تو ..... کیوں ؟ ۔ اے معصوم بچے ۔ تجھے ہر ایک دیکھتا
اور پیار کرتا ہے ۔

کہتے ہیں کہ حکیم سقراط ، افلاطون ، ارسطو ، رازی
بوعلی سینا اور غزالی بھی ایکدن تیری ہی طرح زمانہ معصومیت
میں ہاتھ پیر مارتے رہے ہیں ۔ کیسے اچھے تیرے ساتھی تھے وہ ۔
ابن رشد ۔ جابر بن حیان ، کانٹ برکلے ، ہیوم اور ہیگل کے
ساتھ بھی تو کبھی دو دو ہاتھ کھیلا تھا ۔ اور بھی کچھ سنا
تو نے ؟ دنیا میں جتنے بھی عالم ، سائینسدان ، حکیم شاعر
اور ادیب چاہے وہ کالے ہیں یا گورے ؟ گندمی ہیں یا پیلے
سب ہی کیساتھ تیرا دامن چولی کا واسطہ ہے ۔ امرء القیس
رُومی ، سعدی ، حافظ شیرازی ، شکسپیر ، ملٹن گوئٹے
غالب اور اقبال سب کے سب تیرے ہی چمن کی بلبلِ ہزار داستان
تھے اگر یہ سب سچ ہے اور تو یہ بھی ہوسکتا ہے اور وہ بھی
تو مجھے تو تجھ سے ڈر لگنے لگا ہے ۔ میں تجھ سے دُور بھاگنے
کی کوشش کروں گا ۔ لیکن نہیں ۔ تُو تو ایسا خوبصورت
اور پیارا لگتا ہے ۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھ سے چنگیز خان
بنے ، یا تو ایسے کام کرے کہ دُنیا لرز اُٹھے ۔ یہ باتیں تو تجھے
نہیں سجتیں ۔ یہ تو نہیں ہوگا بلکہ شیطان ہوگا ۔ تُو تو معصوم
اور پاک ہے ۔ اے پیارے معصوم بچے ، تجھے ہر ایک
دیکھتا اور پیار کرتا ہے ۔

اے معصوم ۔ یہ دنیا میں روحانیت ، مذہب ، علم
اور فن و ہنر جو کچھ بھی ہے وہ کیسے عالم وجود میں آیا ؟
تو لایا ؟ اچھا تو ان پر بھی تیرا دعوٰی ہے ! تو تو عجیب راز
معلوم ہوتا ہے ! یہ بھی تیرے ہی کرشمے ہیں اور مادہ پرستی ،
ظلم و تشدد ، اور دوسروں کی حق تلفی بھی ۔ یہ کیا معمہ ہے ؟
تجھے کوئی پہچانیگا کیسے ؟ دنیا کے بزرگ اور اولیاء اللہ کو
بھی تو نے اپنایا ہے اور ابوجہل ، چنگیز خان ، نپولین اور

موت نازی گدھے (؟) پر سوار ہے۔

پندرہ روزہ رسالہ اردو

نن پرون

چندہ سالانہ تین روپے

قیمت فی پرچہ دو آنے (۲/)

سال دوم | ۲۵ ستمبر ۱۹۴۲ء | فہرست | ۱۳ رمضان المبارک ۱۳۶۱ھ | نمبر (۱۰)

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے:۔ ایڈیٹر۔ نن پرون (اردو ایڈیشن) راجپور روڈ۔ دہلی۔

کلامِ اکبر

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر چل رہا ہے
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے

فنا اسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے
شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے

یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرور غفلت سے کل تھا مملو
یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے

سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے نظر ہو جس کی وسیع دیکھے
ابھی یہاں خاک بھی اُڑے گی جہاں یہ قلزم اُبل رہا ہے

کہاں کا شرقی کہاں کا غربی تمام دُکھ سُکھ ہے یہ مُساوی
یہاں بھی اِک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

عرُوج قومی زوال قومی خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ ردّ و بدل کے اندر یہ امر پولیٹیکل رہا ہے

جنہوں نے طاعت میں جان دی ہے انہیں کے حصّہ میں زندگی ہے
مقدموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے

خدا سے تم دل ملاؤ اپنا زبان کو پھر ملاؤ دل سے!
تو دیکھ لینا کہ پُراثر ہے زبان سے جو نکل رہا ہے

جھکائیں اکبر سر ارادت ہمیں تو امید کچھ نہیں ہے
اُدھر وہ شمشیر کھنچ رہی ہے اِدھر یہ خنجر سنبھل رہا ہے

مزا ہے اسپیچ میں ڈنر میں خبر بھی چھپتی ہے پاینیر میں
فلک کی گردش کے ساتھ ہی ساتھ کام یاروں کا چل رہا ہے

(لسان العصرؒ)

(پشتو سے ترجمہ)

شعر۔ شاعری اور شعراء

(مولانا عبدالقادر)
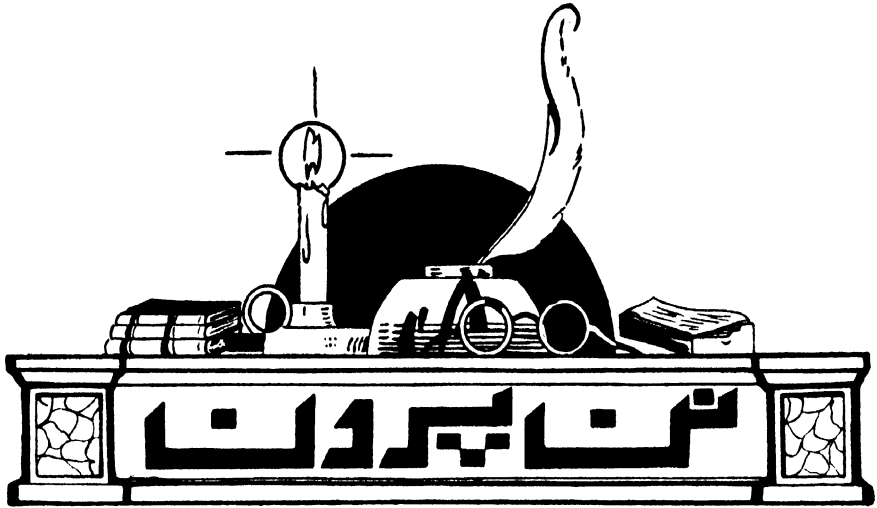
تاریخ ملل سے اگر ایک طرف بادشاہوں کے تنزل بین الاقوامی محاربات۔ اجتماعی۔ سیاسی اور اقتصادی حالات کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف اقوام کی ذہنی ترقیات۔ ادبی تشکیلات۔ قومی روحیات اور معنویات بھی صاف صاف نظر آتے ہیں۔ تاریخ کی ابتدائی دور سے لے کر اب تک ہر قوم کی مادی اور معنوی ترقی میں شعر و شاعری کا حصہ کم و بیش ضرور رہا ہے۔ یونان اور اہل روما اب تک ہومر اور ورجل کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ عرب تو فن شاعری میں کمال کی بدولت باقی دنیا کو بالکل عجم ہی سمجھتے تھے۔ اور زمانۂ جاہلیت میں تو امراء القیس اور ولید کے اشعار نے وہ کمال کر دکھایا کہ اگر کلام الٰہی کی فصاحت اور بلاغت غالب نہ آتی تو کعبہ کی دیواروں سے ان کا مٹانا ناممکن ہو چکا تھا۔

ایران نے بھی فردوسی۔ خاقانی۔ رومی۔ سعدی اور حافظ کے علاوہ ہزاروں شاعر پیدا کئے۔ سچ پوچھئے تو یہ

خطۂ ایران شعر و شاعری کے لئے نہایت زرخیز ثابت ہوا۔ یہاں شاعری خوب پھلی اور پھولی ۔

یورپ کی متمدن اقوام بھی اپنی ترقی میں شیکسپیئر۔ ملٹن۔ گوئٹے۔ پشکن وغیرہ کو بہت بڑے ممد اور برابر کا شریک سمجھتے ہیں ۔ رگوید اور مہابھارت تو ہندوستان کی مذہبی شاعری بن چکی ہے ۔ خاص کر کالیداس کے سادہ اشعار اور کہانیاں اب بھی ہر بزم کی رونق اور ویسے ہی روح پرور ہیں ۔ دورِ حاضر میں غالب ۔ حالی ۔ ٹیگور اور اقبال نے اس سنت کی تجدید کی

تہذیب چین کی تاریخ میں صرف سوکنگ تو کا ذکر کافی ہے مختصر یہ کہ ہر متمدن اور مہذب قوم کی تاریخ میں شعر و شاعری نے ایک ممتاز حیثیت پائی ہے ۔

میں عمداً افغان قوم کی شاعری کا تذکرہ سب سے آخر کر رہا ہوں ۔ اس مقالہ میں میرا روئے سخن دورِ حاضر کے اُن افغانی شعرائے کرام کی طرف ہے جن کو میں خوشحال خان خٹک اور عبدالرحمٰن کا صحیح جانشین سمجھتا ہوں ۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم بھی دوسری قوموں کی طرح اس میدان میں کچھ نہ کچھ دسترس رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں اور آج شعرا کی ممتاز جماعت میں ہمارے نمائندہ بھی دوش بدوش نظر آتے ہیں ۔ یہ اور بھی خوشی کا مقام ہے کہ افغان قوم میں اس وقت ایسے شعرأ موجود ہیں کہ اگر حالات نے ساتھ دیا تو وہ نہ صرف سابقہ روایات کی تجدید کر کے چھوڑیں گے بلکہ دورِ حاضر کے اخلاقی ۔ روحانی اور ذہنی حیات میں ایک ایسے زبردست انقلاب کی بنیاد رکھ سکیں گے جس سے ہمارا مستقبل روشن اور شاندار ہوگا ۔

مجھے اس مضمون میں چند نظریات کی طرف شعرائے کرام کی توجہ مبذول کرانا مقصود ہے نہ کہ شاعری پر بسیط تبصرہ ۔ کیونکہ اوّل تو تبصرہ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی کیونکہ شعرأ خود اہل کمال ہیں اور خداوند تعالےٰ کی عنایات سے مستفیض ہوتے ہیں ۔ تبصرہ سے اُن کے فن میں خاص اضافہ کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی ۔ دوسری بات یہ ہے کہ تبصرہ حقیقت میں اہلِ فن کے فطری جوہر پر کوئی خاص اثر بھی ڈال نہیں سکتا ۔

ہاں ۔ اگر دنیا کے مفکرین اور علمأ کے خیالات معرضِ بحث میں لائے جائیں تو ممکن ہے کہ اہل نظر کے استفادہ کا باعث ہو اور ان کی بصیرت میں اضافہ ہو سکے ۔

موجودہ ادبأ اور شعرأ شعر کی تعریف نہ معلوم کیا کریں گے البتہ شعر کے متعلق پرانا خیال یہ ہے : "شعر" سے مراد ایک موزون کلام جو ردیف اور قافیہ کا حامل ہو" یعنی جو بھی یہ توازن قائم رکھ سکے وہ شاعر ہے ۔ مغربی تعلیم کا نظریہ کچھ اور ہے جس کی رو سے غالباً آج اس قسم کی شعر سازی کو تک بندی یا قافیہ بندی کے نام سے موسوم کریں گے ۔ موجودہ زمانے کے مبصرین شعر کے ظاہری لباس کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے ۔ بعض کا خیال ہے " شاعری زندگی کا اخلاقی تبصرہ ہے" بعض تصوراتی اور جذباتی زبان سے شاعری مراد لیتے ہیں ۔ بعض کے نزدیک شعر ہی ترجمانِ فطرت ہے ۔ کوئی اسے مجسّم سچائی سمجھتے ہیں تو کوئی اُسے خدائی آواز سے تعبیر کرتے ہیں ۔ کارلائل کے خیال میں " شاعر ہی ایک ایسا انسان ہے جس کے لئے فطرت کے راز مستور ہیں اور کائنات میں مظاہرِ ربّی اسے روز روشن کی طرح نظر آتے ہیں "

کوئی شاعری کو مذہب کا نام دیتے ہیں۔

اب ذرا مخالف آراء بھی سُن لیجئے جو شاعر کو نقّال سے زیادہ نہیں سمجھتے مثلاً افلاطون نے تو شاعر کو نقّالِ نیکی کہا ہے یعنی نیکی کا نقال لیکن عمل سے بے خبر۔ نٹشے ذرا اور سختی سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے "کہ شاعر وہ جو دروغ بیانی سے کام لے علم ہیں صاف کورا۔ حافظے کا کُند اور ہمیشہ اپنے گرداگرد پانی اس لئے گندا رکھے کہ لوگوں کو گہرا معلوم ہو اور غرور میں سمندر سے کم نہ ہو"

لیکن میرے خیال میں دونوں نے مبالغہ بلکہ افراط اور تفریط سے کام لیا ہے۔ خیرالامُور اوسطہا کا قرآنی فیصلہ سب سے افضل ہے۔

"اَلشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ
وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ"

قرآن کریم نے شعراء کی متابعت کرنے والوں کی مثال ایسے لوگوں سے دی ہے جو پرنشیب گھاٹیوں میں مارے مارے پھریں اور راستہ سے بھٹک کر منزلِ مقصود کی تلاش میں پریشان اور سرگرداں ہوں۔

پس ان حالات میں اس کے قول و فعل میں مطابقت کیسے ہو۔ اور جب خود راہ گم کردہ ہو وہ دوسرے کی رہبری کیسے کرے۔ لیکن برخلاف اس کے اگر شاعر کے گفتار اور کردار میں چولی دامن کا ساتھ ہو تو قرآن کریم کا فیصلہ ناطق

فِیْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ

اس پر صادق نہیں آتا۔ مثلاً حسانؓ رسول اکرمؐ کا منظورِ نظر شاعر تھا۔ رسول اکرمؐ نے خود رجز کہے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ کتنے بلند اشعار کہہ سکتے تھے۔ شاعر کے دامن پر۔ بے عملی کے اس بدنما داغ نے اس کو کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اگر ایسا نہ ہو تو شاعر پر "ان من البیان لسحرا" صادق آئے۔

حقیقت میں شاعری فنونِ لطیفہ میں سب سے جاذب فن ہے۔ نطق یا کلام کے اعجاز کے بہترین اظہار کا آلۂ کار بھی یہ ہے۔ موزُون الفاظ میں جو توازن سُر۔ نغمہ اور کیف موجود ہیں وہ اور کسی چیز میں نہیں۔ اسی سے روحانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے فطرت کا حسن قائم اور دائم ہے۔ ننھا بچہ بھی ماں کی لوری سُن کر اس لئے سر دھنتا ہے کہ اسمیں موزونیت موجود ہے۔ اسی چیز سے شاعر انسانی تخیل فطرت اور انسانیت کی ترجمانی الفاظ میں کر سکتا ہے۔ قوتِ متخیلہ شاعر کی ایک نایاب متاع ہے جو اس کی دماغی اور جذباتی کیفیات کی ترجمان ہے اور شعر کا حقیقی سرچشمہ ہے۔ تخیل، توازن اور جذبات اس اجتماع کا کیا کہنا! شاعر اس کی بدولت حسنِ حقیقی سے ہمکنار ہو جاتا ہے قلبی جذبات کا اظہار بطریقۂ احسن کر سکتا ہے۔ اس کی تمام روحانی اور جسمانی ہستی میں کپکپی سی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر بات دل سے نکلنے لگتی ہے۔ تخیل بہت لطیف کیفیات محسوس کرنے لگتا ہے۔ روح اور جسم آپس میں آملتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر

الہام سے فیضیاب ہو رہا ہے۔ جلیل القدر شعرا ہمیشہ اس کیفیت کا لطف اٹھاتے ہیں کیونکہ حقیقی شاعر میں یہ کیفیت آنا ضروری ہے شاعری قومی معنویات اور ادبیات کو صحیح اور مفید راستہ پر تب ہی چلا سکتی ہے جب اس کی محرک ایسی کیفیت ہو۔ ایسے شاعر دنیا میں ایک خاص پیغام لیکر آتے ہیں۔ لیکن زمانے کے حالات اور ضروریات کے مطابق ہر شاعر کا پیغام دوسرے سے مختلف ہوتا ہے مثلاً خوشحال خان خٹک اور اقبال کے پیغام کو لے لیجئے لیکن یاد رہے کہ ایک خاص بلند نصب العین کی غیر موجودگی میں شعر میں تمام محاسن یکجا جمع نہیں ہو سکتے۔ شعر خواہ فنی کمال میں بے مثل کیوں نہ ہو۔ اگر اس میں معنوی لحاظ سے وہ بلندی نہ ہو جو بلند نصب العین سے اس میں پیدا ہو سکتی ہے تو اس کی مثال ایک ایسے خوبصورت پھول کی ہے جو خوشبو سے عاری ہو۔ دل چاہتا ہے کہ اس بارے میں ذرا اور تفصیل سے کام لوں اور موجودہ شعراء کے کلام کو آگے رکھ کر ان بلند پایۂ شعراء کی خدمت میں کچھ مزید عرض کروں۔ لیکن میرے خیال میں ان کی توجہ منعطف کرانے کے لئے یہی کچھ کافی ہے۔ میرا خیال صرف اس فن کے نصب العین کے متعلق کچھ عرض کرنے کا تھا اور بس۔ یقین واثق ہے کہ یہ خیالات شعراء کے لطیف جذبات۔ تیز تخیل اور نازک مزاج کو برانگیختہ کرنے کے لئے کافی و شافی ہیں۔

آخر میں یہ عرض کرنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ افغان قوم زندگی کے ایک عجیب اور نادر دور سے گذر رہی ہے۔ اس کے خوابیدہ جذبات اور قوٰے اب بیدار ہو رہے ہیں۔ اور چونکہ قوم کی اس بیداری میں دور حاضر کے شعراء کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس لئے میرا قوی یقین ہے کہ اس بیداری کو صحیح راستہ پر چلانے کے لئے وہ اپنی فطری قوتوں سے کام لیں گے۔ نیز اگر یہ بلند پرواز شعراء اپنی فطری جوہر کی حقیقت پر بھی ذرا غور کریں اور اس کو بروئے کار لائیں تو اپنے فن میں ید طولےٰ حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قوم کی امیدوں کی کشتِ زار کو بھی سرسبز اور شاداب کر دیں گے۔

عبدالقادر

رباعی

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فروتنی کو جا دیتا ہے
کرتا ہے تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے صدا دیتا ہے

(انیس)

رفتارِ زمانہ

ستمبر (ماہ حال) کی آٹھ تاریخ کو برطانوی وزیر اعظم مسٹر ونسٹن چرچل نے دار العوام میں لڑائی کے گذشتہ اور موجودہ حالات پر ایک محققانہ تبصرہ کیا۔ آپ کی اس تقریر کا لُب لباب یہ تھا کہ باوجود ان ناکامیوں اور مشکلات کے جن سے گذشتہ تین سال میں اتحادیوں کو دوچار ہونا پڑا۔ آج بحیثیت مجموعی اتحادیوں کی طاقت، ذرائع، استقلال اور آخری فتح کی اُمید میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے اور جوں جوں دن گذرتے جاتے ہیں انکی جارحانہ قوت اور کامیابی کے امکانات زیادہ سے زیادہ ہوتے جا رہے ہیں

مسٹر چرچل نے اپنی تقریر میں مشرق وسطےٰ اور ماسکو کے دورے کا بھی ذکر کیا اور جس صاف بیانی کے لئے وہ مشہور ہیں اس پر کاربند رہتے ہوئے انہوں نے صاف صاف یہ بھی کہہ دیا کہ جمہوریت روس کے لیڈروں کو اس بات کا گلہ ہے کہ اتحادیوں نے روس کیساتھ کشمکش حیات کے اس نازک ترین دور میں خاطرخواہ اور موثر امداد نہیں کی۔ وزیر اعظم موصوف نے اس شکوہ کے جواب میں موسیو سٹالن کیساتھ وعدہ کیا اور یقین دلایا کہ جلد از جلد برطانیہ اور متحدہ امریکہ نہایت وفاداری اور دیانت کیساتھ اپنی تمام طاقتوں اور ذرائع کو کام میں لاتے ہوئے اور اپنے نقصانات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے روس کی موثر امداد کیلئے عملی طور پر آگے بڑھیں گے۔

مشرقی (روسی) محاذ کے جنوبی مورچوں سے آئی ہوئی تازہ خبروں سے پتہ چلتا ہے کہ نازی اس محاذ پر دوسرے موسم سرما کی ناقابل بیان مشکلات اور سختیوں کا مقابلہ کرنے کیلئے کسی حالت میں تیار نہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ سردیوں کے شروع ہونے سے پہلے ہی سٹالن گراڈ اور کاکیشیا کو فتح کرنے کے لئے اپنی تمام بری اور ہوائی طاقت استعمال کرتے ہوئے سر کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔ آگ اور خون کی اس خوفناک بازی میں نازیوں کو قدم قدم پر سپاہیوں، اسلحوں اور مشینوں کے جو ناقابل تلافی نقصانات پہنچ رہے ہیں وہ اسکی پروا نہیں کرتے لیکن باوجود انکی انتہائی قربانیوں کے بھی ابھی تک کوئی خاص کامیابی انہیں نصیب نہیں ہوئی ہے سٹالن گراڈ اگرچہ تین طرفوں سے سخت خطرہ میں ہے۔ پھر بھی روسی جانباز جان توڑ مقابلہ جاری رکھتے ہوئے ہیں۔

روسی محاذ کے درمیانی مورچوں پر ہر جگہ روسی فوجیں نازیوں پر سخت حملے کر رہی ہیں اور ابتک بیشمار مقامات واپس لے چکی ہیں۔ کاکیشیا میں جرمن فوجیں کوہ قاف کے درّوں سے بحیرہ خضر کے ساحل تک پہنچنے کے لئے کوشش کر رہی ہیں لیکن اس علاقے کا چپہ چپہ روسی بہادروں سے بھرا پڑا ہے اور ہر قدم پر نازیوں کا سخت ترین مقابلہ کیا جا رہا ہے جوں جوں نازی فوجیں اپنے جنگی مرکزوں سے دُور ہوتی جاتی ہیں ان کی مشکلات میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے دوسری طرف روسی ہوا بازوں نے دنرات جرمنی کے اہم فوجی مرکزوں اور صنعتی شہروں پر اپنی تمام تباہ کن بمباریوں سے قیامت برپا کر رکھی ہے۔

موجودہ لڑائی جتنا طول پکڑتی جاتی ہے اور جتنا نازی روسی

علاقوں میں گھستے جاتے ہیں اتنا ہی روسیوں کے جذبۂ حب الوطنی اور جنگی جوش وخروش زیادہ ہوتے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ نازیوں نے رُوس کے اکثر صنعتی شہر اور اہم علاقے فتح کئے ہیں۔ لیکن روسیوں کی دور بین نگاہوں نے پہلے ہی سے ایسے حالات کے امکانات پر غور کرتے ہوئے بے شمار جنگی کارخانے اور صنعت وحرفت کے اہم مراکز ملک کے اندرُونی حصّوں یعنی یورال کے پہاڑی علاقوں میں منتقل کر دیے تھے جہاں اب وہ پوری رفتار سے کام کر رہے ہیں اور ان ہی کی بدولت روسی جانباز آخر تک مقابلہ جاری رکھ سکنے کے قابل ہیں۔

مصری محاذ پر العلمین کے جنوب میں پچھلے دنوں محوری افواج نے جو بڑا حملہ کیا تھا وہ ناکامیاب ثابت ہوا۔ محوری فوجیں سپاہیوں اور سامان جنگ کا کافی نقصان اٹھانے کے بعد اپنے مورچوں کو واپس چلی گئی ہیں۔ اتحادی افواج نے اس حملہ کا مقابلہ کرنے کے لئے کافی تیاری کر رکھی تھی۔ چنانچہ اس جھڑپ میں برطانوی توپوں اور اتحادی ہوائی جہازوں نے دشمن پر وہ غضب کی آگ برسائی کہ اُسے بھاگتے ہی بن پڑی۔ اس ناکامی کے بعد سنا جاتا ہے کہ جرمن جرنیل رومیل بیمار ہو کر کسی ہسپتال میں آج کل زیر علاج پڑا ہے۔

گذشتہ مہینے (اگست) کے شروع میں جاپانی وزیر اعظم جرنیل ٹوجو نے جاپان کے سمندری جہاز بنانے والی کمپنیوں کے ایک نمائیندہ جماعت کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس خوف و پریشانی کا اظہار کیا تھا جو جاپان کے تجارتی جہازوں کے روز افزوں نقصانات کی وجہ سے جاپانی حکومت کو لاحق ہو رہی ہے۔ اس تقریر کے کچھ دنوں بعد ہی دُنیا کی آنکھوں میں دُھول ڈالنے کے لئے جاپان کی ایک جہاز ران کمپنی نے دنیا کی تمام طاقتوں کے سمندری نقصانات کی ایک فہرست شایع کی۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ اب تک جاپان کے صرف چار بڑے تجارتی جہاز ڈبوئے گئے ہیں! لیکن ایک دنیا جانتی ہے کہ اب تک جاپان کے کم از کم اکیاون (۵۱) تجارتی جہاز سمندر کی تہ تک پہنچائے جا چکے ہیں۔ جن میں تین ہزار ٹن سے لے کر سات ہزار ٹن تک کے جہاز شامل تھے

پانچسال کی متواتر جنگ اور اپنی پوری طاقت استعمال کرنے کے بعد بھی آج جاپانی چین میں اپنی منزل مقصود سے اتنے ہی دور ہیں جتنے کہ پانچسال پہلے تھے۔ چینی بہادر نہ صرف تن تنہا جاپانیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں بلکہ اب تو بہت سے مورچوں پر ان کو پیچھا لیا ہے۔ اور بے شمار اہم مقامات واپس لے چکے ہیں۔ جاپانیوں کا یہ خیال تھا کہ برما فتح کرنے کے بعد چینیوں کے لئے باہر سے امداد کا رستہ بند ہو جائے گا اور مجبور ہو کر وہ خود ہی ہتھیار ڈال دیں گے۔ لیکن چین کے غیور فرزندان وطن نے یہ ثابت کر دکھایا کہ وطن اور آزادی کی خاطر وہ بیرونی امداد کے بغیر بھی آخری سانس تک مقابلہ جاری رکھنے کا مصمم ارادہ رکھتے ہیں۔

متحدہ امریکہ میں آج کل جس تیز رفتاری سے لاتعداد جنگی ضروریات کے سامان اسلحہ مشینیں، ہوائی جہاز اور سمندری جہاز وغیرہ تیار کئے جارہے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ حال ہی میں امریکہ کے ایک مشرقی بندرگاہ کے قریب جہاز سازی کے ایک کارخانہ میں یکے بعد دیگرے دس دس ہزار ٹن کے پانچ لادو جہاز جو برطانیہ کے لئے تیار کئے گئے تھے پانی میں اُتارے گئے۔

چند روز پہلے اسی طرح ایک اور کارخانہ میں دو تباہ کن جہاز ایک ہی دن میں سطح سمندر پر ڈالے گئے اور اُسی دن ایک مغربی بندرگاہ پر دس ہزار ٹن کا ایک تجارتی جہاز مکمل ہؤا اور صرف چند دن ہی گذرے تھے کہ اتنا ہی بڑا ایک اور جہاز سمندر میں اتارا گیا۔ اس جہاز کی تیاری میں صرف چھیالیس (۴۶) دن لگے تھے۔

امریکہ کی ایک تازہ اطلاع سے پتہ چلتا ہے کہ ٹرانس فلورڈا میں تیل کا جو سرکاری کارخانہ تیار ہؤا ہے وہ یکم اکتوبر سے کام شروع کردے گا۔ یہ کارخانہ ایک دن میں پینتیس ہزار تیل کے پیپے تیار کریگا۔

مشرق وسطےٰ کے اسلامی ممالک میں نازیت کیخلاف مسلمانوں کا جوش وخروش اور جذبۂ نفرت دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور تمام سربرآوردہ لیڈر اور اخبارات میں رسائل جمہوریت کے حق میں اور نازیت وفسطائیت کے برخلاف تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے اپنے اندرونی جذبات کا علانیہ اظہار کر رہے ہیں۔ چنانچہ بغداد شریف کا ایک مشہور اخبار ایک مقالۂ افتتاحیہ میں "عرب اور اتحادی" کے زیر عنوان لکھتا ہے کہ

"عرب دنیا میں پہلی وہ قوم ہے جس نے جمہوری طرز حکومت کو قبول کیا اور فروغ دیا کیونکہ جمہوریت کے اصول مذہب اسلام کے ساتھ منسلک ہیں"۔

اسی طرح ایک اور مشہور جریدہ الاخبار عراقی ریڈیو سے نشر شدہ ایک تقریر شایع کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ

"ہم عربستان کے رہنے والے تمام لوگوں کو اس کھلی ہوئی حقیقت سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ اُن کے ارادے اور خواہشات اس وقت تک شرمندۂ تکمیل نہیں ہوسکتیں۔ جب تک کہ جمہوری طاقتوں کو مکمل فتح نہ حاصل ہو۔ کیونکہ عالمگیر اور پائیدار امن وامان کے لئے جمہوریت بنیادی چیز ہے اگر خدانخواستہ نازیوں کو فتح حاصل ہوئی تو سمجھ لینا چاہئے کہ عرب اقوام کی قومی زندگی کا خاتمہ ہوچکا۔ ایسی حالت میں

رباعی

رِندوں سے نہ یوں چھوٹ کر اُدھر بیٹھئے
تیری مجلس میں غنیمت ہے جا بجا بیٹھئے
ہے غرض دید یاراں کام تکلف نہیں
خواہ اِدھر بیٹھئے خواہ اُدھر بیٹھئے

رنجبر

عرب ممالک نازیوں کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اور وہ جس طرح چاہیں گے فائدہ اٹھائیں گے۔

اس خطرۂ عظیم سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ ہم سب مل کر ڈکٹیٹروں کے وہ منصوبے ملیا میٹ کردیں جو عرب ممالک میں پھوٹ ڈالنے کے لئے باندھے جا رہے ہیں اور اس کے بعد ایکا کر کے ڈکٹیٹریت کے خاتمہ کے لئے ہر ممکن کوشش کریں۔

افغانستان

حکومت افغانستان نے تین افغان طلبا کو حکومت پنجاب کے زراعتی کالج میں ٹریننگ حاصل کرنے کے لئے بھیجنے کا بندوبست کیا ہے۔ یہ ٹریننگ چار سال کے عرصہ میں جاکر ختم ہوگی۔ نیز حکومتِ ہند کی امداد سے یہ بھی انتظام ہوا ہے کہ آئندہ موسم سرما میں کئی ایک افغان طلباء کو ہندوستان میں صنعتِ نمک سازی کی ٹریننگ دیجائیگی

شیران میں سرکاری دفاتر کی نئی عمارات مکمل ہوچکی ہیں اور اب تمام دفاتر وہاں پر منتقل کردیے گئے ہیں۔

شہنشاہ جارج ششم کے چھوٹے بھائی شہزادہ کینٹ کی افسوسناک موت کی خبر سنتے ہی والاحضرت صدر اعظم اور والاحضرت وزیر خارجہ، حکومتِ افغانستان نے برطانوی سفیر مقیم کابل کو ماتم پرسی کے خطوط بھیجے اور ان میں شہزادہ مرحوم کے بیوقت انتقال پر اظہار افسوس و ہمدردی کیا۔

کابل میں رہنے والے ہندوستانی باشندوں نے بھی ایک ریزولیوشن کے ذریعہ شہزادہ کینٹ کے انتقال پرملال پر انتہائی ہمدردی اور افسوس کا پیغام برطانوی سفارت خانہ کابل کو بھیجا۔

بلند بال تھا لیکن نہ تھا جسور و غیور
حکیم سرِ محبت سے بے نصیب رہا
پھرا فضاؤں میں کرگس اگرچہ شاہیں وار
شکارِ زندہ کی لذت سے بے نصیب رہا

اقبالؔ

سجدوں کا بھی متوقع نہ رہا اہلِ وفا کو
سر پھیر کے ہٹاتے ہیں وہ نقشِ کفِ پا کو
یوں ہم نے چھپائی ہے ترے وصل کی حسرت
جس طرح چھپاتا ہے خطاوار خطا کو

رساؔ

پشتو رسم الخط

:- (جناب عبدالخالق صاحب خلیق سڑانگی شریف) :-

مندرجہ بالا عنوان سے مولانا عبدالقادر صاحب کا مضمون مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۲ء کا میری نظر سے گذرا۔ اس بے پناہ محبت اور دلچسپی کی وجہ سے جو میں اپنی زبان سے رکھتا ہوں میں یہ مضمون پڑھ کر پھولے نہیں سمایا۔ اس لئے نہایت خلوص کے ساتھ میں "نن پرون" کو مبارکباد دیتا ہوں جس نے "اخبار سرحد" کے ایک کہنہ مشق ادیب کو پشتو زبان کی طرف متوجہ کیا ہے جو بدقسمتی سے ابھی تک گوشۂ فراموشی میں پڑی ہوئی تھی۔

یوں تو ہر ایک افغان پشتو (افغانیت) کو مذہب جیسا عزیز سمجھتا ہے بات بات میں کہتا ہے کہ وہ 'پشتو' کو کیسے چھوڑے۔ لیکن افسوس کہ زبان کے متعلق اس کے احساسات ابھی تک خوابیدہ ہیں۔ سوائے چند کے اکثر افغانوں نے پشتو زبان سے قریبًا لاتعلقی کا ثبوت دے دیا ہے اسلئے دُعا ہے کہ اس خدمت کے عوض میں مولانا عبدالقادر صاحب پھر ہیڈ ماسٹر بنیں۔ انہوں نے ایک لمبا مضمون سپرد قلم کیا ہے لیکن میرا خیال ہے کہ مولانا صاحب نے زبان کے ایک غیر ضروری پہلو کو مبحث بنایا ہے کیونکہ پشتو زبان اس وقت رسم الخط میں اصلاح کی محتاج نہیں بلکہ اس وقت یہ ضروری ہے کہ افغان پشتو میں لکھنے اور پڑھنے پر مجبور کئے جائیں تاکہ پشتو کی جھولی علم و ادب سے بھر جائے۔ لیکن یہ مقصد صرف اس وقت حل ہوگا جب تعلیم یافتہ افغان مختلف مقامات پر پشتو ادبی جرگے قائم کریں جو ماہوار سہ ماہی ششماہی اور سالانہ اجلاس منعقد کرنے کا انتظام کریں۔ ان اجلاسوں میں منظوم اور منثور مضامین پڑھے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ قوم کے بااثر حضرات کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ بھی کیا جائے کہ سکولوں میں ذریعہ تعلیم پشتو ہو اور دیگر کاروباری معاملات بھی پشتو زبان میں ہوں۔ تعلیم یافتہ افغان تصانیف اور تالیفات میں مشغول ہو جائیں۔ قوم کے آگے ڈرامے اور ناول پیش کریں رسالہ جات جاری کریں۔ تمام علوم اور فنون کے تراجم کے علاوہ اپنی خط و کتابت اور لین دین بھی پشتو زبان میں ہو اور پشتو زبان کی صرف بھی اس قابل ہو کہ وہ دیگر زبانوں کا ہم پلّہ ہو سکے۔

مجھے احساس ہے کہ یہ کافی مشکل کام ہے بڑی محنت اور کاوش کے بعد کہیں جاکر کامیابی سے ہمکنار ہونا پڑے لیکن میرا ادعا یہ ہے کہ اگر افغانوں کو اپنی مادری زبان کی خدمت کرنا مقصود ہے تو چاہیئے کہ اُسے اچھی طرح رواج دیں اور عام کریں۔ رہا رسم الخط کا مسئلہ تو میں نہایت ادب کیساتھ مولانا صاحب سے اُنکی مندرجہ ذیل باتوں میں اختلاف رکھنے کی جرأت کرتا ہوں۔

(ا) پشتو کے حروف تہجی میں سے چند مخصوص حروف مثلاً ځ ـ څ ـ ږ ـ ښ کا نکالنا۔

(ب) پشتو کے حروف ټ ـ ډ ـ ړ ـ ګ کو اردو کے حروف ٹ ـ ڈ ـ ڑ ـ گ سے بالترتیب تبدیل کیا جانا۔

(ج) پشتو رسم الخط کا اردو نستعلیق سے بدل دینا۔

(د) کبّن جو کشتے کا قائم مقام ہے اس کو کہ سے لکھنا اور تلفظ میں آواز کا خیال رکھنا۔ یہ تو مولانا صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں کہ مندرجہ بالا حروف بغیر مطلب کے وضع نہیں کئے گئے اور واضع اول ضرور صاحب الرائے تھے جنہوں نے تمام قبائل کے مخصوص تلفظ کی رعایت سے کام لیا ہے۔ اب ایسی کون سی ضرورت آپڑی ہے کہ اتنے بڑے بڑے قبائل کے تلفظ کا خیال نہ رکھیں اور پشتو زبان کے لئے یوسف زئی یا پشاوری زبان ہی معیار مقرر کریں۔

ان چار حروف اور صرف کبّن نے ایک طرف تو مختلف قبائل کی زبانوں میں تعلق قائم رکھنے کی کوشش کی ہے اور دوسری طرف فارسی الفاظ کی اصلی شکل بحال رکھنے میں مدد کی ہے۔ بفرض محال اگر یہ حروف ځ - څ - ږ - ښ کو ز - س - گ - خ سے بدل دیں تو لازماً پشتو زبان دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ پشاور - مردان - سوات اور باجوڑ کے افغان ایک قسم کی زبان اور خٹک - افریدی - وزیر - محسود اور افغانستان کے لوگ دوسری قسم کی زبان لکھیں اور پڑھیں گے اور دونوں کے لئے ایک دوسرے کی خط و کتابت کا سمجھنا مشکل ہو جائے گا فارسی کے حروف کو اصلی حالت پر قائم رکھنے سے یہ مراد نہیں کہ ہمارا تعلق فارسی سے قائم رہے بلکہ یہ تو اردو دان طبقہ کے لئے آسانی پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً پېښاور - پښتو - څادر - څپلئ کو اردو میں پشاور - پشتو - چادر اور چپلی لکھتے ہیں۔ یہ بہ نسبت اس کے آسان ہے کہ ہم ان کو پخاور - سادر - سپلئ اور سوکیوار وغیرہ لکھیں علاوہ اس کے غیر یوسف زئی لوگ ان کا تلفظ بھی فارسی کی طرح کرتے ہیں۔ یہ بھی تسلیم شدہ امر ہے کہ ہر نئی زبان میں قدیم زبان کے الفاظ داخل ہو جاتے ہیں جو بعد میں جا کر نئی زبان کی ملک ہو جاتے ہیں لیکن اُن کا تلفظ بحال رہتا ہے مثلاً فارسی میں آدھے سے زیادہ الفاظ عربی کے ہیں لیکن ان کو اب کون عربی الفاظ کہے باوجودیکہ وہ اصلی رسم الخط میں رائج ہیں اسی طرح اردو میں بھی کافی الفاظ فارسی اور عربی کے ہیں لیکن وہ اردو کے اپنے تصوّر ہوتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ پشتو اس مسلمہ کلیہ سے انحراف کرے اور اپنا رشتہ فارسی سے توڑ دے۔

رہا یہ سوال کہ لفظ اس کی آواز کے مطابق لکھا جائے۔ میرے خیال میں پشتو زبان کو اس کی بدقسمتی کی وجہ سے اس اصلاح کیلئے منتخب کیا گیا ہے۔ دیگر عالمگیر زبانیں تو اس اصلاح سے محروم بلکہ اس دستبرد سے بچ گئی ہیں مثلاً عربی کے الفاظ ادنیٰ - اعلیٰ - فی الحال اردو اور فارسی میں اب تک مستعمل ہیں اور آواز کے اعتبار سے ان کو ادنا - اعلا - فلحال کسی نے نہیں بنایا۔ علاوہ ازیں انگریزی اور عربی میں اکثر الفاظ آپ کو ملیں گے جو لکھنے اور بولنے میں اختلاف رکھتے ہوں کئی زائد حروف بھی ایسے لکھے جاتے ہیں جو پڑھنے میں نہیں آتے تو پھر پشتو کو اس قاعدہ سے کیوں محروم کیا جائے۔

فارسی اور اردو کے حروف تہجی میں ث - ذ - ص - ض - ط - ظ خالص عربی حروف ہیں اور اپنی آواز نہیں رکھتے۔ کیونکہ ث - ص - س ذ - ض - ظ - ز اور ط - ت تقریباً ہم آواز ہیں لیکن اردو فارسی زبانوں سے نہیں نکالے گئے اور نہ ہی یہ الفاظ ان کے تلفظ کے مطابق تبدیل ہوئے ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ثواب اور ثبوت کو ہم سواب اور سبوت لکھتے۔ صبر اور صرف کو سبر اور سرف لکھتے۔ علیٰ ہذا القیاس۔

مولانا صاحب کی یہ تجویز کہ ټ - ډ - ړ - ګ کو فارسی کے حروف ٹ - ڈ - ڑ - گ سے تبدیل کریں صرف اس وقت عملی جامہ پہنائے جانے کے قابل ہو سکتی ہے جب ہمیں فارسی طرز میں بنسبت پشتو کے سہولت

نظر آئے۔ میرے خیال میں تو مندرجہ بالا حروف کے نیچے نشان لگانا بنسبت ڈ لگانے کے آسان ہے جو ایک جدا حرف کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ صورت میں پشتو کی خصوصیت بھی باقی رہتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ قدیم طرز تحریر کی جگہ اردو نستعلیق اختیار کرے کیونکہ لوگ اردو سے زیادہ آشنا ہیں۔ اس لئے اس میں ان کو کم دقت پیش آئے گی۔

اس بارے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ چونکہ پشتو ایک زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور قریباً ایک کروڑ سے زیادہ لوگوں کی بولی ہے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ اتنی بڑی زبان اپنا مخصوص رسم الخط ایک دوسری زبان میں جذب کردے۔ اگر افغان پشتو رسم الخط سے بیگانہ ہو چلے ہیں تو اس میں غریب زبان کا کیا قصور ہے کہ ہم اس کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالیں۔ اس سزا کے تو افغان سراسر سزاوار ہیں کہ انہوں نے اپنی مادری زبان سے اتنی بے اعتنائی دکھائی۔ پس ہمارا یہ فرض ہونا چاہیئے کہ افغانوں کو ان کی غلطی محسوس کرائیں تاکہ وہ پھر اس طرف رجوع کریں۔ کیونکہ بصورت دیگر اس کے یہ معنی ہوئے کہ درد تو ہو کمہار کے پیٹ میں اور علاج کیا جائے اس کے گدھے کا

زبانوں کی تاریخ سے یہ صاف ظاہر ہے کہ عربی زبان بھی اسلام کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک پر قابض ہوتی چلی گئی اور تمام مسلمان عربی نستعلیق پر حاوی ہوتے چلے گئے۔ اور اس کے باوجود کہ فارسی زبان پر عربی کا کافی اثر تھا اس نے اپنا رسم الخط چھوڑ کر عربی رسم الخط کبھی اختیار کرنا گوارا نہیں کیا۔ صوبہ سندھ کی مثال لیجئے۔ یہاں بھی عربی رسم الخط جاری ہے۔ اور سندھی اردو کے ساتھ گہرے تعلق ہونے پر بھی اپنے رسم خط کو قائم رکھ سکے ہیں جیسا کہ میں عرض کرچکا ہوں پشتو ایک علیحدہ زبان ہے اور جو بھی اسے پڑھنا اور لکھنا چاہے اسے ضرور کچھ نہ کچھ تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا کہ سیکھے تو وہ اردو اور جان جائے پشتو۔ پشتو زبان کی حیثیت اس پودے کی سی ہے جو مدت سے کاشت ہونے پر بھی مالی کی توجہ سے محروم رہا اور پورا درخت نہ بن سکا ہو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اس پودے کی آبیاری کی جائے اس کیلئے زمین ہموار کر کھاد ڈالی جائے تاکہ یہ پھلے پھولے اور درخت بنے۔ لیکن برخلاف اس کے مولانا صاحب مدت کے بعد جب اس پودے کی طرف متوجہ ہوئے تو بجائے نشو و نما دینے کے وہ کانٹ چھانٹ کرنے لگے۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ اس پودے کو اب تک کسی نے نہیں چھیڑا یہ ضرور شاخ تراشی کا محتاج ہے۔ میں ان کے اس خیال کا مخالف نہیں ہوں کہ زبان کی اصلاح ضروری ہے بلکہ اس ضمن میں چند تجاویز میرے بھی زیر غور ہیں لیکن میں یہ ہرگز نہیں چاہتا کہ پشتو سے مخصوص حروف نکال دیئے جائیں بلکہ میرا یہ خیال ہے کہ کتابوں میں عربی طرز قائم رکھی جائے جیسا کہ اب ہے لیکن خط و کتابت میں چند حروف مثلاً رٓ۔ سٓ۔ شٓ۔ ھٓ۔ ھٓ وغیرہ فارسی کے حروف رٓ۔ سٓ۔ شٓ۔ مٓ اور ہٓ کی طرز پر لکھے جائیں۔ اس طرح لکھنے میں کم وقت صرف ہوگا مثلاً راشہ اور سمہ کی جگہ راشہ اور سم لکھنا آسان ہے اسی طرح اگر تمام حروف فارسی حروف کی طرز پر لکھے جائیں تو بہتر ہوگا مثال کے طور پر یہ مصرع لیجئے

"زہ دیار پہ درد و غم کبن غرقاب خو بن یم"

اس کو اگر ایسا لکھا جائے

"زہ دیار پہ درد و غم کبن غرقاب خو بن یم"

تو جلدی لکھا جاسکے گا۔ انگریزی کتابی حروف اور خطوط کے حروف میں بھی ایسا ہی فرق ہے۔

دوسری تجویز یہ ہے کہ پشتو کے حروف تہجی میں ایک حرف زائد کیا جائے جو ژ کا ہم جنس ہو۔ (بقایا بر صفحہ ۲۰)

قدیم اور جدید اخلاق

(از قلم ——— (۳) ——— شاعر)

گذشتہ سے پیوستہ

اس لئے مناسب ہے کہ وہ تمام افراد جن کی مثال سوسائٹی میں عضو معطل کی ہے ۔ خود اپنے آپ کو موت کے لئے پیش کریں کیونکہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو نہ صرف نسل انسانی کی طاقت بیجا اور بیفائدہ خرچ ہو کر رہ جائے گی بلکہ اس کے ساتھ صحیح اور صالح افراد کا ترقی اور تہذیب سے محروم رہنا بھی یقینی ہے ۔ اس کا ایمان ہے کہ جو فرد یا قوم مندرجہ بالا اصول کے سمجھنے سے قاصر ہو اور قدرتی اشارات سے آگاہ اور مستفید ہونے کی کوشش نہ کرے وہ یقیناً جنگ سعی للبقاء میں پیچھے رہ جائے گی اور صفحۂ ہستی سے مٹ کر رہے گی۔ اس کے خیال میں دنیا کی ترقی کے لئے چند لیکن صالح افراد کی ضرورت ہے یعنی وہ اس قابل ہوں کہ فلسفۂ قوت کے اصول کے مطابق زندگی بسر کر سکیں ۔ الغرض اس کے اخلاقی فلسفہ کا لب لباب ایک فطری طاقتور جماعت کی تخلیق ہے ۔ اس کے نزدیک اس جماعت سے مراد دنیا کی موجودہ دولتمند اور مالدار جماعت نہیں بلکہ وہ جماعت ہے جو جنگ سعی للبقاء میں اپنی فطری طاقت کے بل بوتے پر زندہ رہ سکے ۔ اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ وہ جماعت کامل جسم اور کامل عقل کی مالک ہو اور اس کے دل میں غلبہ طاقت اور تسخیر کا بے پناہ جذبہ ہر وقت موجزن رہے ۔ نیز طاقت اور قوت وغیرہ صفات بھی بنسبت دیگر افراد کے اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہوں ۔ نٹشے کے نزدیک کمزور ناتوان اور غریب مخلوق قابل رحم ہرگز نہیں بلکہ واجب القتل ہیں ۔ لیکن یاد رہے کہ اس کا غریب اور ناتوان انسان وہ ہے جو فطرتاً طاقت اور قوت جیسی صفات سے محروم ہو بلکہ طاقت حاصل کرنیکے قابل ہی نہ ہو ۔ اور ان وجوہات سے کشمکش حیات میں دوسرے افراد سے پیچھے رہ گیا ہو ۔ اصول طاقت کے فطری اصول کا وہ عامل نہ ہو اور دوسروں کے لئے بار خاطر ہو ۔ اس سے ثابت ہوا کہ نٹشے کی تمام تر ہمدردی فطری طاقتور لوگوں سے ہے اور اس کے نزدیک تہذیب اور تمدن سے مراد فطرتی طاقتور شخصیتوں کا پیدا کرنا ہے ۔ عام لوگوں کی طرح فطری کمزور لوگوں سے ہمدردی رکھنا اس کے خیال میں ایک جرم عظیم ہے ۔ پس وہ پرزور الفاظ میں دنیا کو یہ تعلیم دینا چاہتا ہے کہ دنیا میں تہذیب اور تمدن کی ترقی صرف اسی میں ہے کہ یہاں فوق البشر پیدا ہوں اور کمزور اور ناتوان مخلوق کیساتھ ہمدردی رکھنا اور محبت کرنا درحقیقت فوق البشر کی ترقی میں ناقابل برداشت رکاوٹ ہے ۔

نٹشے کے خیال میں یہ ہمارے مذہبی اخلاق کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ کئی زمانے گذرنے کے بعد جب کبھی ہمارے چمن میں کوئی دیدہ ور یعنی فوق البشر پیدا ہوا تو بجائے اس کے کہ اس کے ساتھ ہمدردی اور محبت کی جاتی اُسے طرح طرح کی اذیتیں دی

گئیں اور اس کا تمسخر اڑایا گیا۔ یہ تمام ہماری کوتاہ اندیشی ہے کہ تہذیب اور تمدن کی نشوونما ناممکن کر دی گئی اور انسانی تہذیب نے غلط رُخ اختیار کر رکھا کیونکہ انسان نے بیکار اور بے حقیقت کاموں کو تو وقعت دے دی لیکن کارآمد چیزوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اس کے خیال میں مذہبی اخلاق نے دنیا کی فضا اتنی مسموم کر دی ہے کہ فوق البشر کی محنت کوئی ثمر نہیں لا سکتی۔ اس کے ارادے کامیاب نہیں ہو سکتے اس کے لئے یہ وہ بنجر زمین ہے جس کے سینہ میں اس پودے کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ چونکہ اس کی تمام ہمدردی فوق البشر کے ساتھ ہے اس لئے اس کی مناسب تخلیق اور تربیت کے لئے یہ اشد ضروری ہے کہ مذہبی اخلاق کی جگہ صحیح اور بہترین اخلاقی فضا پیدا کی جائے یعنی ایسی فضا جو فوق البشر کی ترقی اور تربیت کیلئے سازگار اور ممد ہو نٹشے مذہبی اخلاق کا اس لئے بھی سخت مخالف ہے کہ مذہب انسان کو یہ تلقین کرتا ہے کہ وہ اندھوں۔ لنگڑوں معذور

اور مجبور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور ہر انسان خصوصاً ہمسایوں کیساتھ محبت اور اخلاص سے پیش آئے خواہ وہ کشمکش حیات میں نااہل کیوں ثابت نہ ہو چکے ہوں اس کے خیال میں یہی وہ اخلاق ہیں جو نسل انسانی کے تنزل کا باعث ہیں اور بحیثیت مجموعی تمام نسل انسانی کی موجودہ کمزوری کا سبب۔ یہ اخلاق انسان کو حقیقی طاقت حاصل کرنے سے روکتے ہیں۔ اخلاقِ جدید کی رو سے فوق البشر ہی صرف ہماری ہمدردی کے لائق اور ہماری محبت اور خدمت کا مستحق ہے یعنی صرف وہی انسان جو قوت رکھے اور جہد للبقار میں بازی لے جا سکے اور قدرت نے اصول صلاحیت کے ماتحت اُسے چن لیا ہو کیونکہ ایسا انسان ہی صرف صحیح معنوں میں عام لوگوں کے لئے صحیح رہنمائی کی صلاحیت رکھ سکتا ہے اور انسانی صحیح تہذیب اور تمدن کا ذمہ وار اور ضامن ٹھیر سکتا ہے۔ یہ نٹشے کے نئے اخلاق اور نئے فلسفہ کا نچوڑ تھا جو بیان کیا گیا ہے۔ ان نئے اخلاق نے اب ایک عالمگیر سوشل صورت اختیار کر لی ہے۔

بقیہ مضمون صفحہ نمبر (۲۲)

حمایت کرتا بھی ہو تو وہ اس لئے نہیں کہ وہ اُن سے دلی ہمدردی رکھتا ہے بلکہ حالات سے مجبور ہو کر۔

علاوہ اس کے کھیل کود اور جسمانی کسرت کے تمام میچ اور نمائشیں بھی فوجی انتظام کے ماتحت ہوتی ہیں اور جاپانی پراپیگنڈا ان کا سب سے بڑا مقصد ہوتا ہے

غرضیکہ آج کل مشرق بعید کے اسلامی ممالک پر ایک ایسا جابر اور اجنبی فوجی نظام حکمران ہے جو قومیت، مذہب، تہذیب و تمدن اور زبان پر ہر لحاظ سے غیر مانوس اور ناقابل قبول ہے اور جس کا واحد مقصد یہ ہے کہ ان علاقوں میں مکمل طور پر جاپانیت پھیل جائے اور ہر چیز جاپانی اثر و اقتدار کے ماتحت آجائے

تاریخ پشاور

(ایم۔ اے۔ شکور بی۔ اے کیوریٹر پشاور۔ میوزیم)

آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے یعنی قریباً ۵۰۰ قبل مسیح میں صوبہ پشاور سلطنت ایران کا ایک حصہ تھا۔ اس کا ثبوت ایران کی قدیم کتب بے ستون اور نقش رستم میں موجود ہے۔ بلکہ تاریخ سے یہاں تک ثابت ہے کہ یہاں کے سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج ایران کیطرف سے یونانیوں کے مقابلہ میں بھی لڑی تھی۔ ایران فتح ہونے کے بعد سکندر اعظم جلال آباد پہنچا۔ یہاں اس نے اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کو خیبر کے راستے اٹک روانہ کیا تاکہ وہاں پہنچ کر کشتیوں کا پل تیار کرے۔ دوسرا حصہ سکندر کی اپنی سرکردگی میں کونڑ باجوڑ اور سوات کی طرف روانہ ہوا۔ جب پہلا حصہ پشاور میں داخل ہوا اس وقت پشاور میں ایک ہندو راجہ استینز نام کی حکومت تھی اور اس کا دارالخلافہ چارسدہ تھا۔ دو ماہ لڑائی کرنے کے بعد راجہ آخر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوا۔ یونانی جرنیل فلپ نامی ایک فوجی دستہ کو ساتھ لے کر وہاں خیمہ زن ہوا۔ اور باقی فوج گجرات بخشالی۔ شہباز گڑھ اور لاہور سے ہوتی ہوئی ہنڈ جا پہنچی۔ اور سکندر اعظم کا انتظار کرنے لگی۔

(یہاں پر یہ ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ قدیم زمانہ میں یہ متذکرہ بالا مقامات ہندوستان اور وسطی ایشیا کے درمیان تجارتی شاہراہ پر واقع تھے)

سکندر کو سوات پہنچکر ایک ہندو راجہ اساکونیز سے لڑنا پڑا۔ راجہ چند دن خوب لڑا۔ لیکن مقابلہ کی تاب نہ لاکر ایک رات فوج کے ساتھ اپنی جگہ سے نکل پڑا اور آرانوس نام قلعہ میں جا بیٹھا۔ یہ قلعہ چکیسر کے پہاڑوں میں ۸ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ اور ناقابل تسخیر تصور ہوتا تھا۔ لیکن چونکہ سکندر کا اصول تھا کہ وہ دشمن کو بغیر شکست دئے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ وہ بھی تعاقب میں نکل پڑا۔ دشوار گذار راستوں سے ہوتا ہوا راجہ کو قلعہ میں جالیا اور اُسے شکست دینے کے بعد اُدھر ہی سے ہنڈ اپنی باقی فوج سے آملا۔ تمام فوج کو ساتھ لیکر اٹک پار پنجاب میں داخل ہوا۔

چونکہ ہمارا مقصد صرف تاریخ پشاور سے ہے اس لئے پنجاب کی لڑائیوں سے قطع نظر تسلسل قائم رکھنے کے لئے یہ لکھنا ضروری ہے کہ دریائے بیاس پہنچکر سکندر واپس لوٹنے پر مجبور ہوا اور براستہ کراچی بابل کے مقام پر ۳۲۳ قبل مسیح میں ۳۳ سال کی عمر میں اس دنیا سے چل بسا۔

اس کے مرنے پر مختلف سپہ سالار اس کی جانشینی کا دعویٰ لیکر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مفتوحہ علاقوں کی تقسیم میں پشاور سلیوکس نامی جرنیل کے حصہ میں آیا۔ سلیوکس نے سکندر کے ناتمام کام کو پورا کرنا چاہا اور ہندوستان کی تسخیر کی ٹھانی لیکن قدرت کو منظور نہ تھا کیونکہ موریا خاندان کے ایک بادشاہ چندر گپت نامی نے مقابلہ کر کے سلیوکس کو صلح کرنے پر مجبور کر دیا۔ کہ وہ ہندوکش دونوں

حکومتوں کے درمیان حد فاصل مقرر ہوا۔ اور پشاور تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کا صوبہ تصور ہوا۔

اس عہد نامے کا ایک اور فائدہ یہ ہوا کہ یونانی سفیر میگستھانیز نامی چندر گپت کے دربار میں رہنے لگا جس نے ہندوستان کے اس وقت کے حالات نہایت وضاحت کے ساتھ قلمبند کئے ہیں۔

اس امر کا ثبوت اُس کتبے سے ملتا ہے جو مقام شہباز گڑھ میں نصب ہے یہ کتبہ راجہ اشوک کے وقت کا ہے جو چندر گپت کا پوتا تھا اور اس پر اس کے شاہی احکام کندہ ہیں

اس کا دوسرا ثبوت مہاسہ نام ایک کتاب سے ملتا ہے کہ اشوک نے اپنا مذہب پھیلانے کے لئے ایک مبلغ اس علاقہ میں بھی بھیجا تھا۔ اس مبلغ کا نام مدہینتکہ تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ مبلغ سب سے پہلے لاہور واقع تحصیل صوابی میں اپنے مذہب یعنی بدھ مت کے پیرو بنانے میں کامیاب ہوا۔

لاہور مذکور اس زمانہ میں ایک شاندار اور مشہور شہر تھا۔ اس کی آبادی بہت گنجان تھی سنسکرت زبان کا سب سے بڑا اور سب سے پہلا قواعد دان پانی نی نے بھی اسی شہر میں جنم لیا ہے۔ اشوک کے مرنے کے بعد موریا خاندان کا عروج بھی جاتا رہا۔ اس پر یونانی شہزادوں کو پشاور پر حکومت کرنے کا ایک اور موقعہ ہاتھ لگا۔ یہ شہزادے کوہ ہندوکش سے شمالی علاقے پر اس وقت حکمران تھے۔ علاوہ مرکزی حکومت کے یونانی دو اور خود مختار حکومتیں بھی قائم کر چکے تھے۔ ایک بلخ اور دوسری ایران کی حکومت کہلاتی تھی۔ بلخ کے یونانیوں نے افغانستان کی راہ سے ہو کر پشاور پر حملہ بول دیا۔ اور اپنی حکومت کو اتنی وسعت دی کہ متھرہ تک پہنچ گئے۔

اس یونانی خاندان کے ایک بادشاہ مینا ندر نام نے بدھ مذہب بھی اختیار کر لیا تھا۔ جس کا ذکر سنسکرت کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ اور اس کی بہت تعریف کی گئی ہے۔ اس خاندان کا آخری بادشاہ ہرمایوس تھا۔ جو ۵۰ عیسوی تک کابل پر حکومت کرتا رہا اور جسکو آخر کار کوشاں خاندان کے ایک بادشاہ نے جس کا نام کجولہ کڈ فیسیز تھا شکست دی تھی۔ (باقی)

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سہی اسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظلم سے اٹھایا ہوگا
کیونکر مانوں کہ اس میں تلوار نہیں

(غالب)

سلیقے
زیادہ رہنے دی تھی نہ بن ول کی
معلوم تھی کہ آپ یہاں گھر بنائیں گے
توڑ کر
فرماتے ہیں ہمارے دل نازک کو توڑ کر
دیکھیں تو شیشہ گر اسے کیونکر بنائیں گے

(نیشنل)

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

(سیدہ فاتنہ بیگم صاحبہ (ایچ۔ پی) پشاور):۔

اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے اس امر کا اظہار یقیناً قابل مسرت ہے کہ پشتو ادب میں ایک نئے رسالے کا اضافہ ہوا ہے۔ جو ہر لحاظ سے مکمل اور نہایت ہی دیدہ زیب ہے یہ اعلیٰ اور بلند مضامین کے علاوہ مفید اخبار کا بھی حامل ہے۔ غرضیکہ بہمہ صفت موصوف ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ اس مجلہ میں ہم جیسے ناقص العقل انسانوں کو اپنے اظہار خیال کا موقع بھی عنایت کیا گیا ہے اس سے نہ صرف ہماری معلومات میں مفید اضافہ بلکہ ہماری سوجھ اور سمجھ کا بھی امتحان ہوگا۔ پس ہمیں حتی المقدور قدر دانی سے کام لینا چاہیئے۔

میرے خیال میں ابھی تک کسی بہن نے اس مجلہ کی خدمت کیلئے قدم نہیں اٹھایا۔ اس لئے اگر یہ پہلی کوشش ہو تو چاہیئے کہ اس کی ابتدا پہلی مسلمان خاتون حضرت ام المومنینؓ کی پاک زندگی سے کی جائے۔

ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ مکہ معظمہ کے قریش قوم کے ایک دولتمند اور معزز خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس خاندان کا سلسلہ حضرت رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پانچویں پشت میں جاکر ملجاتا ہے۔ جناب رسول اکرمؐ کے نکاح میں آنے سے پہلے وہ بیوہ ہوچکی تھیں۔ قریش قوم کے بڑے بڑے سرداروں اور معزز لوگوں نے نکاح ثانی کیلئے درخواستیں کیں لیکن اُن کی شنوائی نہ ہوئی۔ وہ قابل اعتبار اور امانتدار لوگوں کے ذریعہ تجارت کیا کرتی تھیں اور مکہ معظمہ کی مشہور سوداگرہ تھیں۔

اسی قریش قوم کا ایک نوجوان تھا جس کی عمر پچیس سال تھی۔ اور لوگوں میں امین کے لقب سے مشہور تھا۔ بی بی خدیجہؓ کے کان میں بھی اس کی تعریف پڑی۔ اس نے نوجوان کو بلا کر کہا "آپ امین ہیں اسلیئے میرا مال شام میں لیجا کر بیچ ڈالیں"۔ اس نے اپنے چچا کے مشورہ سے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا اور بی بی خدیجہؓ کے غلام میسرہ کے ہمراہ شام کا سفر کیا۔ اس سفر میں کافی منافع حاصل ہوا۔ اس نوجوان نے بی بی خدیجہؓ کو پائی پائی کا حساب دیا اور میسرہ اور اس کی مالکہ کو اپنی دیانتداری سے مسخر کرلیا۔ بی بی خدیجہؓ نے ایک لونڈی کے ذریعہ اس نوجوان کو شادی کا پیغام دیا۔ اس نوجوان کے پاس نہ دولت اور نہ دیگر ساز و سامان تھا۔ کیونکہ وہ تو بچپن ہی میں باپ کے لطف اور سایہ سے محروم ہوچکا تھا اور اس کی پرورش اپنے چچا کے ہاں ہوئی تھی۔ دونوں کی عمر میں بھی کافی تفاوت تھی یعنی بی بی خدیجہؓ کی عمر چالیس اور اس نوجوان کی پچیس ۲۵ سال تھی۔ اس کے علاوہ وہ خدام اور لونڈیوں کی مالکہ۔ ہر قسم کے آرام اور آسائش سے بہرہ اندوز اور یہ نادار اور مفلس۔ لیکن چونکہ بی بی خدیجہ کی دور رس نگاہوں نے تاڑ لیا تھا کہ یہ نوجوان ان تمام چیزوں سے بالاتر ہے گویا راکھ میں لعل کا نظر آنا اس خوش قسمت بی بی کے نصیب میں درج تھا۔ اقربا اور رشتہ داروں کے ناراضامند ہونے کے باوجود بی بی خدیجہؓ نے

نوجوان کے ساتھ شادی کرنے کا خیال ظاہر کر دیا۔ نوجوان بھی اپنے چچا ابو طالب کے مشورہ سے رضامند ہوا۔ اپنے پرائے بلائے گئے ابوطالب نے خطبۂ نکاح پڑھا اور نہایت سادگی کے ساتھ شادی کی رسم ادا ہوئی۔

نکاح کے بعد بی بی خدیجہؓ نے تمام مال ومتاع۔ غلام اور لونڈیاں اپنے خاوند کے حوالے کر دیئے۔ خاوند نے غلام اور لونڈیوں کو تو آزاد اور باقی مال کو غریبوں میں تقسیم کر دیا۔ بی بی خدیجہؓ نے اس پرخوشی واطمینان کا اظہار کیا۔ کیونکہ وہ اس نوجوان کیلئے سب کچھ قربان کرنے کا تہیّہ کر چکی تھیں۔

خداوندکریم کے کام حکمت سے خالی نہیں لیکن میری دانست میں حضرت بی بی خدیجہؓ کا اس نوجوان کے ساتھ نکاح کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ نوجوان غیرمعمولی الشان نظر آتا تھا۔ ہروقت تفکر اور سوچ میں مستغرق اور تنہا رہتا۔ اکثر اوقات لوگوں کے گذر سے دُور اکیلا پھرتا۔ چنانچہ مکہ معظمہ کے قریب ایک پہاڑی میں حرا نام جگہ آپ نے اپنے لئے پسند کر رکھی تھی۔ اور اکثر اوقات راتیں بھی اسی غار حرا میں بسر کرتا۔ وہ جب باہر سے گھر کو لوٹتے۔ تو بی بی خدیجہؓ نہایت خندہ پیشانی سے آپ کا استقبال کرتیں۔ اس کے کپڑوں کی صفائی اور خوراک کا انتظام کرتیں لیکن ان مشاغل میں ذرا بھر بھی دخل نہ دیتیں۔ یہی راز تھا جس کا میں ذکر کر چکی ہوں یہ ریاضت کا وقت تھا۔ نبوت کی تیاری تھی۔ ایک اہم کام کی ذمہ واری کیلئے انتظامات مکمل کرنے تھے۔ بی بی موصوفہ کی جگہ اگر ایک کم فہم اور کم عمر خاتون ہوتی تو یہ کب گوارا کر سکتی تھی۔ بی بی خدیجہؓ نہ صرف اس نوجوان کو فکر معاش سے بے نیاز کرنیکا سبب تھیں۔ بلکہ اُن کیلئے سراسر تسلی اور حوصلہ افزائی کا موجب بھی تھیں

میں بہ حیثیت عورت یہ دلیل پیش کر رہی ہوں اور ممکن ہے بعض بزرگوں کیلئے یہ ایک نیا خیال ہو۔ لیکن امید ہے کہ وہ اصحاب غور وخوض کے بعد اس کو درست تصور کر لینگے۔ بی بی خدیجہؓ بوجہ اس خدمت اور محبّت کے سب دنیا کی خواتین سے افضل اور برتر ہوگئیں۔ اور رسولِ اکرمؐ کے دل میں بھی اتنا گہرا گھر کر گئیں کہ اُن کی زوجہ مطہرہ بی بی عائشہؓ بھی اس محبت پر رشک کیا کرتی تھیں۔

حضرت عائشہ رضہ فرماتی ہیں:۔ "میں سب کی نسبت بی بی خدیجہ رضہ سے زیادہ رشک کیا کرتی ہوں"۔ ایک دن جب حضور سرورِ کائناتؐ بی بی خدیجہ کی تعریف فرما رہے تھے تو میرا پیمانۂ صبر لبریز ہو چلا اور میں نے کہا۔ "بی بی خدیجہ رضہ تو بوڑھی تھیں اور آپ کو اس سے اچھی بیوی نصیب ہو چکی ہے"۔ رسُولِ اکرمؐ بہت سخت ناراض ہوئے اور فرمانے لگے:۔ "خدا کی قسم خدیجہؓ سے اچھی عورت مجھ کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ اس وقت مجھ پر ایمان لائی جب سب کافر تھے۔ وہ اس وقت مجھے راست باز سمجھتی تھی جب سب دنیا مجھے جھٹلاتی تھی۔ اس نے اس وقت میری امداد کی جب سب نے محرُوم کر دیا تھا اور پھر بی بی خدیجہؓ سے مجھے خدا نے اولاد عطا کی"۔

حقیقت یہ ہے کہ جو خدمت اور مدد بی بی خدیجہؓ نے جناب رسولِ اکرمؐ کی کی ہے وہ صرف اسی پاک رُوح ہی کا حصّہ ہے۔ جب حضرت رسول کریمؐ پر پہلی بار وحی نازل ہوئی اور جبرائیلؑ وحی لے کر آیا تو آپ خوفزدہ ہو کر گھر دوڑے آئے اور بی بی خدیجہ نے آپ کے اوپر چادر ڈالکر حالت دریافت کی۔ حضور سرورِ عالمؐ نے سب حال کہہ دیا اور فرمانے لگے کہ یہ زبردست کام جو میرے سپرد ہو رہا ہے سرانجام کرنا بہت مشکل ہے۔ دانشمند بی بی نے

فرمایا:- آپ فکر نہ کیجئے خداوند کریم آپ کی دستگیری کریگا۔ کیونکہ آپ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک غربا اور ناداروں کی امداد اور مسافروں کی مصیبت میں خدمت کیا کرتے ہیں۔ آپ مہمان نواز اور نیک انسان ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ایسے انسان کی خدا امداد نہ کرے"۔ اس سے جناب رسول کریمؐ کی تشفی اور تسلی ہوئی مزید اطمینان دلانے کے لئے بی بی خدیجہؓ جناب رسول اکرمؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس جو بہت بڑے عالم اور آسمانی کتابوں کی پیشین گوئیوں سے باخبر تھے لے گئیں۔ اس نے سن کر کہا۔ کہ یہ خداوند کریم کی وحی ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبران خدا پر نازل ہوتی رہی ہے۔ بی بی خدیجہؓ یہ سنکر پھولی نہ سمائیں اور اسی وقت ایمان لائیں۔ اسی وجہ سے انکو ام المؤمنین بلکہ اول المسلمین کہتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک دن حضرت رسول اکرمؐ کے پاس جبرائیلؑ آئے اور فرمایا کہ "بی بی خدیجہ آرہی ہیں اور اُن کے پاس ایک برتن میں خوراک کی چیز ہے وہ جس وقت گھر پہنچیں ان سے یہ خوشخبری فرما دینا کہ ان کیلئے جنت میں جواہرات سے ایک محل تیار ہو چکا ہے اور وہاں کسی قسم کا غم اور فکر نہ ہوگا"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ رسول اکرمؐ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح بی بی مریمؑ اپنے زمانہ کی عورتوں سے افضل تھیں اسی طرح بی بی خدیجہؓ بھی تمام عورتوں سے افضل ہیں۔

حضرت عائشہ رضؓ سے روایت ہے۔ کہ "جب کبھی جناب رسول اکرمؐ بھیڑ وغیرہ کی قربانی کرتے بی بی خدیجہؓ کے رشتہ داروں کے ہاں ضرور بھیج دیا کرتے تھے اور جب کبھی میں آپ سے کہتی کہ کیا دنیا میں بی بی خدیجہؓ ہی صرف ایک عورت تھی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ ہاں۔ یہ سچ ہے۔ اور پھر فرماتے تھے کہ میری اولاد بھی انہی سے ہے"۔

جب تک حضرت بی بی خدیجہؓ زندہ رہیں رسول اکرمؐ نے دوسری شادی نہیں کی۔ وہ پینسٹھ (۶۵) سال کی عمر میں اس دار فانی سے رخصت ہو کر جنت میں جا بسیں۔ اسی سال رسول اکرمؐ کے چچا ابوطالب بھی اس جہاں سے رخصت ہوئے۔ آپ کے لئے ان دونوں کے فوت ہونے کا سخت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس سال کو وہ عام الحزن یعنی غم کا سال فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ام المؤمنین خدیجۃ الکبریٰ کے چھ بچے تھے۔ دو لڑکے اور چار لڑکیاں۔ لڑکے بچپن ہیں میں ہی داغ مفارقت دے گئے اور تین لڑکیاں یعنی زینبؓ۔ رقیہؓ اور ام کلثومؓ رسول اکرمؐ کی زندگی میں شادی کے بعد غریق رحمت ہوئیں ان سے کوئی اولاد نہیں رہی صرف بی بی فاطمۃ الزہراؓ کی اولاد جو سید کہلاتے ہیں باقی ہے جو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ بی بی خدیجۃ الکبریٰؓ کا مزار شریف مکہ معظمہ میں ہے ؛

———:(بقیہ صفحہ ۱۳):———

یعنی ڑ اور یہ یوسفزئی زبان میں ج پڑھا جائے اور غیر یوسفزئی میں ژ۔ مثلاً ژبہ۔ ژړا۔ ژوبل۔ ژرندہ وغیرہ یوسفزئی زبان میں جبہ۔ جړا جوبل۔ جرندہ پڑھے جائیں۔ امید ہے کہ پشتو ادبا میری ان تجاویز پر غور فرمائینگے۔ آخر میں مولانا صاحب سے بھی مجھے امید ہے کہ وہ میرے اس اختلاف الرائے کو بار خاطر نہیں سمجھینگے کیونکہ میں نے تو فقط انکے ارشاد کی تعمیل میں انکے قابل قدر مضمون کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے اور بس ؛

مشرقِ بعید کے مسلمان

اور

جاپانی پراپیگنڈا

جاپانی ریڈیو سٹیشن مشرقِ بعید کے مقبوضہ ممالک میں رہنے والے مسلمان باشندوں میں نئے جاپانی نظامِ حکومت کے سلوک کے متعلق جو پراپیگنڈا کر رہے ہیں اس میں اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے کہ ان ممالک میں مسلمانوں کے مذہبی معاملات اور تہذیب و تمدن میں جو مداخلت کی جا رہی ہے۔ اس کی بھنک تک بھی باقی دنیا کے کانوں میں نہ پڑے مسلمانوں کی قومی زندگی کے ہر شعبہ میں جاپانیوں نے جو تبدیلیاں کی ہیں یا کر رہے ہیں ان کو ایسے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے کہ باہر کی دنیا اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ جاپان نے "محافظ اسلام" ہونے کا جو دعویٰ کیا ہے وہ پورا ہوتا دکھائی دے۔ جاپانی مسلمانوں کے متعلق پراپیگنڈا کرنے میں اس لئے بھی زیادہ احتیاط برتتے ہیں کہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام اصولاً شہنشاہ پرستی، شرک اور بت پرستی وغیرہ کا جسکے جاپانی معتقد ہیں، سخت ترین مخالف ہے۔

لیکن باوجود جاپانی نشر و اشاعت کی اس قدر حزم و احتیاط کے بھی اصلی حالات کا ایک معمولی سا عکس نظر آ ہی جاتا ہے اور وہ یہ کہ جاپان کے تمام نئے مقبوضہ علاقوں میں مختلف تہذیبوں کے درمیان ایک قاعدہ جنگ جاری ہے اور جاپانیوں کی یہ انتہائی کوشش ہے کہ ان ممالک میں قدیمی روایات اور قدیمی تہذیب کی جگہ جاپانی تہذیب، جاپانی اخلاق اور جاپانی طرز معاشرت لوگوں پر ٹھونس دیں۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں جتنا کہ وہ سمجھتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ جو آج جاپان کے قبضۂ قدرت میں ہیں ان میں سے اکثر اور خصوصاً مسلمان نہ تو اپنا شاندار ماضی بھول سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے مذہب، اخلاق، اسلامی روایات اور مذہبی اداروں کے احترام میں کوئی فرق آسکتا ہے۔ اسلام کے وسیع دائرہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ضروری ہے۔ جاپان کا یہ دعویٰ کہ وہ مشرق اور جنوبی ایشیا میں رہنے والی تمام اقوام کے عسکری اوصاف اور تہذیب و تمدن میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا ہے درحقیقت اس مقصد کا حامل ہے کہ صرف جاپانی تہذیب کو تقویت پہنچے اور غیر جاپانی تمام ادارے اور انجمنیں یا تو نیست و نابود ہو جائیں یا جاپانی تہذیب و تمدن کی تبلیغ میں ان کے اشاروں پر چلیں۔ صرف یہی ایک صورت ہے جس میں جاپانی مشرق اور جنوبی ایشیا کی اقوام پر اپنی حاکمانہ گرفت مضبوط رکھ سکتے ہیں۔

مشرقِ بعید کے اسلامی ممالک میں جاپانیوں نے جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے وہ لازمی طور پر نہایت عیاری سے خفیہ رکھا جاتا ہے

نشر واشاعت کے ذریعہ ان اسلامی ممالک کے متعلق جو پراپیگنڈا کیا جا رہا ہے اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی توجہ دوسری طرف پھیر دی جائے اور ان خطرناک اور مہلک واروں کا جو اسلامی تہذیب تمدن کی بنیادوں پر کئے جا رہے ہیں کسی کو شبہ تک نہ ہو۔ اصلی حالات کو اندھیرے میں رکھکر لوگوں کو اصلاحات اور ترقی کے ایسے سبز باغ دکھائے جا رہے ہیں جنکی حقیقت ہوائی باتوں سے زیادہ کچھ نہیں۔ جاپانیوں کی ان نام نہاد "اصلاحات" کی چند ایک مثالیں یہ ہیں:۔

(۱) تمام مدارس اور دیگر اداروں میں جاپانی زبان ذریعۂ تعلیم قرار دی گئی ہے اور اس کا سیکھنا لازمی ہے شاید کوئی یہ کہے کہ انگریزوں اور ولندیزوں نے بھی تو یہی کیا تھا۔ درست ہے لیکن انہوں نے جاپانیوں کی طرح یہ دعویٰ تو نہیں کیا تھا کہ "ہم ایشیا کی پسماندہ اور غلام اقوام کو یورپین طاقتوں کے اثر و اقتدار سے نجات اور آزادی دلانا چاہتے ہیں"۔ اسکے علاوہ اپنے مقبوضہ ممالک میں مقامی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے کی بجائے جاپانی مغلوب اقوام کے سر اپنا ہی تہذیب و تمدن مڑھ رہے ہیں ان بدقسمت اقوام کو کہا تو یہ جاتا تھا کہ جاپان نے یہ لڑائی ان کی نجات ہی کی خاطر شروع کی ہے لیکن اب انہیں معلوم ہوا کہ حاکموں کی یہ تبدیلی ان کیلئے کس قدر خطرناک ثابت ہو رہی ہے۔

جاپانی زبان اور علم و ادب کا جن چیزوں سے گہرا تعلق ہے اسلامی عقائد ان کے سخت ترین مخالف ہیں مثلاً شنٹوازم۔ شہنشاہ پرستی اور جاپانی قوم کو خدا سے منسوب کرنا۔ اس کے برعکس اسلامی اور مسیحی علم و ادب، تاریخ، لٹریچر، روایات، مذہبی اصولوں اور زبان کے لحاظ سے آپس میں ایک خاص مناسبت اور لگاؤ رکھتے ہیں۔ جاپانی زبان میں نہ رسم الخط اور نہ ہی نفس مضمون کے لحاظ سے کوئی ایسی چیز ہے جو مغربی ایشیا یعنی اسلامی ممالک کی زبانوں سے کسی قسم کی مشابہت یا موافقت رکھتی ہو۔

(۲) جاپانیوں نے مشرق بعید کے ان اسلامی ممالک میں نہ صرف اپنی زبان ہی رائج کی بلکہ عربی ہندسوں اور اعداد و شمار کے اس بنیادی طریقہ کو بھی بدل ڈالا ہے جس سے یورپ نے عدد و حساب کا موجودہ طریقہ اخذ کیا تھا۔

(۳) باوجودیکہ جاپانیوں نے اعلان کیا تھا کہ انہوں نے مشرق بعید کے مقبوضہ ممالک کے مسلمانوں پر خاص عنایت کرتے ہوئے انہیں یہ اجازت دی ہے کہ وہ اسلامی (قمری) کیلنڈر پر کاربند رہیں پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ ان تمام ممالک میں ہر کام میں جاپانی جنتری کے مطابق عمل کیا اور کرایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو یہ حق تو دیا گیا ہے کہ وہ اسلامی جنتری پر عملدرآمد کریں لیکن ان کو یہ طاقت اور آزادی نہیں دی گئی کہ وہ عملی طور پر ایسا کر سکیں

(۴) اسلامی اور غیر اسلامی تمام مقبوضہ ممالک میں جاپانیوں نے اپنی مذہبی تعطیلات رائج کی ہیں۔ اس کی تو خیر ہے۔ لیکن مسلمانوں کے مذہبی احساسات، خیالات اور عقائد اس بات کو ہرگز ہرگز برداشت نہیں کر سکتے کہ جاپانی مندروں کے آگے سر جھکایا جائے یا جاپانی شہنشاہ کو خدا سمجھتے ہوئے تعظیم و تکریم کی جائے۔

(۵) یہ بھی ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ جو اسلامی انجمنیں ادبی ادارے، کتب خانے اور اصلاحی سوسائٹیاں جاپانیوں نے قائم کی ہیں وہ تمام کی تمام جاپان کے فوجی حکام کی زیر نگرانی کام کرتی ہیں۔ شاذ و نادر ہی اگر کوئی مسلمان ان انجمنوں کی

(بقیہ صفحہ ۱۵)

میرویس خان

(از جناب پروفیسر محمد علی خان صاحب ایم۔اے)

(۳)

اس وقت ایران میں ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا۔ یعنی زار روس کی حکومت کی طرف سے ایران میں ایک سفیر بھیجا گیا جس کا نام اسرائیل اوری زائی تھا۔ یہ گو آرمینیا کا باشندہ تھا۔ لیکن ایران کے شہری حقوق بھی اسے حاصل تھے۔ یعنی یہ ایرانی رعایا تھا۔ نیز وہ اپنے آپ کو آرمینیا کے تخت کا جائز وارث بھی تصور کرتا تھا اور مدت تک روس کی حکومت کی طرف سے قسطنطنیہ میں جاسوس بھی رہ چکا تھا۔ انہی خدمات کی بدولت اس کو ایران کی سفارت میں سفیر کبیر کا ممتاز عہدہ عطا ہوا ان اعزاز کے علاوہ اسے دیگر مراعات بھی حاصل تھیں۔ منجملہ ان کے ایک یہ تھی کہ وہ جتنا سامان چاہے ایران سے روس اور روس سے ایران کو بھیج سکتا ہے۔ اور اس پر حکومت ایران کسی قسم کا محصول درآمد اور برآمد نہیں لگا سکتی۔

جب اسرائیل اصفہان میں آکر مقیم ہوا۔ تو اس کی امتیازی رعایات اس قدر غیر معمولی تھیں کہ لوگ سن کر آپس میں چہ میگوئیاں کرنے لگے۔ افواہیں گرم ہوئیں اور ایران کی فضا بہت خراب ہونے لگی۔ کیونکہ لوگوں پر روسی حکومت کا ایک قسم کا رعب بیٹھنے لگا اور ان پر ہیبت طاری ہو گئی۔ رعایا میں اس خوف و ہراس کی خبر آخر شاہ ایران تک پہنچی۔ اس نے اپنے تمام امراء و وزراء کو بلا کر اس بارے میں ان کا مشورہ طلب کیا۔ سب کی یہ صلاح ٹھیری کہ اس معاملہ کو نہایت صبر اور حوصلہ سے نبامنا چاہیئے۔ اور مناسب موقعہ کا انتظار کرنا چاہیئے۔ بادشاہ کو جب ان کی باتوں سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے میرویس خان افغان کو اپنے دربار میں طلب کیا اور اس بارے میں اس کی رائے بھی لی اور پوچھا کہ ان حالات میں کیا کرنا چاہیئے؟

میرویس خان نے اس سنہری موقعہ کو غنیمت سمجھا۔ اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور چونکہ وہ وزراء اور امراء کے حالات سے بخوبی واقف تھا اس نے بادشاہ کو مخاطب کر کے یوں عرض کی :-

" اگر اس کمیشن کے بھیجنے سے روسی حکومت کی نیت دوستانہ ہوتی تو وہ شاہی خاندان کے آدمیوں میں سے اس کام کیلئے کسی کو انتخاب کرتی۔ لیکن روسی حکومت نے ایک ایسے شخص کو انتخاب کیا ہے جو آرمینیا کا اصلی باشندہ اور ایران کی رعایا میں سے ہے جو اپنے آپ کو آرمینیا کے سابق شاہی خاندان سے بتاتا ہے اور ساتھ ہی روسی جاسوس کی حیثیت سے سلطان عثمانی کے دربار میں بھی مدت تک رہ چکا ہے۔ اس میں ضرور کوئی خاص مصلحت اور راز ہے۔ کیونکہ دوسرے وسیع اختیارات اور تجارتی

امتیازات کے علاوہ اس کو یہ بھی اجازت حاصل ہے کہ وہ جس قدر عملہ چاہے اپنے ساتھ ایران لاسکتا ہے۔ نیز اس کمیشن کے تمام ممبران کے اسباب بلکہ ان کے تجارتی مال پر بھی کسی قسم کا محصول نہیں لگایا جاسکتا۔

یہ باتیں انسان کو شک میں ڈالتی ہیں۔ ہاں اگر ہمارے اندرونی ملکی معاملات تسلی بخش ہوتے تو چند بیرونی افراد کا پایہ تخت میں ہونا کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن برخلاف اس کے میں محسوس کرتا ہوں کہ ہماری حکومت اس وقت بیرونی اور اندرونی طور سے مشکلات سے دوچار اور خطروں میں پھنسی ہوئی ہے۔ ملک کے داخلی حالات بھی تسلّی بخش نہیں۔ گرگین خان جس نے محض شاہ سلامت کی خوشنودی اور جاہ و منصب حاصل کرنے کے لئے دینِ اسلام قبول کیا اس موقعہ کا شدت سے انتظار کر رہا ہے کہ اپنا جذبۂ انتقام ٹھنڈا کرے۔ اس نے گرجستان کے حاکم کی حیثیت میں بھی علم بغاوت بلند کیا تھا لیکن مقابلے کی تاب نہ لاکر اطاعت پر مجبور ہُوا اور دینِ اسلام قبول کیا۔ اور چونکہ شاہ سلامت کا فیض دوست دشمن دونوں پر ابرِ نیساں کی طرح برابر برستا ہے آپ نے گرگین خان کو نہ صرف حاکم گرجستان مقرر کیا۔ بلکہ حکومت کے دو اور صُوبے قندہار اور کرماں بھی اُسے بخش دیے۔ اب اس کا ایک رشتہ دار اس کی طرف سے گرجستان میں بحیثیت وکیل موجود ہے۔ اگر روس نے باہر سے حملہ کردیا تو وہ آسانی سے ہمیں پریشان کرسکتا ہے۔ کیونکہ اندرونی ملک میں گرگین خان نے حالات بگاڑ دیئے ہیں اس لئے حکومت کا تباہ ہوجانا یقینی ہے"۔

بادشاہ کو میرویس خان کی تقریر پسند آئی اور اس کو حکم دیا کہ وہ فوراً قندہار جاکر گرگین خان کی حرکات کا بنظر غور مطالعہ کرے اور اگر ممکن ہو تو اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ میرویس خان بادشاہ کا فرمان لے کر وطن مالوف کو لوٹا۔ جب وہ قندہار پہنچا گرگین خان کو حالات کی اطلاع مل چکی تھی۔ اس لیئے اس نے میرویس خان کو ایک اور طریقہ سے ذلیل کرنا چاہا۔ اس نے خانِ افغان کو لکھا کہ چونکہ اب ہم میں کوئی دشمنی باقی نہیں رہی۔ اس لئے تعلقات کو زیادہ استوار کرنے کے لئے یہ بہتر ہے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کرادے۔ خان نے اپنے رفقاء سے اس بارہ میں مشورہ کیا سب نے یکزباں ہوکر مخالف رائے دی اور کہا کہ وہ ناموسِ افغانی کی خاطر اپنا سروبال سب کچھ قربان کردینگے لیکن ایسا نہ ہونے دینگے۔ لیکن جب اُنکا غصّہ ٹھنڈا ہوا خان افغان نے انکو یُوں مخاطب کیا:-

میرے رفیقو میں جانتا ہوں کہ آپ مجھے اپنا امیر سمجھتے ہیں۔ اور امید ہے کہ آپ میرے نظریّہ سے اتفاق کرینگے میں آپ سے اس بارے میں متفق نہیں ہوں جو مٹھی ہاتھ سے کھل سکے اسکی قسمت میں دندان شکنی کہاں طاقت کے استعمال کا یہ مناسب موقع نہیں بلکہ دوراندیشی سے کام لینا درکار ہے چاہیئے کہ ہماری خندہ روی دشمن پر ہمارا جذبہ انتقام نہ ظاہر ہونے دے اور ہمارے اصلی مقاصد سے دشمن بیخبر رہے میرا ارادہ ہے کہ اپنی ایک لونڈی بیٹی بتاکر گرگین خان کے عقد میں دیدوں اور پھر ہم اپنے کام میں مصروف ہو جائیں امید ہے کہ آپ میرے خیال کیمطابق کام کرنیکا وعدہ کرینگے"۔ تمام سرداروں نے تسلیم کیا اور اپنی شمشیر۔ وطن اور ناموس کی قسم کھائی کہ وہ ہمیشہ خان افغان کے کہنے پر چلینگے اور اپنے عزیز وطن کیخاطر اپنا مال وطن اور اولاد سب کچھ قربان کردینگے اور جبتک وطن کو دشمن کے پنجہ سے نجات نہیں دلوائینگے سوائے خور دونوش کے تمام لذّات حیاتی سے لُطف اندوز ہونا حرام سمجھیں گے ؛ (باقی)

پندرہ روزہ رسالہ اُردو

نن پرون

قیمت فی پرچہ دو آنے (۲؍)

چندہ سالانہ (تین روپے)

سال دوم | ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۲ء | فہرست | ۲۸ رمضان ۱۳۶۱ء | نمبر (۱۱)

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے

ایڈیٹر: نن پرون (اردو ایڈیشن) راجپور روڈ۔ دہلی

غزل

یہ کیسے بال کھولے آئے؟ کیوں صورت بنی غم کی؟
تمہارے دشمنوں کو کیا پڑی تھی میرے ماتم کی

پس پردہ بھی تو مہلت نہیں ملتی کوئی دم کی
نگاہِ یار کی بجلی اُدھر تڑپی اِدھر چمکی

شکایت کس سے کیجے ہائے کیا اُلٹا زمانہ ہے
بڑھایا پیار جب ہم نے محبّت یار نے کم کی

بس اب دیکھا نہیں جاتا ہمارا دم اُلجھتا ہے
شرارت دیکھ لیجے آپ اپنی زلفِ برہم کی

جگر میں درد ہے دل مضطرب ہے جان بیکل ہے
مجھے اس بیخودی میں بھی خبر ہے اپنے عالم کی

فرشتے والہ و شیدا ہیں مر مٹتی ہیں پریاں بھی
خدا جانے اثر کیا بھر دیا صورت میں آدم کی

نہیں ملتے نہ ملئے ۔ خیر کوئی مر نہ جائے گا
خدا کا شکر ہے پہلے محبّت آپ نے کم کی

عدو جس طرح تم کو دیکھتا ہے ہم سمجھتے ہیں
چھپاؤ لاکھ تم چھپتی نہیں ہے آنکھ محرم کی

نظر ملتے ہی دو ساغر پلائے واہ کیا کہنا
جھکا بیٹھا ہوں کب سے خیر ہو ساقی ترے دم کی

تمہیں بھی کچھ خبر ہے کیا گذرتی ہے غریبوں پر
یہاں تو آہ کو فرصت نہیں ملتی کوئی دم کی

مزا اس میں ہی ملتا ہے نمک چھڑکو نمک چھڑکو
قسم لے لو نہیں عادت مرے زخموں کو مرہم کی

کہیں بھولے سے میں نے چھو دیا تھا آ گئی شامت
ابھی پر بل پڑا ہے کیوں؟ ہماری زلفِ برہم کی

کہاں جانا ہے ۔ تھم تھم کر چلو ۔ ایسی بھی کیا جلدی
تم ہی تم ہو خدا رکھے نظر پڑتی ہے عالم کی

کوئی ایسا ہو آئینہ کہ جس میں تو نظر آئے
زمانے بھر کا جھوٹا کیا حقیقت ساغرِ جم کی

گھٹائیں دیکھ کر بے تاب ہے بے چین ہے شاعر
ترے قربان او مطرب سنا دے کوئی موسم کی

(نمونۂ شعر آغا شاعر مرحوم)
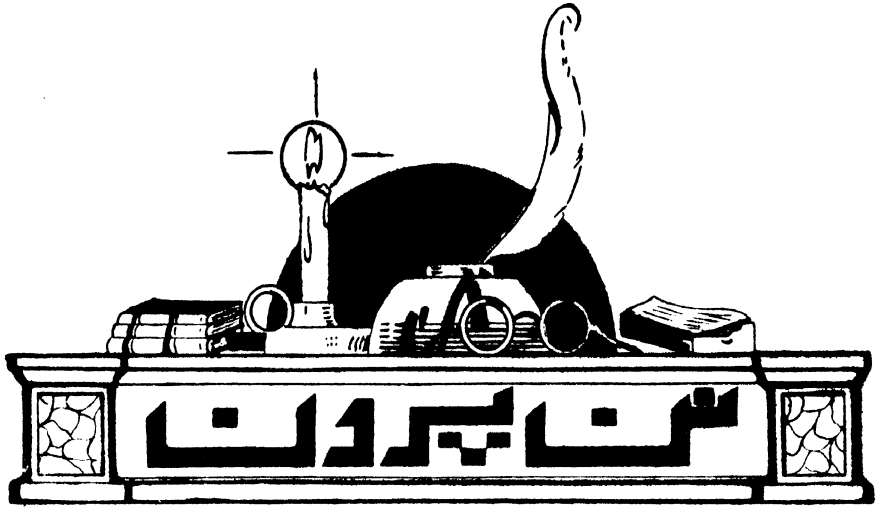
روزنامہ اصلاح کابل اور قومی زبان کا معیار

(مولانا عبدالقادر خان)

رسالہ "نن پرون" مورخہ ۲۵ جون ۱۹۴۲ء میں میں نے افغان قوم کی خدمت میں عموماً اور افغان علماء اور ادبا کی خدمت میں خصوصاً پشتو رسم الخط کے متعلق چند معروضات پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اُن میں ایک یہ تھی کہ مادری زبان کی ترقی کیلئے بعض عام اور اہم مسایل کا فوری حل بہت ضروری ہ شکر ہے کہ افغان قوم نے میری معروضات پر غور و خوض شروع کر دیا ہے اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ "نن پرون" کے ہر نمبر میں رسم الخط کے موضوع پر کسی نہ کسی فاضل ادیب کا مضمون چھپ رہا ہے۔ خدا کرے یہ سلسلہ برابر جاری رہے اس سلسلہ میں افغانستان نے جو قدم اٹھایا ہے اس سے قارئین کرام کو باخبر رکھنا ضروری ہے۔ جولائی ۱۹۴۲ء کے اواخر سے "پشتو جرگہ کابل" کی کارروائیاں اخبارات

اصلاح" اور "انیس" میں شایع ہو رہی ہیں ان کارروائیوں پر رائے زنی یا بحث کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ البتہ ایک بات یقیناً مسرت بخش ہے۔ وُہ یہ کہ پشتو جرگہ نے نہ صرف ایک دُور افتادہ قومی بھائی کے خیالات پر غور و خوض کیا بلکہ قومی زبان کی وحدت کے متعلق بعض عملی تجاویز بھی پیش کی ہیں۔

جناب محمد رفیق خان حبیبی قندہاری کا مضمون آپ کی نظر سے گذرا ہوگا۔ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک اور فاضلانہ مضمون جو "بناغلی گرڈ ندی" کے نام سے چھپا ہے۔ قارئین کرام کی خدمت میں پیش کیا جائے، اس سے افغانستان کے موجودہ ادبار کے خیالات اور انشائے پشتو کے اسلوب کا پتہ چل جائے گا

خدا نے چاہا تو فاضل رفتیا کا مضمون جو "قومی زبان اور قومی خط" کے عنوان سے روزنامہ "انیس" کابل کی اشاعت مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء میں شایع ہو چکا ہے۔ "نن پرون" کی آئندہ اشاعت میں درج کیا جائے گا۔

بناغلی گرڈندی کا مضمون

کچھ دن ہوئے یہ عمدہ اور خوشگوار خبر ہمارے کان میں پڑی ہے کہ قومی زبان کو تبدیل اور بلند کرنے کی تحریک ہو رہی ہے۔ ہماری قومی زبان کی انشا کے لئے ایک مشترکہ معیار ہونا اور خاص کر پشتو جرگہ کابل کی ہدایات ہمارے لئے مشعل راہ ہیں یہ قابل قدر ہدایات ہماری قوم کی ادبی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھے جانے کی مستحق ہیں۔ مجوزہ صرف و نحو اور قاعدوں سے آیندہ انحراف نہ کیا گیا تو اگر خدا نے چاہا سارے ادبی اختلافات آہستہ آہستہ مٹ جائیں گے اور ایک متحدہ اور مکمل قومی زبان عالم وجود میں آجائے گی۔

یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قومی زبان اور اس کے رسم الخط کی وحدت آگے چل کر قوم، قبیلوں اور خاندانوں کے اتحاد اور عروج کا باعث بن جاتی ہے۔ اس سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ قوم کی اجتماعی ترقی اور برتری کا دارومدار اتفاق اور اتحاد پر ہے؟ زبان کا ایک ہونا ہی حقیقت میں قومی اتفاق اور ملی وحدت ہے۔ چونکہ مدت سے قوم کے نوجوان اور ارباب حل و عقد قوم اور قومی زبان کی ترقی اور فروغ کی نیک آرزو رکھتے ہیں ہماری رگوں میں بھی ایک نیا خون دوڑتا نظر آتا ہے۔ اب تک تو ہر ایک شخص اور ہر ایک قبیلہ اپنے اسلوب ہی کو اہمیت دے رہا تھا اور اپنے لئے علیحدہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں بنانا چاہتے تھے لیکن پشتو جرگہ کی توجہ سے وہ تمام اختلاف مٹ گئے اور ایسا صحیح راستہ اختیار کیا گیا جو تمام اہل قلم کے لئے نمونہ ہونا چاہیئے۔ اس اصولی اور بنیادی راستہ سے کوئی بھی بھٹک نہیں سکتا پشتو زبان جو ترقی آئے دن کر رہی ہے اس میں بلاشبہ قارئین کرام کا بھی بہت بڑا حصہ ہے اور رہیگا۔ اور آخرکار یہی بات پشتو زبان کی برتری کا باعث ہوگی؛

رفتارِ زمانہ

روس :—

سٹالن گراڈ کے لئے سات ہفتے بلکہ زیادہ عرصہ سے جو خونریزی ہو رہی ہے تاریخ عالم اس کی نظیر پیش نہیں کر سکتی ۔ روسی اپنے سے کہیں زیادہ قوے کا جان توڑ مقابلہ کر رہے ہیں نہ انہیں جان کی پرواہ ہے نہ تکلیف اور قربانی کی۔ جرمنوں نے یہ ٹھانی تھی کہ جاڑوں سے پہلے ہی قفقاز پر بھی قبضہ جمالیں اور دریائے والگا تک سارے روسی علاقوں کو بھی اپنے تصرف میں لے آئیں لیکن روسیوں کی مقاومت نے جرمنوں کے سارے منصوبے خاک میں ملادئے ہیں۔ جرمنوں نے اس محاذ میں بے انتہا قوے جن میں زیادہ تر زرہ پوش ہیں جھونک رکھی ہیں۔ ادھر روسیوں کو بھی بے انتہا کمک پہنچ چکی ہے اور جرمنوں کا دھاوا ڈھیلا پڑگیا ہے۔ سٹالن گراڈ کے گھر گھر۔ کوچہ کوچہ میں نہایت تندی سے لڑائی ہو رہی ہے ۔

برطانوی جہازوں کا ایک بڑا قافلہ شمالی روس پہنچ گیا ہے ۔ ان جہازوں میں جنگی سازوسامان اسقدر آیا ہے کہ ایک روسی فوج جس میں تیس ہزار جوان ہوتے ہیں کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ راستہ میں محوری ہوائی جہاز اس قافلہ پر حملے کرتے رہے۔

یہ ہوائی جہاز ناروے کے ساحلی اڈوں سے آتے تھے ۔ اس خیال سے کہ مبادا باکو جرمنوں کے ہاتھ آجائے روسیوں نے بڑی سرعت کے ساتھ تاتاری اور باشقر جمہوریتوں کے آس پاس ایک دوسرا باکو بنالیا ہے ۔ ان اطراف میں ایشمبایوو ، کوئبوشیو ، پرم اور بوگو اسلان میں تیل کے چشمے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں جو سکیم مرتب ہوئی تھی اس کی رو سے چھ سو اور تیل کے کنوئیں نکالنا تھے ۔ اِس وقت یہاں پر تیل کا نکاس ساٹھ فیصدی بڑھ گیا ہے ۔

روس میں ایک نئی قسم کا جنگی طیارہ بنایا گیا ہے جس کا نام " یاک " ہے ۔ اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کے نامہ نگار مقیم ماسکو کا دعوےٰ ہے کہ یاک نئے جرمن لڑاکے جہاز مشرشمٹ سے تیز رفتاری اور آتشباری کے لحاظ سے کہیں بڑھا ہوا ہے ۔

———— ⁂ ————

شمالی افریقہ :—

خود مصر میں تو کوئی ایسی پنجہ آزمائی نہیں ہوئی ہے البتہ اُدھر مغرب کی طرف خوب لڑائی ہوتی رہی ہے ۔ دشمن کے مورچوں سے کوئی پانسو میل پیچھے تک اتحادی صحرائی قوے نے کامیاب حملے کئے ۔

۱۳ اور ۱۴ ستمبر کی درمیانی شب کو ہمارے فضائی قوائے نے بنغازی اور بارسی پر حملے کئے

۱۵ اور ۱۶ ستمبر کی درمیانی شب کو نخلستان گیالو پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا اور دشمن نے گولہ بارود اور دیگر جنگی سامان کے بڑے بڑے ذخیروں کو آگ لگا دی گئی۔ طبرق پر بھی بحری طیاروں کے ایک دستہ نے یورش کر ڈالی۔ فریقین کمک بہم پہنچانے کی کوشش میں ہیں۔ رومل کی موجودگی برلن میں بتائی جاتی ہے۔ مسٹر وینڈل ویلکی کے قول کے مطابق گذشتہ ٹکر میں رومل کے ایک سوٹینک کام آئے یا یوں کہیئے کہ اس کے پینتالیس فیصدی کارآمد ٹینک تلف ہوگئے۔

میڈغاسکر:

سارے میڈغاسکر پر اب برطانوی قوائے کا قبضہ ہوچکا ہے۔ فرانسیسیوں نے برائے نام مقابلہ کیا حکومت برطانیہ نے ایک اعلان میں وعدہ کیا ہے کہ مڈغاسکر میں فرانسیسیوں کے حق حکومت کا پورا احترام کیا جائیگا

امریکہ میں تیاریاں

نئی لغایت اگست ۱۹۴۲ء کے اندر حکومت اضلاع متحدہ امریکہ میں ۳۶۲ نئے جہاز تیار ہوگئے جن کا کل وزن ۲۹,۰۰۰ ٹن ہے۔ یہ جہاز سارے کے سارے "آزادی" کے نمونہ کے نہیں ہیں بلکہ ان میں لادو جہاز، تیل بردار جہاز اور اور قسم کے تجارتی جہاز بھی شامل ہیں۔ یہ سال ختم ہوتے ہوتے کل دس لاکھ ٹن کے لگ بھگ وزن کے جہاز ایک ماہ میں صرف اضلاع متحدہ امریکہ میں بننے لگیں گے

پریزیڈنٹ روز ویلٹ کے سیاسی مدمقابل مسٹر وینڈل ویلکی جو دنیا کا دورہ کر رہے ہیں ۲۵ ستمبر کو انگورہ پہنچے۔ اخبار نویسوں کی ایک کانفرنس کے روبرو آپ نے بیان فرمایا کہ

اضلاع متحدہ امریکہ میں صرف ماہ اگست میں پانچ ہزار طیارے بنے جن میں سے ساٹھ فیصدی جنگی ہیں۔ آپ نے پیشینگوئی فرمائی ہے کہ

ایک سال کے اندر اندر اضلاع متحدہ امریکہ میں دس ہزار طیارے ماہوار بننے لگیں گے۔

افغانستان:

محکمہ وزارت امور اقتصاد کی منظوری سے بیس لاکھ افغانی کے سرمایہ سے زیر صدارت حاجی عبد الکریم خان صاحب

"شرکت آریانہ"

کے نام سے ایک تجارتی کمپنی کھولی گئی ہے۔ اس کمپنی کا کام یہ ہوگا کہ افغانستان کی پیداوار غیر ممالک میں بھیجے اور غیر ممالک کی پیداوار افغانستان منگوائے ✦

میرویس خان

(۴)

(گذشتہ سے پیوستہ)

چنانچہ میرویس خان نے اپنی لڑکی کی بجائے اپنی ایک لونڈی کی شادی گرگین خان سے کر دی۔ اس مدبرانہ چال سے افغان اس سے بہت مطمئن ہو گئے اور اس کا اعتبار بہت بڑھ گیا۔ اس کے بعد میرویس خان نے پشین کے افغانوں کو بھڑکانا شروع کر دیا۔ چنانچہ وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ گرگین خان کو اس سرکشی کا پتا چلا تو میرویس خان سے مشورہ کیا کہ کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ میرویس خان نے یہ صلاح دی کہ وہ اپنی بہترین فوج جس میں زیادہ تر گرجی تھے پشین کے باغیوں کی سرکوبی کے لئے روانہ کر دے۔ گرگین خان نے اس پر عمل کیا۔

یہ فوج جب روانہ ہو گئی تو میرویس خان نے خوانین وغیرہ کو قندھار بلایا۔ خوانین آئے اور کثیر تعداد میں آئے۔ میرویس خان اپنے ذاتی قلعہ میں جو شہر سے کچھ دور واقع تھا بڑی عالیشان دعوت کا انتظام کیا اور اپنے خوانین اور گرگین خان اور اس کے تمام متعلقین کو بلایا۔ اس دعوت کی غرض یہ جتائی کہ تمام خوانین امداد کے لئے حاضر ہو گئے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ گرگین خان اور اس کے تمام متعلقین کے ساتھ اُن کا تعارف کرا دے۔

گرگین خان نے دعوت قبول کر لی اور دو سو جوان اپنے ہمراہ لے کر اس قلعہ میں گیا۔ میرویس خان نے بھی بہترین غذا اور شراب مہیا کی۔ گرگین خان اور اس کے ساتھیوں نے خوب پی یہاں تک کہ سب کے سب بےسُدھ ہو کر سو رہے۔ تب میرویس خان نے اپنے افغانوں کو یوں مخاطب کیا:۔

"انتقام کا وقت آگیا ہے۔ ان میں سے ایک نہ بچے"

چنانچہ سب کے سب وہیں ٹھنڈے کر دیئے گئے۔ اہالی قندھار اس واقعہ سے بےخبر تھے۔

شام کے وقت میرویس خان نے گرگین خان کے کپڑے خود پہنے اور اس کے ساتھیوں نے گرگین خان کے ساتھیوں کے کپڑے پہن لئے۔ اور سب کے سب قندھار چل دئے۔ دربان سمجھے گرگین خان اور اس کے ساتھی ہیں۔ فوراً دروازہ

کھل گیا۔ میرویس خان اور اس کے ہمراہیوں نے سارے دربانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور افغان جو شہر کے باہر انتظار میں تھے اندر بلا لئے گئے۔ گرگین خان کے سپاہیوں کی تلاش شروع ہوئی۔ جو ملا تہ تیغ کر ڈالا گیا۔ اس طرح سے گرگین خان کی فوج کا صفایا ہو گیا اور قندہار افغانوں کے ہاتھ آگیا۔

چند روز کے بعد گرگین خان کا لشکر لشکرکشی سے لوٹا اور بہت لوٹ کا مال اپنے ساتھ لایا۔ جب قلعۂ قندہار کے قریب پہنچا تو اندر سے گولیاں برسنے لگیں اصلی بات کا پتہ چلا تو بھگدڑ مچ گئی۔ میرویس خان نے ان کا پیچھا کیا اور اس لشکر کا صفایا کر ڈالا۔ چند تن بچے جنہوں نے ایران پہنچ کر سارا ماجرا شاہ کو سنایا۔

قندہار دشمن کے پنجہ سے آزاد ہوا۔ تو میرویس خان نے قوم کے سرکردوں کو اکٹھا کر کے یوں خطاب کیا:۔

"آپ جانتے ہیں کہ آزادی سے بڑھ کر دنیا میں کوئی نعمت نہیں ہے۔ اگر آپ لوگ متفق ہو کر ہمارا ساتھ دیں تو ہم دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت کو نیچا دکھا سکتے ہیں اور اپنے پاک اور پیارے وطن کو ہمیشہ کے لئے بچا سکتے ہیں۔ اگر آپ لوگوں میں کوئی ایسا ڈرپوک ہو جسے یہ ڈر ہو کہ ایرانی آکر بدلہ لیں گے تو اس پست فطرت شخص کو میرا کہنا یہ ہے کہ تو وہ نہایت اطمینان سے اپنے آقاؤں سے جا ملے میں اس کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا لیکن مجھے یہ گوارا نہیں کہ ہمارے وطن میں کوئی بھی ایسا آدمی رہ جائے جو ایرانیوں سے ڈرے"۔ سارے خوانین نے حلف اٹھا کر جان اور مال سے امداد کا وعدہ کیا

جب یہ خبر پایہ تخت ایران پہنچی تو شاہ نے اپنے ایلچی محمد جامی خان کے ہاتھ میرویس خان کو پیغام بھیجا کہ اینجانب آپ کی ان گرانقدر خدمات سے بہت خوش ہیں اب آپ کو فوراً بیعت کرنا چاہیئے۔

میرویس خان نے یہ جواب دیا کہ آپ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ افغانستان کے پہاڑی باشندوں میں آپ جیسی سمجھ پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ جاؤ ایسی لچر باتیں نہ کرو۔ اب ہم آپ لوگوں کے جھانسوں میں نہیں آتے۔ یہ کہہ کر اس ایلچی کو زندان میں ڈال دیا۔ اس پر بھی شاہ کے جوں تک نہ رینگی۔ بلکہ محمد خان حاکم ہرات کو اپنا نمایندہ مقرر کر کے قندہار بھیجا۔ جب محمد خان نے قندہار پہنچکر میرویس خان پر اپنا مدعا ظاہر کیا تو اس نے کہا کہ اگر تم نے میرے ساتھ حج بیت اللہ نہ کیا ہوتا تو میں تمہیں نہایت سخت سزا دیتا کیونکہ بجائے آزادی کے تم مجھے غلامی کی طرف لیجانا چاہتے ہو۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ افغان ایک دفعہ آزاد ہو کر پھر غلامی کا طوق نہیں پہنیں گے۔

میرویس خان نرمی سے نہ مانا تو شاہ نے یہ ٹھانی
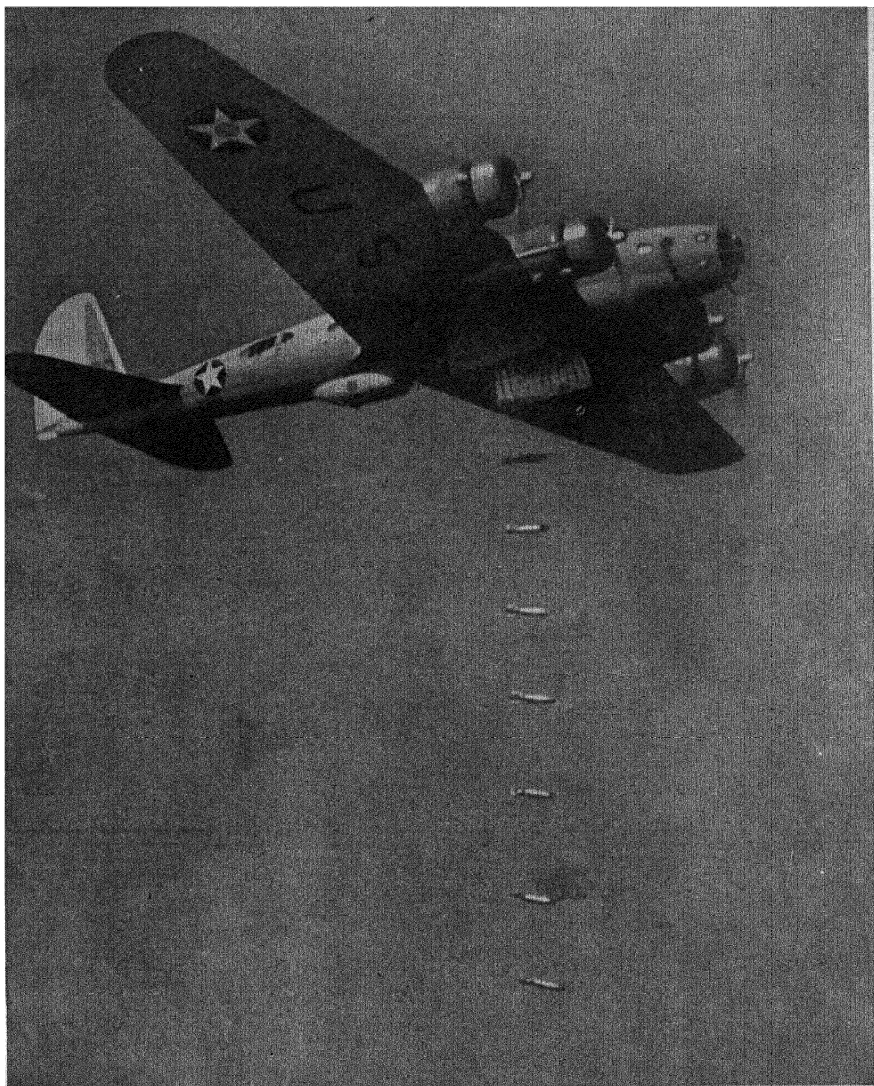
امریکن "بی - ۱۷" قسم کے ایک بمبار طیارہ سے بموں کے گرنے کا منظر۔ اس قسم کے ہزاروں طیارے امریکہ سے جنگ کے مختلف محاذوں پر آجکل برسرپیکار ہیں

کہ اسے بزور شمشیر منایا جائے۔ کچھ دستے بھیجے۔ سب کاصفایا ہوگیا۔ اس پر شاہ نے ایک لشکر جرار بھیجا اور گرگین خان کے بھتیجہ خسرو خان کو جو شجاعت میں چچا سے کم نہ تھا کمان دے دی۔ میرویس خان کے پاس باقاعدہ فوج اور سامان جنگ تو تھے ہی نہیں۔ پہلے پہل بہت پٹا۔ خسرو خان نے قندہار کو گھیر لیا کئی مہینے محاصرہ رہا۔ اس عرصہ میں میرویس خان نے اِدھر اُدھر سے لشکر اکٹھا کیا۔ دشمن کے وسایل حمل ونقل قطع کرڈالے یہانتک کہ خسرو خان کے ذخیرے ختم ہونے لگے اور اس نے محاصرہ چھوڑا۔ تیس ہزار میں سے کل دس ہزار سپاہی بچے تھے جنہیں ساتھ لے کر ایران کی طرف لوٹا۔ جب دریائے ہلمند کے پاس پہنچا تو میرویس خان نے اُسے لڑنے پر مجبور کیا۔ لڑائی ہوئی اور بہت گھسان کی۔ ایرانیوں کے پاؤں اُکھڑ گئے۔ لے دے کے پانسو سپاہی ایران لوٹے شاہ نے محمد رستم خان کی کمان میں ایک اور لشکر بھیجا اس نے بھی شکست کھائی اس کے بعد شاہ ایران نے قندہار کا خیال چھوڑ دیا۔ میرویس خان کو نہ کسی کا کھٹکا رہا نہ کسی کا ڈر۔ بڑے اطمینان کے ساتھ قندہار پر راج کرتا رہا۔ اور بہت سی اصلاحات کیں۔ عمر نے وفا نہ کی۔ ۱۷۱۵ء میں وفات پائی۔ لیکن مرتے دم تک قوم کا خان کہلایا گیا۔ بادشاہ کہلانا گوارا نہیں کیا

—— (محمد علی لنگاہ) ——

بیدار ہو بیدار

اے مردِ خدا! فتنۂ اغیار سے ہُشیار
ہُشیار ہو، ہُشیار ہو، ہُشیار ہو، ہُشیار
ہم تجھ سے نہ کہتے تھے کہ ہونے کو ہے پیکار؟
لے آگئی وہ، سر پہ چمکتی ہوئی تلوار

بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار!
بیدار ہو بیدار!!

بیدار ہے پھر فتنۂ چنگیز جہاں میں
اور تو ہے ابھی تک اثرِ خواب گراں میں۔
صیّاد کمینوں میں ہیں، ناوک ہیں کماں میں
پیشانیٔ دوراں پہ ہیں شب خون کے آثار

بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار ہو، بیدار!
بیدار ہو بیدار!!

(حقی)

(پشتو سے ترجمہ)

(عبدالکریم خان بظلوم)

پشتو رسم الخط

پشتو زبان اور پشتو ادب سے میرا بحیثیت ایک افغان جو گہرا تعلق ہو سکتا ہے اس سے انکار کرنا میرے نزدیک جرم عظیم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے جناب مولانا صاحب کے ہر دو مضامین پشتو رسم الخط اور پشتو ادب لفظ بلفظ پڑھے ہے۔ اس کے علاوہ میاں سید رسول صاحب، پروفیسر محمد علی خان ڈاکٹر سید انوار الحق اور سمندر خان بدرشی کے مضامین سے اس موضوع پر جو روشنی پڑی ہے اس نے افغان قوم کے لئے بالعموم اور پشتو ادبا کے لئے بالخصوص بحث و تمحیص کا میدان وسیع کر دیا ہے اور امید ہے کہ پشتو زبان کے بہی خواہ افغان اس کو بنظر استحسان دیکھیں گے۔

بلاشک مولانا صاحب نے کسی بات کی پرواہ نہ کر کے اور پشتو ادبا سے مخالفت لے کر تنقید کا ایک کٹھن راستہ اختیار کیا ہے۔ اور اس ادبی بحث کو چھیڑ کر سخن سنجوں کو خیال آرائی کی دعوت دی ہے۔ دیکھئے میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ممکن ہو ایسا دن آئے کہ مولانا صاحب کا یہ خیال سب کے دل میں گھر کر لے اور تمام شہروں۔ دیہاتوں اور افغانوں کی تمام بستیوں میں یہ تحریک جڑ پکڑ کر زبان کی ترقی کا باعث ہو۔

ہر زمانہ کا ادب اس زمانہ کے حالات کا آئینہ ہے جس کا اثر آیندہ نسلوں پر جا کر پڑتا ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک نا اہل اپنی کمزوری کی وجہ سے اپنے پیچھے غلط نمونہ چھوڑ جاتا ہے لیکن تجربہ کار اور ماہر آخر کار اس کمی کو ایک ہی ضرب سے درست کر دیتا ہے اور یہ ضرب ایسی ضرب کلیم بن کر رہ جاتی ہے کہ آیندہ کوئی غلط قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اگر اجازت ہو تو مولانا صاحب کی ترجمانی یا نمایندگی یوں کروں کہ گو چشمۂ شیریں حقیقت میں نعمت عظمیٰ ہے لیکن اگر اس کا شیریں اور صاف شفاف پانی بہنا بند ہو جائے تو اس کا نہ صرف بدبودار ہونا یقینی ہے بلکہ اس سے طبیعت کا منغص ہونا بھی ضروری ہے۔ پشتو ادب کی اس تاریک فضا میں اس چشمے کا پانی رک گیا ہے۔ مناسب ہے کہ پشتو زبان کے بہی خواہ اس چشمہ کے گرد و پیش سے تمام کوڑا کرکٹ ہٹا کر اس کو اس قابل بنائیں کہ تمام وطن کی آبیاری کر سکے۔

یہ نہایت نیک فال ہے۔ اگر موجودہ اہل ہنر لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ پر عمل پیرا ہو جائیں تو یہ

حقیقت بن کر رہ جائے۔ میں مولانا صاحب کے اس خیال
سے متفق نہیں ہوں کہ پشتو کا موجودہ رسم الخط چھوڑ کر
اُردو خط اختیار کیا جائے۔ اور نہ ہی میاں سید رسول
صاحب کا عالمانہ اور مدلّل مضمون پڑھ کر اُن کا
ہم خیال ہونے کو تیار ہوں کہ پشتو کا موجودہ رسم الخط
موجودہ صورتِ حالات کے مطابق اور موافق ہے۔

مولانا صاحب کے جواب میں صرف اس قدر
عرض ہے کہ اپنی چیز اپنی اور پرائی پرائی ہوتی ہے۔
میاں سید رسول صاحب کا یہ کہنا کہ اسے جوں کا توں
رہنے دیا جائے ترقی کے راستہ میں ایک زبردست اور
حوصلہ شکن رکاوٹ ہے اس لئے مجھے تسلیم کرنے سے
معذور رکھا جائے۔ پروفیسر محمّد علی صاحب نے
دھیمے دھیمے افغانوں کو لاطینی طریقہ اختیار کرنے
کا وعظ شروع کر دیا اور آخر میں یہ کہا۔

"تمام مشکلات اور عیوب جو میں نے اپنے
مضمون میں بیان کئے ہیں اگر بہ طریقہ احسن
دُور کئے جائیں تو لاطینی رسم الخط ہی پشتو زبان
کے لئے سب سے زیادہ موزون ہے۔"

یہ نرالا خیال ہے۔ اس کی مثال یوں ہے جیسے چوہے
کی دُم سے جہاز باندھا جائے یا گئے بخشوانے
روزے گلے پڑ گئی نماز۔

میرے خیال میں نہ مولانا صاحب اور نہ کوئی
دوسرا افغان ادیب اس کا خواہشمند ہے کہ پشتو کا
موجودہ رسم الخط بالکل مٹا دیا جائے اور لاطینی رسم الخط اختیار
کیا جائے۔ کیونکہ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ ایسا کرنے سے ہم
برسوں نہیں صدیوں پیچھے پڑ جائیں گے۔ اور آئندہ نسلوں
کی نظروں میں ظالم اور بدنام بن کر رہ جانا اس کے علاوہ ہے
میں پہلا شخص ہوں گا جو اپنی تحریر اور تقریر سے
لاطینی رسم الخط کے برخلاف جہاد کروں گا۔

پروفیسر صاحب کا یہ خیال کہ پشتو رسم الخط کے مسئلہ
کا حل افغانستان کے علماء اور فضلاء کے ہاتھ میں دیا جائے
بالکل غلط ہے اور میرے نزدیک ناقابلِ تسلیم۔ کیونکہ ہم
نہ ہی اتنے بے بس ہیں اور نہ ہی افغانستان کے ہاتھوں
اس زبان کو برباد کرانا چاہتے ہیں۔ پشتو زبان میں ہر افغان
برابر کا حقدار ہے۔ اور اس کا فیصلہ کسی ایک کے ہاتھ
میں دینا جرم ہے۔ افغانستان کو ایسا ہی حق پہنچتا ہے
جیسے صوبہ سرحد کو۔ افغان خواہ دُنیا کے کسی حصّہ میں
ہو اس زبان میں برابر کا شریک ہے۔

ڈاکٹر سید انوار الحق صاحب اپنے زوردار
اور مدلّل مضمون میں فرماتے ہیں کہ عرب لوگ
چونکہ بولنے میں پ - ټ - څ - ډ - ړ - ژ اور
ښ کا تلفظ نہیں کرتے اس لئے ان کا رسم الخط
بھی ان حروف سے خالی ہے۔ کیا ہی معقول دلیل ہے؟
جب زبان ایسے حروف سے آشنا نہیں تو زبان
میں کیسے استعمال ہوں اور جب زبان میں نہ ہوں
تو تلفظ کیسے ہو سکے؟

پس معلوم ہوا کہ افغان قوم کے مختلف قبیلے علاقے اور خیل آپس میں متفق بھی ہیں اور مختلف بھی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ښ ۔ څ ۔ ږ ۔ ژ ۔ ښ وغیرہ حروف مختلف علاقوں میں مختلف آواز رکھتے ہیں اور کوئی ایک فریق بھی اپنا مخصوص لب ولہجہ چھوڑنے پر تیار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ بات مان لی جائے تو معاملہ ختم ہے۔

اور مولانا صاحب اپنا خیال واپس لے لیں گے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام اصحاب جنہوں نے پشتو زبان کی ترقی میں قدم اٹھانے کی ہمت کی ہے پیچھے ہٹ جائینگے۔ لیکن نہ ایسا ہو سکتا ہے اور نہ ایسا کرنا مناسب ہے۔

اگر ہم اپنی زبان ۔ ادب اور قومی ترقی کے خواہشمند ہیں تو ہمیں پشتو زبان اور ادب میں خواہ مخواہ انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت محسوس ہوگی۔ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے کہ شروع شروع میں قدامت پسند ہر نئی تحریک یا تحریک والوں کے راستہ میں کانٹے بچھاتے رہے ہیں۔ لیکن تحریک میں اخلاص اور مستقل جذبۂ عمل ہو تو کامیابی یقینی ہے۔ ان مشکلات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی کوشش جاری رکھنا چاہیئے پرانی غلط باتوں کو نہ چھوڑنا اور جدید اور بہتر خیالات کو نہ ماننا ایک غیر دانشمندانہ فعل ہے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ گھاٹ چھوڑ کر دیوانہ وار دریا میں کود پڑنا بھی ہوشمندوں کے نزدیک سراسر بے وقوفی ہے۔

جناب مولانا صاحب نے اپنے ۱۰ اگست والے مضمون بعنوان کتابی یا ادبی پشتو میں جلبہ ادباء کو اس بارے میں طبع آزمائی کی دعوت دی تھی۔ یہ موضوع رسم الخط کی نسبت زیادہ اہم ہے کیونکہ اگر موجودہ ماہرین فن تحقیق اور تفتیش سے کام لے کر پشتو زبان اور اس کے ادب کا قطعی فیصلہ کرکے زبان کو معراج ترقی تک پہنچانا چاہیں تو یہ دونوں موضوع ایک دوسرے سے جدا نہیں کئے جا سکتے۔ میرا اپنا اور اکثر اصحاب کا بھی یہی خیال ہے کہ اصلی زبان کتابی تصور ہو جیسے مونځ ۔ ماښکر ۔ ماښام ۔ کټۍ ۔ نښې وغیرہ الفاظ بولے جاتے ہیں تو یوں لیکن لکھنے

سرزمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیا یاں تو اک قرب فراق آمیز ہے
بدلے یکرنگی کے یہ ناآشنائی ہے غضب
ایک ہی خرمن کے دانوں میں جدائی ہے غضب
لذت قرب حقیقی پر مٹا جاتا ہوں میں
اختلاط موجہ و ساحل سے گھبراتا ہوں میں

(اقبال)

میں نمونخ ۔ نماگیر ۔ نماینام ۔ کوہی ۔ بناٸی ظاہر کئے جاتے ہیں الغرض پشتو رسم الخط سے بڑھکر اس بات کی ضرورت ہے کہ زبان اصلی ۔ قانونی اور معیاری ہو۔

آج ہر پشتو ادیب کا یہی خیال ہے کہ پشتو ادب کی مثال ایک بیمار کی ہے ۔ اگر ڈاکٹر بیمار کے رشتہ داروں کو تسلی دیتا جائے کہ بیمار کی حالت اچھی ہے تو یہ قرین قیاس ہے کہ وہ تیمار داری میں اتنے لا پرواہ ہوجائیں کہ آخرکار بیمار کو موت کی نیند سونا پڑے

بعینہ یہی مثال ہمارے ادب کی ہے ۔ ہر ایک جانتاہے کہ ادب بیمار ہے لیکن اس میں سے کوئی بھی اپنے نسخہ میں بیمار کو اچھا کرنے کی طاقت نہیں دیکھتا ان حالات میں مناسب یہ ہے کہ اگر بیمار کے ساتھ اُن کی ہمدردی ہو تو اُن کے اقربا کو یہ رائے دے دیں کہ وہ ڈاکٹروں (ادبا) کا بورڈ بٹھائیں ۔

دوسرے کے جذبات اور خیالات کو شک کی نظر سے دیکھنا قرین انصاف نہیں ۔ انصاف اور اخلاق کا یہ تقاضا ہے کہ ان جذبات کی قدر کی جاے اور تحقیق کرکے ان تجاویز کو عملی جامہ پہنایا جاے اور بعدازاں معلوم کیا جائے ۔ کہ ادبی معیار میں ان تجاویز کو کونسی جگہ دی جاسکتی ہے ۔ اگر ایسا کیا جاے تو ہماری زبان اور ہمارا ادب دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتے ہوے آگے بڑھتے جائیں گے ۔

مولانا صاحب نے اپنے دوسرے مضمون کتابی ۔ ادبی اور معیاری زبان میں تمام افغان علماء ۔ ادبا ۔ اور دیگر بہی خواہان زبان کو عموماً اور افغان پشتو جرگہ کابل کو خصوصاً مخاطب کرکے اپیل کی تھی ۔ میں چاہتا ہوں کہ مولانا صاحب کے خیالات کی ترجمانی کروں ۔ ایک قانون بنانے کیلئے ایک ایسی مجلس واضع قوانین کی ضرورت ہے جس میں ہر قبیلہ کا نمایندہ شامل ہو تاکہ تجویز پیش ہونے پر اپنا اظہار خیال کرسکے اور اس پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈال سکے ۔ چونکہ اس قانون کے پاس ہونے میں قوم کی بہتری مدنظر ہوگی اسلیئے ہر ایک اسے پاس کرنے کا خواہشمند ہوگا اور کافی بحث وتمحیص کے بعد سب کیلئے قانون بن جائے گا ۔ اگر ایسی مجلس طلب کی جاسکے اور ایسا قانون تجویز ہوکر پاس ہوسکے تو ہمارا مدعا حاصل ہوجائیگا۔

اگر ملت افغان پشتو زبان سے ہمدردی ہیں کوئی قدم اٹھائے توخدا کے فضل سے کامیابی یقینی ہے ۔ خدا کرے کہ یہ تجویز نیک تصور ہو۔

اے صاحبو! قوم کی خبر لو　　قطروں کا سا اتفاق کرلو
قطروں ہی سے ہوگی نہر جاری　　چل نکلیں گی کشتیاں ساری

قدیم اور جدید اخلاق

(۴)

نٹشے کا فوق البشر ہر قوم اور ہر نسل میں معرض وجود میں آیا ہے۔ اس کی تخلیق کسی خاص خطہ تک محدود نہیں۔ لیکن نٹشے کے پیروؤں نے خود غرضی سے اس کے فلسفۂ اخلاق کو نیا رنگ دے دیا اور فوق البشر کے مفہوم کو ایک خاص قوم اور نسل کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ بلکہ دنیا کی اور قوموں اور نسلوں کو بنظر حقارت دیکھنا شروع کر دیا۔ اس فلسفہ میں ایک خاص نقص یہ ہے کہ اس کی بنیاد نسلی افتخار پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ نسلی افتخار خود غرضی، سفاکی اور دیگر حیوانی جذبات کا سرچشمہ ہے۔ نسلی افتخار کا جذبہ اتنا ترقی پا گیا کہ انسان اچھے خاصے آدم خور حیوان بن چکے ہیں جو دنیا کو کشت و خون کا ایک دائمی اکھاڑہ تصور کئے ہوئے ہیں۔ غرض نسلی افتخار کے جذبہ میں شر و فساد کے جراثیم پائے جاتے ہیں۔

ہٹلر اس نئے فلسفہ اور اس نئی روح کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ نٹشے کو روحانی پیشوا سمجھتا اور اس کی اندھا دھند تقلید کرتا ہے۔ البتہ اس نے کچھ ترمیم کر کے اس نسلی فلسفہ کو عملی جامہ پہنا دیا ہے۔ ہٹلر نے جرمن قوم کے جذبۂ جہانگیری کو اپیل کرتے ہوئے یہ فلسفہ ایسے مؤثر طریقہ سے پیش کیا کہ ساری قوم تڑپ اٹھی اور اس میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ نٹشے کا غلط اور گمراہ کن فلسفہ صحیح دکھائی دینے لگا اور وہ صحیح مذہبی اخلاق اور تمدن سے منحرف ہو گئے۔

اس جذبۂ جہانگیری کی رو سے ہٹلر نے نئے نئے اخلاقی اصول وضع کئے اور جرمن قوم کے ذہن نشین کر دیا کہ یہ نیا مسلک نہ صرف جرمن قوم کے دکھوں ہی کی دوا ہے بلکہ دنیا کی تہذیب اور ترقی کے لئے بھی اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔ اسلئے موجودہ جرمن سپاہی اپنی دانست میں نہ صرف اپنے وطن ہی کے لئے بلکہ نوع البشر کی ترقی کے لئے جہاد کر رہے ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ جرمنی کا اقتدار نہ صرف جرمن قوم کے لئے بلکہ سارے جہان
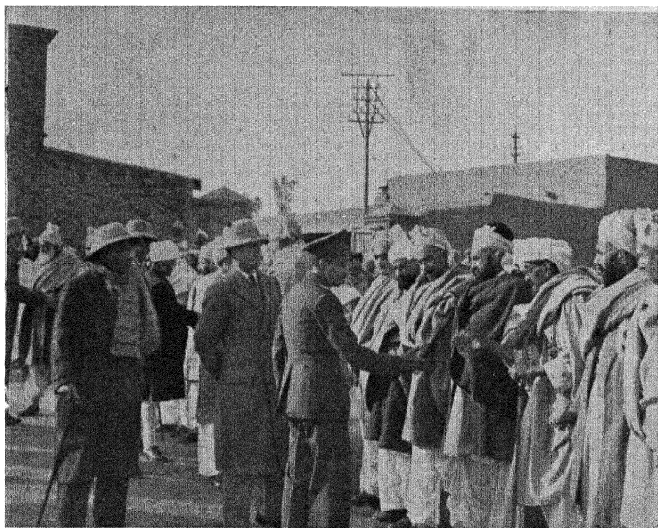
درۂ خیبر کے آزاد قبائلی علاقوں کے سفید پوش اور سربرآوردہ لوگ ہندوستان کے ڈیفنس کونسل کے ممبروں کو خوش آمدید کہتے ہوئے ہاتھ ملا رہے ہیں تھوڑے ہی دن ہوئے کہ ڈیفنس کونسل کے ممبر درۂ خیبر کو دیکھنے گئے تھے اور پٹھانوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی کے مطابق ہر جگہ اُن کی خوب خاطر و مدارات کی تھی۔

مکتب صنائع نفیسہ (کابل) کے چند طلبا قالین بُن رہے ہیں۔ افغانستان کے قالین پہلے بھی سب دنیا میں مشہور تھے اور اب تو یہ صنعت اور بھی زیادہ ترقی کرے گی۔ کیونکہ تعلیم یافتہ افغان نوجوانوں کو باقاعدہ یہ ہُنر سکھایا جاتا ہے

کے لئے باعث رحمت ہے۔

نطشے کا یہ چیلہ دنیا کو تعلیم دیتا ہے کہ جرمن ہی فوق البشر ہیں اور دنیا کی قوموں کی رہنمائی کے لئے جرمنوں سے بہتر کون ہو سکتا ہے۔ ان کے نزدیک اور قومیں اچھوت ہیں غیر مہذب اور بیکار ہیں بلکہ ان کی حیثیت وہی ہے جو جانوروں کی اور فوق البشر قوم کی صرف تابعداری کر سکتی ہیں۔ جرمن قوم افضل ہونے کی حیثیت سے اگر دوسری قوموں کے ساتھ سختی اور ظلم سے بھی پیش آئے تو یہ نہ صرف جائز ہے بلکہ کار ثواب ہوگا۔

جرمنی کے نئے یورپین نظام اور جاپان کے نئے ایشیائی نظام کا محرک بھی وہی نسلی جذبہ ہے اور نسلی برتری کا فلسفہ اُن کے ارادوں کو مضبوط کئے ہوئے ہے۔ لیکن یہ نیا فلسفۂ حیات مذہب پر ایک کاری ضرب ہے۔ کیونکہ مذہب نسلی امتیاز اور افتخار کا قائل نہیں بلکہ اسکے نزدیک نیک اعمال ہی سے انسان فضیلت پاتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ انسان صرف مذہبی اصولوں پر کاربند رہ کر حقیقی خوبیوں کا مالک بن سکتا ہے۔ نسل سے فضیلت نہیں ہو سکتی بلکہ ہر نسل کا آدمی مذہبی اصولوں پر عمل پیرا ہو کر پاکیزہ اور افضل انسان بن سکتا ہے۔

جاپانی اور جرمن اس نظریہ کو جھٹلاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حیوانوں میں نسل بہت اہمیت رکھتی ہے۔ یعنی اچھی نسل کا حیوان اچھا اور بُری نسل کا بُرا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان میں نسلی امتیاز قایم ہے۔

مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ عجمی ٹٹو کتنا ہی تربیت یافتہ کیوں نہ ہو عربی النسل گھوڑے کا مقابلہ کر نہیں سکتا۔ کیونکہ عجمی نسل عربی نسل کے مقابلہ میں ناقص ہے۔ عربی گھوڑا اگر بچپن سے عمدہ پرورش اور تربیت پائے تو وہ یقیناً گھوڑوں کا سردار بن سکتا ہے۔

نصیحت کی بھی حد ہوتی ہے کوئی حضرت ناصح
بس اب سمجھا چکو تم ورنہ ہم تم کو سمجھتے ہیں
کسی کا دل دُکھے یا جان جائے اُن کو کیا پروا
وہ دل کو دل سمجھتے ہیں نہ دم کو دم سمجھتے ہیں
(بیخود)

روس میں مشرقی ادبیات کا چرچا

یورپین ممالک کے فضلاء اور محققین مشرقی زبانوں اور ادبیات کے مطالعہ کو مدتوں سے اہمیت دیتے آئے ہیں۔ انقلاب سے پہلے بھی روس اس میدان میں بہت بڑھ نکلا تھا لیکن سوروی حکومت کی مطبوعات میں ایک نمایاں پہلو یہ پایا جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ متروک زبانوں اور پرانے ادبیات ہی تک محدود ہوں اُن تمام زبانوں پر حاوی ہیں جو مشرق کے ترقی یافتہ ممالک میں آج کل رائج ہیں۔ اس مختصر سے مقالہ میں سوروی حکومت کی چند تازہ اور اہم نشریات کا ذکر کرنا ہے جو قارئین کرام کیلئے دلچسپی سے خالی نہ ہوں۔

ہندوستانی زبانوں کی کئی کتابیں تالیف ہو چکی ہیں۔ ان میں سے دو بہترین کتابیں اُردو سیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں زبان سیکھنے کا طریقہ جو روس میں رائج ہے ذرا نرالا ہے۔ روسی اس کے حق میں نہیں ہیں کہ صرف و نحو کی گردانیں کرائی جائیں۔ وہ اس بات کے بھی مخالف ہیں کہ کتابوں کے ترجمے کئے جائیں۔ وہ اس بات کے حامی ہیں کہ صرف و نحو نرے اصولی نقطۂ نظر سے سیکھی جائے۔ البتہ سہولت کے لئے دلچسپ ریڈر خاص توجہ سے مرتب کئے جائیں۔ ان ریڈروں کا ترجمہ تو فراہم کیا نہیں کیا جاتا۔ لیکن ہر لفظ اور محاورہ کا روسی ترجمہ دیا ہوتا ہے۔

اردو ریڈروں میں سب سے پہلی ریڈر "گنگوتری کا افسانہ" ہے۔ جس کا مؤلف عزیز الدین احمد ہے۔ یہ ہندوستانی زندگی کی ایک سیدھی سادھی مگر موثر کہانی ہے اور ناول "کنیز فاطمہ" سے لی گئی ہے۔ موجودہ طرز زبان سیکھنے کیلئے یہ نہایت پاکیزہ ابتدائی کتاب ہے۔ چھپائی نہایت دیدہ زیب اور لغت ہر لحاظ سے پسندیدہ ہے۔

بارانیکوف نے ایک مفصل ریڈر "منتخبات اُردو" کے نام سے مرتب کی ہے۔ یہ دوسرے سال کے طلباء کے لئے ہے۔ اس میں شمس العلماء مولانا نذیر احمد کی "مرأۃ العروس" مولانا حالی کی "حیات جاوید" اور شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی کے "سفرنامہ" میں سے لمبے لمبے چیدہ چیدہ اقتباسات درج ہیں غالباً اردو ادب کا یہ مفید ترین کشکول ہے۔ اس میں ایک اور فایدہ یہ ہے کہ اُردو کے بالمقابل روسی لغت کے ساتھ ساتھ انگریزی لغت بھی شامل کی گئی ہے۔ منتخبات کی بہت سی اور کتابیں ہیں جو غیر معمولی الفاظ اور اصطلاحات سے بھری ہوئی ہیں اور زبان سیکھنے والوں کے سوا اور کسی کے لئے دلچسپی کا باعث ہو نہیں سکتیں۔

اے۔ اے۔ روماسکیویچ نے ایک نادر کتاب لکھی

ہے جس کا نام "اقتباسات از مطبوعات فارسیٔ عصری" رکھا ہے
جو طالب علم آجکل کی مروجہ فارسی پرانی فارسی کے مقابلہ میں
سیکھنا چاہے اس کے لئے یہ کتاب بہت کارآمد ہے۔ یہ اقتباسات
سارے کے سارے ۱۹۲۷ء کے ایرانی اخباروں اور میگزینوں
سے لئے گئے ہیں اور سر مقالوں، پارلیمنٹ کے مباحثوں
کی رپورٹوں اور ہر قسم کے اشتہارات اور اعلانات پر مشتمل
ہیں۔ یہ اقتباسات بڑے وسیع پیمانہ پر ہیں اور جو طالب علم
انہیں پڑھ لے نہ صرف تازہ ترین فارسی اصطلاحات کے
ایک وسیع مجموعہ کا مالک ہوجائے گا بلکہ موجودہ ایران کے
بڑے بڑے شہروں کے حالات سے بخوبی واقف ہوجائے گا

بہتوں کا عقیدہ ہے کہ نئے الفاظ کے استعمال سے
بلکہ پرانے الفاظ نئے سرے سے استعمال کئے جانے سے فارسی زبان
کی ہیئت ہی بدل گئی ہے۔ لیکن ان اقتباسات اور آجکل
کی اخباری زبان کا مقابلہ کیا جائے تو یہ عقیدہ بے بنیاد نظر
آنے لگیگا۔ مجموعہ الفاظ و اصطلاحات جو اس کتاب میں ہے
اتنا مکمل ہے کہ تعجب ہوتا ہے۔ کم از کم ایسی فارسی لغات راقم الحروف
کی نظر سے تو نہیں گذری۔ البتہ ایک قباحت ہے وہ یہ کہ
جتنی تشریحیں یا توضیحیں ہیں سب کی سب روسی زبان میں ہیں

روسی ادبا نے غالباً سب سے زیادہ کوشش عربی زبان
کے متعلق کی ہے۔ ن۔ و۔ لشمانوف نے ایک ابتدائی کتاب
"ادبی عربی کی صرف و نحو" کے نام سے لکھی ہے۔ اختصار
کے لحاظ سے یہ سوسن کی تصنیف کو بھی مات کر گئی ہے
تاہم اتنی ہی جامع ہے۔ اس کا کاغذ نہایت نفیس اور چھپائی

نہایت پاکیزہ ہے۔ اس کے ساتھ دو امدادی کتابیں بھی ہیں۔
ایک تو چھوٹی سی ریڈر ہے جس میں چھوٹی چھوٹی کہانیاں ہیں
دوسری بڑی ضخیم کتاب ہے اور الامام الشیخ محمد عبدہٗ
سے لے کر سلما الصایغ تک تمام جدید عربی ادبا کی تصانیف
پر حاوی ہے۔ ان انتخابات میں بھی نہایت رواداری
سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اقتباسات الشیخ عبدالرحمٰن الکواکبی
اور نجیب حداد جیسے مصنفوں اور اخبار نویسوں اور جورجی زیدان
اور السید مصطفیٰ لطفی المنفلوطی جیسے ناول نویسوں کی تصانیف میں سے
جمع کئے گئے ہیں۔ امین الریحانی۔ جبران خلیل جبران اور تیق جار اور
ہمعصر مصنّفین کی تحریروں کے نمونے بھی درج کئے گئے ہیں
اس مجموعہ کا نہایت دلچسپ حصہ وہ ہے جس میں السیدہ ملک حفنی
ناصف اور السیدہ مریم زیوادی جیسی مصنفات کے کلام کے نمونے
درج ہیں۔ اس کتاب میں حسب معمول الفاظ اور اصطلاحات کی
ایسی مکمل تشریح دی ہوئی ہے کہ لغات کی ضرورت نہیں رہتی

ہندوستانی زبانوں میں سے بنگالی۔ مرہٹی اور
تامل میں بھی کتابیں موجود ہیں۔ یہ یا تو ریڈریں ہیں یا صرف و نحو
پر لکھی گئی ہیں۔ خود روس میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کی
طرف بھی خاص توجہ کی گئی ہے۔

ترکی اور دیگر زبانیں جو یورال وغیرہ میں رائج ہیں۔
ان کی مختلف مقامی بولیوں کے متعلق کئی دلچسپ اور
بنیظیر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جب یہ خیال آتا ہے کہ یہ بڑھتا ہوا
کام اب معرض التواء میں پڑ گیا ہے تو دل کو صدمہ ہوتا ہے

تاریخ پشاور

گذشتہ سے پیوستہ

دوسری جانب سے یونانی شاہزادے سیستان کے راستہ سے پنجاب پر حملہ آور ہوئے اور پنجاب فتح کر کے پشاور آئے۔ اس خاندان کے ایک مشہور بادشاہ کا نام گنڈو فرز تھا۔ اس کے عہد کا ایک کتبہ حال ہی میں تخت بہائی کے نزدیک ملا ہے۔ عیسائی مبلغ سینٹ تھامس اپنے دین کی تبلیغ کے لئے اسی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا تھا۔ ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان کے کے قبیلۂ گنڈاپور کے بعض افراد اپنے خاندانوں کا سلسلہ اسی بادشاہ سے ملاتے ہیں۔

یونانی زمانہ کے بہت سے بُت حال ہی میں برآمد ہوئے ہیں۔ ان بتوں سے پایا جاتا ہے کہ اس خاندان کے پینتیس بادشاہ اور تین ملکہ پشاور پر حکومت کر چکے ہیں۔ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے خاندان کوشان نے یونانیوں سے بلخ کی سلطنت چھین لی تھی۔ اس خاندان کا ایک نامور بادشاہ راجہ کنشک تھا۔ اس کا پایہ تخت بھی پشاور ہی تھا۔ یہ وہی راجہ ہے جس نے مہاتما بدھ کی راکھ ایک ڈبہ میں بند کر کے پشاور کے پاس ہی "شاہ جی" نام پہاڑی میں دفن کرائی تھی۔ پشاور کے آس پاس پہاڑیوں میں خاندان کوشان کے زمانہ کے بہت سے بُت وغیرہ دستیاب ہوئے ہیں۔ یہ اس خاندان کی یادگاریں اور اس زمانہ کی تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ اس موضوع پر علیحدہ مضمون لکھا جائے گا۔

خاندان کوشان کے بعد ایک عرصہ تک تاریخ میں پشاور کا کوئی ذکراذکار نہیں۔ البتہ چوتھی صدی (عیسوی) میں ایک چینی سیّاح پشاور آیا۔ وہ لکھتا ہے کہ اِس وقت شاہی مذہب یعنی بدھ مت زوروں پر ہے۔ اس کے بعد ۵۲۰ء میں ایک اور چینی سیّاح سانگ یون اس علاقہ کی بابت لکھتا ہے کہ ہن قوم کے پے در پے یلغاروں سے اس علاقہ میں ابتری پھیلی ہوئی ہے۔ ہن قوم کے بادشاہ مہرگل نے سولہ بدھی مندر جلادئے اور بہت سے باشندوں کو تہ تیغ کر ڈالا۔ سو سال بعد مشہور چینی سیاح ہیون سانگ پشاور آیا تو تباہی کے

کی آزادی تسلیم کرلی اور خوشحال خان خٹک اپنے پاک ارادوں میں کامیاب ہوگیا۔

۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے پشاور کا علاقہ سَر کیا لیکن معمولی خراج کے بدلے افغانوں کو ان کی اپنی حالت پر چھوڑ دیا۔

نادر شاہ کے بعد درّانیوں کا دور شروع ہُوا۔ احمد شاہ درّانی نے اس علاقہ کے تمام قبایل کو مطیع کرلیا۔ شاہ شجاع الملک درّانی پشاور کا آخری حکمران تھا۔ اس کے دربار میں الفنسٹن کی سرکردگی میں پہلا انگریزی مشن باریاب ہُوا۔

شاہ شجاع کے بعد سکھوں کا تاریک دور شروع ہوا۔ لڑائی فساد کا دور دورہ رہا۔ سکھ چاہتے تھے افغانستان پر چڑھائی کریں۔ اسی خیال سے جمرود میں قلعہ تعمیر کرنے لگے۔ سکھوں اور افغانوں میں خونریز لڑائی ہوئی۔ سکھوں کا نامی جرنیل ہری سنگھ کام آیا اور سکھ فوج میں بھگدڑ پڑ گئی۔ تاہم پشاور سکھوں ہی کے قبضہ میں رہا۔

سکھ حکومت کی طرف سے ابوطبیلہ پشاور کا ایک گورنر گذرا ہے جو اپنی غیر معمولی قابلیت کی وجہ سے خاص کر قابل ذکر ہے۔

۱۸۴۶ء میں انگریزوں اور سکھوں میں لڑائی ہوئی اس کے بعد گلاب سنگھ پشاور کا سکھ گورنر اور میجر لارنس انگریزوں کی طرف سے ریزیڈنٹ مقرر ہوئے۔ تب سے انگریزوں کا اثر قایم ہونے لگا۔ بعد کی سرگذشت سے قارئین کرام خوب واقف ہیں ؛

لطیفے

(۱)

ایک صاحب گھوڑے کی پیٹھ پر بغیر زین ہی لد گئے ایک بے تکلف دوست کی قمچی لگتے ہی گھوڑے نے فرآٹے بھرنے شروع کر دیئے۔ میاں شہسوار صاحب کی شہسواری پُشت کی جانب کھسکتے کھسکتے دُم کے قریب پہنچ کر زمین پر آ پڑے۔ مگر تھے غیرت دار۔ جھٹ زمین سے اٹھ کر چوتڑا جھاڑتے ہوئے فرمانے لگے کہ

"حضرت کیا کیا جائے گھوڑا ہی ختم ہوگیا ورنہ ایں جانب تو ابھی ہفتوں ڈٹے رہتے"!

(۲)

ایک ظریف کسی باغ میں گیا اور انگور وغیرہ دیکھکر توڑ توڑ کر ایک ٹوکری میں بھرنے لگا۔ اتفاقاً باغبان آ گیا اور کہا کہ تو یہاں باغ میں کیوں آیا ظریف بولا میں ارادۃً نہیں آیا بلکہ آندھی آئی اور اس نے مجھے یہاں لا ڈالا۔ باغبان نے کہا کہ اچھا یونہی سہی۔ مگر انگور کیوں توڑے وہ بولا میں نے تو نہیں توڑے۔ مگر آندھی سے اُڑ کر درختوں سے ٹکرا کر جو میں گرا تو شاید کچھ انگور ٹوٹ گئے ہوں۔ باغبان بولا کہ اچھا یہ سب کچھ مجھے تسلیم مگر ٹوکرے میں کیسے آئے۔ ظریف بولا یہی تو مجھے بھی حیرت ہے۔ اسے قدرتِ الٰہی سمجھیئے۔

صوفیائے قدیم اور خدمتِ خلق

پروفیسر آئیونوف روسی کے مقالہ کا ترجمہ

(خاص نن پرون کیلئے)

انسانی ادارے بھی افراد بشر سے ملتے جلتے ہیں اُٹھان کے زمانہ میں بہت جوش ہوتا ہے مگر اس جوش سے عملی فائدہ اُٹھانے کی اہلیت نہیں ہوتی - جوں جوں سِن بڑھتا ہے ان کی معلومات بھی بڑھتی ہیں - یہاں تک کہ سوسائٹی کے کار آمد بلکہ کبھی کبھی اہم رکن بنجاتے ہیں - آگے چل کر آہستہ آہستہ اُتار شروع ہونے لگتا ہے - آخر کار بڑھاپا آجاتا ہے اور سارا انجر پنجر ڈھیلا اور بیکار ہو جاتا ہے - صوفیائے قدیم کے نظام کا بھی یہی حال رہا ہے - ابتدا میں ان میں پارسائی اور جوش کی بہتات تھی اور ترک دنیا اور نفس کشی کا جذبہ عام تھا - رفتہ رفتہ ان میں بڑی بڑی مذہبی انجمنیں بنتی گئیں - یہ انجمنیں بلاشبہ بڑے وسیع پیمانہ پر روحانی تعلیم پھیلاتی تھیں بلکہ اکثر اوقات سیاسیات میں بھی انہیں بڑا دخل رہتا تھا - چودھویں یا پندرہویں صدی تک تو بہت زوروں پر رہیں - اس کے بعد ڈھیلی پڑ گئیں - پچھلی صدی میں تو اتنی گر گئیں کہ نرے بھکاریوں کی منظم جماعتیں ہو رہیں - افیون اور چرس کی عادتیں ان میں عام ہو گئیں - نادان عوام کے توہمات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا پیٹ پالنے لگے - ان باتوں نے انہیں سمجھدار طبقوں کی نظروں سے بالکل گرا دیا

حال ہی میں یہ جماعتیں ترکی ، ایران اور روس کے اسلامی خطوں میں ممنوع قرار دی گئی ہیں - اب تو عوام میں بھی کوئی ان کا پوچھنے والا نہیں رہا - عرب ممالک میں ڈھونڈے سے نہیں ملتیں - ہاں ہندوستان کے بعض پھٹی ہوئی مقامات میں کچھ بچی کھچی انجمنیں ہیں لیکن کہاں وہ پرانی مقتدر انجمنیں اور کہاں یہ ان پڑھ بھیکاریوں کے ٹولے -

صوفیہ انجمنوں کے اس حشر یعنی ان کے بڑھاپے اور موت کی کئی تاریخی وجوہات ہیں مثلاً اقتصادی حالات کی الٹ پلٹ ، مغربی تہذیب کی ترقی وغیرہ -

لیکن ان کی موجودہ حالت کی بنا پر رائے قایم کرنا سرسر غلطی ہے۔ تاریخ اسلام میں غالباً چند ہی اور انجمنیں ملیں گی جن کو عوام و خواص کی ذہنی زندگی کی نشو و نما میں ایسا اہم دخل رہا ہو۔ حالات سازگار ہوں تو ان کے طریق کار توجہ بلکہ تقلید کے مستحق ہیں۔ یہ تو سبھی جانتے ہیں کہ السنہ شرقیہ میں تصوف اور اس کی سرگذشت پر بے شمار تصانیف موجود ہیں اور مغربی ممالک میں بھی بہت سی کتابیں لکھی جا چکی ہیں لیکن یہ ساری تحقیقات تصوف کے صرف ایک پہلو تک محدود رہی ہے۔ یعنی ان کا یہ نظریہ کہ انسان بلا واسطہ خدا کو پا سکتا ہے اور اس نظریہ کا اثر دینیات پر۔ صوفیوں کی فعالیت کا ایک اور پہلو بھی ہے جس کا ابھی تک جیسا کہ شاید و باید مطالعہ کیا نہیں گیا ہے اور اسی پہلو کو محض مذہبی پہلو کی نسبت زیادہ اہمیت دی جا سکتی ہے۔
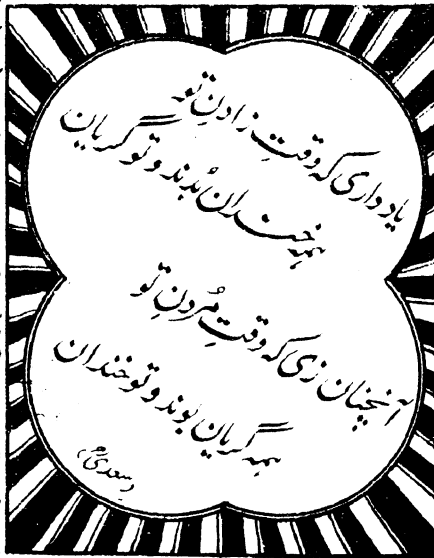
صوفی مرشد اور ان کے مرید خیرات پر گذر اوقات کیا کرتے تھے۔ اس غرض سے انہیں بہت پراپیگنڈہ کرنا پڑتا تھا۔ جہاں تک ان کے بس میں ہوتا تھا پبلک کے ان افراد کو گرویدہ کرنے کی کوشش کرتے تھے جو دین کی طرف رجحان تو رکھتے تھے اور زہد و تقویٰ کے معترف بھی تھے مگر ان کے حالات اجازت نہ دیتے تھے کہ صوم و صلوٰۃ کے لئے وقف ہو جائیں۔

صوفیوں کے ایسے شیدائی اور خیر خواہ ہر طبقہ میں کثرت سے تھے اور ان خدا پرستی کے زمانوں میں ایسے لوگوں ہی کی اکثریت ہوتی تھی۔ ان کی دالستت میں خانقاہیں ہی (جہاں صوفی رہا کرتے تھے) عوام کی تعلیم و تربیت کا اہم مرکز تھیں قرون وسطےٰ کی طرزِ زندگی میں ایک سراپن رہتا تھا۔ ایسی جگہیں کم ہوتی تھیں جہاں مختلف جشنوں کے سوا اور کسی غرض سے لوگ اکٹھے ہوتے ہوں۔ مسجدیں اور مدرسے دینداری کے اڈے تھے۔ لیکن مسجد ایک پبلک ادارہ ہے وہاں سب برابر ہیں۔ وہاں ہر شخص جا سکتا ہے اور کسی قسم کا امتیاز نہیں ہو سکتا۔ اس لئے مسجدیں ایسے ہی لوگوں کا ملنا محال تھا جن کا مذاق، نظریہ اور نصب العین واحد ہوں مسجد اور صوفیہ کی خانقاہ یا ایسی ہی اور جگہوں میں

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقتِ مردنِ تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

سعدیؒ

بڑا فرق تھا۔ خانقاہ میں عام جلسوں کے علاوہ بڑے
فاضل شیوخ وعظ فرمایا کرتے تھے اور بڑی اطمینان
اور رواداری سے بحث مباحثے ہوا کرتے تھے اور
ان مواعظ اور مباحثوں کا ذکر مختلف صوفیاے کرام
کی سوانح حیات میں کثرت سے پایا جاتا ہے

گرمیوں میں دن ڈھلے امیر اپنے قیلولہ کے بعد اور
غریب اپنا کام ختم کر کے سب کے سب اپنے محترم
مرشد کی خدمت میں آداب بجا لانے کے لئے اکٹھے ہو
جاتے اور گھنٹہ بھر آرام کرتے اور روحانی لطف
اٹھاتے تھے۔ جگہ کی پاکی اور میزبان کا روحانی مقام
اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ چھچھوری یا
نازیبا گفتگو درمیان میں آئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس اطمینان اور اپنایت کی فضا
اور کسی پڑھے لکھے پختہ کار مرشد کی عاقلانہ رہنمائی میں
زندگی، مذہب کے اہم مسایل، سیاسی واقعات اور
بہت سے اور امور کے متعلق گفتگوئیں رہتی تھیں۔ اس
لحاظ سے خانقاہ بیک وقت ایک علمی ادارہ بھی تھی اور
ایک سیاسی یا معاشرتی کلب بھی۔ تبلیغ دین کا
مرکز بھی اور ادبی اور فلسفیانہ مضامین پر بحث تمحیص کا
اڈہ بھی۔ ایسے ادارے اگر موجودہ حالات میں قایم ہو
سکیں تو کتنے زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔

کوئی تعجب نہیں کہ سارا فارسی ادب صوفیانہ تخیل
میں چور ہے۔ بلکہ تصوف کا اثر انسانی فعالیت کے ہر پہلو
میں پایا جاتا ہے یہاں تک کہ فوج بھی اس اثر سے مبرا نہیں
جیسا کہ بکتاشی اور دیگر سلسلوں سے پایا جاتا ہے
اور ہر قسم کے تجارتی کاروبار کی اپنی اپنی صوفیانہ روایات ہیں

وہ خانہ بدوش درویش بھی نرے طفیلیے یا بیکار نہیں
تھے۔ گاؤں گاؤں پھرتے تھے تو طرح طرح کی تفریح کے
سامان مہیا کرتے اور اپنا نقش جماتے تب کہیں انہیں کچھ مل پاتا تھا
زیادہ تر صوفیانہ اشعار گاتے تھے یا مختلف مسایل پر ایسی
گفتگو کرتے تھے جس سے ان کا لکھا پڑھا اور باخبر ہونا ثابت
ہوتا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درویش عام طور
پر مستند شعراء کا کلام جس کے انتخاب میں نہایت صحیح
مذاق سے کام لیا جاتا تھا پڑھا کرتے تھے۔ یہ کلام فارسی
میں نفیس شعر کیا تھے۔ ہیرے تھے۔ بیچارے ان پڑھ
عوام بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ ایسے گیت سننے
کے اور موقعے انہیں میسر نہ تھے۔

صوفیاے کرام کی پرانی سوانح عمریوں
سے پتا چلتا ہے کہ گذشتہ زمانوں میں ان کے
اداروں کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے
ان سوانح عمریوں کا مطالعہ بہت سود مند ہے۔

آپ کی مرضی لیکن ......

تبصرہ، تنقید یا اعتراض کا مادہ ابتداء تاریخ سے ہر رہنما، عالم، ادیب، شاعر اور مصنّف کے حصّہ میں آیا ہے رائج الوقت مذہب یا فلسفہ یا سیاسی اور معاشرتی رسم و رواج سے ہر نئے پیغام، ہر نئے خیال یا ہر نئی تحریک کی ٹکر رہی ہے بعض اوقات یہ نیا پیغام یا خیال تجدیدی شکل میں ہوتا ہے کبھی ترمیمی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی کبھی اس کا مقصد ایک بالکل انقلابی تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے جو صورت اختیار کرے عوام کے عقاید معنویات اور ملّی جذبات کے ساتھ اس نئے پیغام یا اس نئی تحریک کا تصادم ہوتا رہتا ہے اور اس تصادم کے لئے آسانی سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔

سب سے زیادہ مخالفت انقلابی اصلاحات سے ہوتی ہے خصوصًا جب کہ یہ اصلاحات مذہب کے بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ مثلاً ہمارے آقائے نامدار حضرت رسُولِ اکرمؐ مشرکوں کو جن کے تین سو ساٹھ معبود تھے توحید کا پیغام پہنچاتے تھے اور ذات باری تعالےٰ کے

بڑا فرق تھا خانقاہ میں عام جلسوں کے علاوہ بڑے فاضل شیوخ وعظ فرمایا کرتے تھے اور بڑی اطمینان اور رواداری سے بحث مباحثے ہوا کرتے تھے اور ان مواعظ اور مباحثوں کا ذکر مختلف صوفیائے کرام کی سوانح حیات میں کثرت سے پایا جاتا ہے

گرمیوں میں دن ڈھلے امیر اپنے قیلولہ کے بعد اور غریب اپنا کام ختم کرکے سب کے سب اپنے محترم مرشد کی خدمت میں آداب بجا لانے کے لئے اکٹھے ہو جاتے اور گھنٹہ بھر آرام کرتے اور روحانی لطف اٹھاتے تھے۔ جگہ کی پاکی اور میزبان کا روحانی مقام اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ چھچھوری یا نازیبا گفتگو درمیان میں آئے۔

اس میں شک نہیں کہ اس اطمینان اور اپنائیت کی فضا اور کسی پڑھے لکھے پختہ کار مرشد کی عاقلانہ رہنمائی میں زندگی، مذہب کے اہم مسایل، سیاسی واقعات اور بہت سے اور امور کے متعلق گفتگوئیں رہتی تھیں۔ اس لحاظ سے خانقاہ بیک وقت ایک علمی ادارہ بھی تھی اور ایک سیاسی یا معاشرتی کلب بھی۔ تبلیغ دین کا مرکز بھی اور ادبی اور فلسفیانہ مضامین پر بحث تمحیص کا اڈہ بھی۔ ایسے ادارے اگر موجودہ حالات میں قایم ہو سکیں تو کتنے زیادہ کارآمد ثابت ہوں۔

کوئی تعجب نہیں کہ سارا فارسی ادب صوفیانہ تخیل میں چور ہے۔ بلکہ تصوف کا اثر انسانی فعالیت کے ہر پہلو میں پایا جاتا ہے یہاں تک کہ فوج بھی اس اثر سے مبرا نہیں جیسا کہ بختاشی اور دیگر سلسلوں سے پایا جاتا ہے اور ہر قسم کے تجارتی کاروبار کی اپنی اپنی صوفیانہ روایات ہیں

وہ خانہ بدوش درویش بھی نرے طفیلیے یا بیکار نہیں تھے۔ گاؤں گاؤں پھرتے تھے تو طرح طرح کی تفریح کے سامان مہیا کرتے اور اپنا نقش جماتے تب کہیں انہیں کچھ مل پاتا تھا زیادہ تر صوفیانہ اشعار گاتے تھے یا مختلف مسایل پر ایسی گفتگو کرتے تھے جس سے ان کا لکھا پڑھا اور باخبر ہونا ثابت ہوتا تھا۔ تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ درویش عام طور پر مستند شعراء کا کلام جس کے انتخاب میں نہایت صحیح مذاق سے کام لیا جاتا تھا پڑھا کرتے تھے۔ یہ کلام فارسی میں تھا۔ شعر کیا تھے۔ ہیرے تھے۔ بیچارے ان پڑھ عوام بہت خوش ہوتے تھے کیونکہ ایسے گیت سننے کے اور موقعے انہیں میسر نہ تھے۔

صوفیائے کرام کی پورانی سوانح عمریوں سے پتا چلتا ہے کہ گذشتہ زمانوں میں ان کے اداروں کو کتنی اہمیت حاصل تھی۔ اس لحاظ سے ان سوانح عمریوں کا مطالعہ بہت سودمند ہے۔

آپ کی مرضی لیکن ......

تبصرہ، تنقید یا اعتراض کا مادہ ابتدائے تاریخ سے ہر رہنما، عالم، ادیب، شاعر اور مصنّف کے حصّہ میں آیا ہے رائج الوقت مذہب یا فلسفہ یا سیاسی اور معاشرتی رسم و رواج سے ہر نئے پیغام، ہر نئے خیال یا ہر نئی تحریک کی ٹکر رہی ہے بعض اوقات یہ نیا پیغام یا خیال تجدیدی شکل میں ہوتا ہے کبھی ترمیمی شکل اختیار کر لیتا ہے اور کبھی کبھی اس کا مقصد ایک بالکل انقلابی تبدیلی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ مذکورہ تینوں صورتوں میں سے جو صورت اختیار کرے عوام کے عقاید، معنویات اور ملی جذبات کے ساتھ اس نئے پیغام یا اس نئی تحریک کا تصادم ہوتا رہتا ہے اور اس تصادم کے لئے آسانی سے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا۔

سب سے زیادہ مخالفت انقلابی اصلاحات سے ہوتی ہے خصوصاً جب کہ یہ اصلاحات مذہب کے بنیادی اصولوں سے تعلق رکھتی ہوں۔ مثلاً ہمارے آقائے نامدار حضرت رسولِ اکرمؐ مشرکوں کو جن کے تین سو ساٹھ معبود تھے توحید کا پیغام پہنچاتے تھے اور ذات باری تعالے کے

ملٹن، ہیکن یا برنارڈ شا ہو جائیں گے۔ جناب! ان بلند پایہ ادیبوں نے برسوں مشق کی تب کہیں یہ مرتبہ پایا۔

بعض حضرات اور نہیں تو رسم الخط ہی کا عذر پیش کرتے ہیں۔ اس کا تو آسان حل ہمارے پاس موجود ہے۔ جو رسم الخط پسند خاطر ہو اسی میں لکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ لکھنا بھی بڑے حوصلہ کا کام ہے۔ کیونکہ لکھنے والا ہزاروں لوگوں کی تنقید اور نوک جھونک کا نشانہ بن جاتا ہے۔ جس کا جو جی چاہے کہہ گزرتا ہے۔ بیچارہ لکھنے والا کس کس کو روکے کس کس کا جواب دے۔ مگر دنیا میں کونسا کام ہے جو آسان ہو۔ کوشش ہر کام کو آسان بنا دیتی ہے۔ پہلا لکھا ہوا مضمون پسند نہ آئے تو یہ بھروسہ ہونا چاہیئے کہ دوسرا اس سے اچھا ہوگا۔ اور تیسرا دوسرے سے بھی عمدہ۔ اسی طرح درجۂ کمال میسر ہو سکتا ہے۔ انسان رفتہ رفتہ اپنی کمزوریاں دیکھتا اور ان کا تدارک کرتا رہتا ہے۔

ننھا بچہ پہلے پہل کھڑا بھی نہیں ہو سکتا لیکن وہ وقت بھی آجاتا ہے کہ وہ ہرن کی طرح چوکڑی بھرنے لگتا ہے۔ ہر فن اور ہر ہنر کے ابتدائی مرحلے ایسے ہی طے ہوتے ہیں۔ کمال کیلئے بڑی کوشش اور عمل درکار ہے۔ اور کیا عرض کروں۔ مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ ڈالا۔ اب آپ کی مرضی۔

دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ہر کام کے متعلق یہ کہہ اٹھتے ہیں:۔ یہ ہے ہی کیا! ہم ہوتے تو کہیں بہتر کر دکھاتے!! یہ کرتے وہ کرتے!!! انہیں یہ بھرم ہے کہ ہر کام بس انکی توجہ ہی کا محتاج ہے۔ اِدھر انہوں نے کام سنبھالا اور اُدھر پورا کر دکھایا۔ کوئی چیز ان کے سامنے آئے اسے دیکھ کر ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں:۔ "ارے! یہ کیا ہے!! یہ ہے ہی کیا!!!" وغیر ذالک۔ یہ تو وہ مرض ہے جس کی دوا ہی نہیں۔ البتہ دعا کی جا سکتی ہے۔

بعض اصحاب ایسے بھی دیکھنے میں آئے ہیں کہ اہلیت تو ذرہ بھر نہیں رکھتے لیکن اپنے آپ کو کرتا دھرتا سمجھتے ہیں ان لوگوں کا خیال ہے کہ ہر شخص (کوئی بھی ہو اور کہیں ہو) کا فرض ہے کہ انہی کی خدمت کرتا رہے۔ اس قسم کے لوگ اپنے آپ کو اوروں سے تو ہر قسم کی رعایات کا حقدار سمجھتے ہیں لیکن یہ نہیں مانتے کہ اور کسی کو بھی ان پر حق حاصل ہے۔ ان کا دائرہ "میں" اور "میرا" تک محدود رہتا ہے۔ ان اشخاص کی خدمت میں بھی ہماری یہ عرض ہے کہ ہم نے انکی خدمتگذاری میں بھی کوئی کوتاہی نہیں کی۔ کیونکہ ؎ نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں

قارئین کرام کی عنایات کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ اپنی قوم کے ارتقاء کے اس نیک کام میں ہاتھ بٹائیں اور اس کام کو دشوار نہ سمجھیں۔ وہ لوگ جن میں قوم پشتون اور پشتو ادب کی خدمت کرنے کا جذبہ موجود ہے اور اپنے خیالات اور حسیات سے اپنی قوم کو آگاہ کرنا چاہیں انہیں "نن پرون" کو اپنا ترجمان سمجھنا چاہیئے اپنے خیالات اور عقاید پر شوق سے جمے رہیں لیکن "نن پرون" کو ایک مشترک چیز سمجھتے ہوئے قوم کو زندہ کرنیکی مہم میں ہمارا ساتھ دیں:-

"آپ کی مرضی۔ لیکن ......"

(مولانا) عبد القادر

رفتار زمانہ

روس: ــــــ

سٹالن گراڈ کے محاذ پر گھمسان کی لڑائی ہو رہی ہے ۔ مارشل ٹموشینکو کی امدادی سپاہ دریائے ڈان کو عبور کر کے سٹالن گراڈ کی طرف بڑھ رہی ہے جرمن بھی اپنی تازہ دم ریزرو فوج کو میدان جنگ میں جھونک رہے ہیں لیکن بہادر روسیوں کے ہاتھوں بڑھتے ہوئے مالی اور جانی نقصان اٹھا رہے ہیں ۔

امریکن سفیر مقیم ماسکو بذریعہ ہوائی جہاز امریکہ کی طرف روانہ ہو گیا ہے ۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سفر کا نتیجہ یہ ہوگا کہ امریکن امداد خاطر خواہ مقدار اور ترتیب سے روس آنے لگے گی ۔

مسٹر وینڈل ویلکی واپس واشنگٹن پہنچ گئے ہیں ۔ اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ انہوں نے پریزیڈنٹ روزویلٹ سے یہ اپیل کی ہے کہ جلد سے جلد یورپ میں ایک دوسرا محاذ قایم کیا جاے ۔

بحرالکاہل: ــــــ

ہر قسم کی امریکن قوائے جزائر سلیمان میں بڑھ رہی ہیں ۔ کوہ آڈوون شٹلینے کے سارے رقبہ پر قابض ہو کر کوکوڈا کی طرف متواتر پیشقدمی کر رہی ہیں ۔

امریکن فضائی بیڑا نے دشمن کے خطوط رسد رسانی پر اتنی شدت سے بمباری کی کہ جاپانیوں کو پسپا ہونا پڑا ۔

۱۱ر اور ۱۲ر اکتوبر کو بڑا بھاری فضائی اور بحری معرکہ ہوا ۔ اس معرکہ میں جاپانیوں کا ایک بھاری کروزر ، چار تباہ کن اور ایک بار بردار جہاز غرق ہوے ۔ ایک اور جاپانی کروزر گھائل ہو کر غالباً ڈوب گیا ۔ ایک اور تباہ کن جہاز بھی غالباً ڈوب گیا ۔ امریکہ کا ایک تباہ کن جہاز ڈوب گیا اور کئی جنگی جہاز گھائل ہوے ۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اس امریکن یلغار کی روک تھام کے لئے جاپانیوں نے اور فوجیں جزیرہ گوادل کنار پر اتار دی ہیں ۔

جزائر الیوشن میں دشمن کے ٹھکانوں پر امریکن طیارے بمباری کرتے رہے ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاپانی جزائر آتو اور اگاتو سے لد گئے ۔

ترکی: ــــــ

برطانیہ اور ترکی میں ایک تجارتی معاہدہ ہوا تھا جس کی رو سے ترکی پابند تھا کہ جنوری ۱۹۴۲ء تک اپنے کروم کی ساری پیداوار برطانیہ کو دیدے

جرمن نمایندہ ڈاکٹر کاوڈلیس کی ریشہ دوانیوں کے باوجود اس معاھدہ کی ایک سال کے لئے اور توسیع ہوگئی تھی یہ میعاد جنوری ۱۹۴۳ء کو ختم ہونے کو ہے۔

اس معاہدہ کی تجدید کے لئے برطانوی سفیر اور ترکی وزیر اعظم کے درمیان گفتگو شروع ہوگئی ہے۔ اور خاطر خواہ طریقہ سے ہورہی ہے۔

کروم ایک دہات ہے جس سے زیادہ تر وہ دھاتی اور تجارتی مرکبات بنائے جاتے ہیں جو فولاد سازی میں بہت استعمال ہوتے ہیں دنیا میں کروم سب سے زیادہ روس۔ ترکی اور جنوبی افریقہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اور نکاس کے لحاظ سے ترکی تیسرے درجہ پر ہے۔

عراق: ————

داخلی اقتصادی مسایل کے بارے میں اختلاف ہونے پر عراقی وزارت مستعفی ہوگئی۔ جرنیل نوری السعید وزیر اعظم نے نئی وزارت بنالی ہے۔ آپ پانچویں دفعہ وزیر اعظم مقرر ہوئے ہیں

ہندوستان: ————

صوبہ سندھ کے وزیر اعظم پر ہزایکسی لینسی پر گورنر کو اعتماد نہ رہا۔ اس لئے وہ برطرف کردیا گیا سر غلام حسین ہدایت اللہ نئی وزارت بنا رہے ہیں۔

افغانستان: ————

مطبع ہرات میں بجلی کا انجن لگا دیا گیا ہے۔ دو مطبعے اب بجلی سے چلا کریں گے۔

غزنی میں یکایک ایسی سردی پڑنے لگی ہے کہ رات کیوقت پانی جم جاتا ہے۔

جو اہلکار پشتو کے امتحانات میں شریک نہیں ہوتے انہیں حکومت افغانستان سزائیں دے رہی ہے۔

صوبہ ہرات کے سابق نائب الحکومت آغا محمد قاسم خان نے چودہ ہزار افغانی روپیہ کا عطیہ دیا ہے۔ یہ رقم پشتو زبان کی توسیع اور مجلہ ادبی ھرات کی ترقی پر صرف کی جائے گی

گردشیں فتنۂ دنیا کی ہزارو دیکھا سرعتیں چار و دیکھا
دنیا میں کسی کا نہ کسی کا غم
کچھ نہیں رشتہ
سرِ بخت ہمارے ہی نہیں گردشیں ہیں فلک کا بھی ہزارو دیکھا
(زینب)

پشتو رسم الخط

(ذبیح)

میں نے ۲۵ر جون ۱۹۴۲ء کے "نن پرون" میں پشتو رسم الخط کے متعلق مولینا عبدالقادر صاحب کا مضمون پڑھا اور بار بار اور خوب غور سے پڑھا کیونکہ ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے میں نے بھی اس چیز کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ پشتو رسم الخط کا فیصلہ ہمیشہ کیلئے ہو جائے۔ لیکن یہ کام مولانا صاحب کا میرا یا کسی اور کا یا چند شاعروں اور ادیبوں کا نہیں بلکہ یہ تمام ملتِ افاغنہ کا ایک مشترکہ معاملہ ہے اور جبتک تمام پشتون قوم کے نمایندے اس طرف توجہ نہ کریں اس وقت تک اس اہم مسئلہ کا حل کرنا مشکل ہے اور یہ کام ہمیشہ اسی طرح ادھورا ہی رہے گا۔

ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ اس کی زبان آسان اور عام فہم ہو تاکہ نہ صرف اس قوم کے اپنے افراد ہی اس میں آسانی سے خط و کتابت کرسکیں بلکہ اور لوگ بھی تھوڑی بہت محنت اور تکلیف سے قلیل عرصہ میں اُسے سیکھ سکیں۔ یہ خواہش انسانوں کی فطری چیز اور معقول و جائز ہے۔ میرے خیال میں شاذ و نادر ہی کوئی ایسا ہوگا جو یہ نہ چاہے کہ اس کی زبان آسان اور سلیس ہو۔ جہاں تک زبان کو آسان اور عام فہم بنانے کا تعلق ہے مجھے مولانا صاحب سے پورا پورا اتفاق ہے۔ لیکن یہاں ایک اور اہم اور پیچیدہ سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ پشتو کو آسان بنانے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے؟ بعض لوگ ایسے بھی ہونگے جو مولانا صاحب کے مجوزہ طریقہ کو بجائے آسان سمجھنے کے اور بھی مشکل بتائیں گے مختلف نظریے رکھنے والے گروہوں میں سے ہر ایک اپنے طریقہ کو آسان اور دوسرے کے طریقہ کو مشکل کہیگا اور ہر ایک کے پاس کافی ثبوت اور دلائل ہونگے۔ ایسی حالت میں ہمیں چاہیئے کہ مختلف نظریے رکھنے والی تمام پارٹیوں کے دلایل پر غور کریں اور پھر ایک غیر جانبدار اور بے غرض منصف کی حیثیت سے کوئی فیصلہ کریں کیونکہ یہ نہ صرف ایک پرانی زبان کا جو کہ ایک قدیم تہذیب کی حامل ہے بلکہ ایک بہت بڑی زندہ قوم کی ترقی اور تنزل کا معاملہ ہے کیونکہ زبان کا عروج و زوال اس قوم کے ساتھ وابستہ ہے۔

صوبۂ سرحد میں جس وقت کانگرسی وزارت بنی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ پشتو زبان کو سکولوں میں رائج کیا جائے اور اس مطلب کو پورا کرنے کے لئے کتابیں لکھی جائیں۔ چنانچہ ایک چھوٹی سی کمیٹی بنائی گئی جس میں قاضی عطاء اللہ صاحب وزیر تعلیم خان عبدالغفار خان، خان عبدالاکبر خان، میاں جعفر شاہ میاں سید رسول اور میں شامل تھے۔ میں نے اس کمیٹی کے پہلے ہی جلسہ میں یہ بات واضح کردی تھی کہ ہماری موجودہ کمیٹی تمام قوم افغان کی نمایندگی نہیں کرسکتی۔ میں نے اس کمیٹی میں شامل کرنے کے لئے چند اور اصحاب کے نام بھی تجویز کئے جنہوں نے پشتو کی بہت گرانقدر خدمت کی تھی لیکن میری تجویز اس وجہ سے مسترد ہوئی کہ جن حضرات کے نام میں نے پیش کئے تھے وہ بہت

عمر رسیدہ تھے اور انکے متعلق یہ خوف ظاہر کیا گیا کہ وہ لوگ قدامت پسند ہونگے اور پشتو میں انقلاب انگیز اصلاح شاید پسند نہ کریں۔ عذر معقول تھا اور مجھے اس سے بہت خوشی ہوئی کیونکہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ ہماری مادری زبان میں بہت زیادہ تبدیلی اور اصلاح ہو، خاص کر رسم الخط کے بارہ میں۔

میں نے اس کمیٹی کے پہلے جلسہ میں یہ تجویز بھی پیش کی کہ پشتو کا موجودہ رسم الخط ناقص ہے اور اس میں تبدیلی یعنی اردو (فارسی) رسم الخط کا اختیار کرنا ضروری ہے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کمیٹی کے تمام ان ممبران نے جو زبان کی اصلاح کے بڑے بڑے دعوے کیا کرتے تھے اس تجویز کو ناممکن العمل سمجھا اور طرح طرح کے اعتراض کئے چنانچہ علاوہ اور بہت سے اعتراضات کے ایک بڑا اعتراض یہ کیا گیا جیسے کہ مولانا صاحب نے بھی لکھا ہے کہ ہماری مستورات اور معمولی تعلیم یافتہ لوگ چونکہ موجودہ رسم الخط سے بہت مانوس ہیں اسلئے نئے رسم الخط میں پڑھنا لکھنا انکو اور بھی مشکل ہو جائیگا

میرا یہ جواب ہے کہ پہلے تو پشتو اور اردو رسم الخط میں اتنا زیادہ فرق نہیں ہے کہ ایسے لوگوں کو خاص تکلیف کا سامنا کرنا پڑے بلکہ مولانا صاحب کے کہنے کے مطابق آہستہ آہستہ اسی تبدیل شدہ رسم الخط سے مانوس ہو جائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہمیں موجودہ نسل کے مقابلہ میں جو تقریباً اپنے دن پورے کر چکی ہے ان ہزاروں آنے والی نسلوں کا خیال ہونا چاہیئے جو اس زبان کی وارث ہونگی۔ ماضی کی بجائے مستقبل کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ چنانچہ اسی بنا پر میں نے کمیٹی کے ممبران سے اپیل کی کہ اگر آپ لوگوں نے اس وقت یہ اصلاحی بنیاد رکھی تو تمام قوم افغان آپ کی احسان مند رہیگی اور اسطرح سے آپ اپنی ملی زبان کو بہت زیادہ فایدہ پہنچا سکینگے۔ میں نے ان حضرات پر یہ بھی ثابت کر دیا کہ پشتو میں اگر خط لکھا جائے تو اس پر کاغذ سیاہی وقت اور محنت بمقابلہ اردو رسم الخط میں لکھنے کے زیادہ خرچ ہوتے ہیں

قاضی صاحب (وزیر تعلیم) نے اسکے جواب میں فرمایا کہ زبان کا معاملہ صرف ہمارا ہی نہیں ہے بلکہ اسکے ساتھ افغانستان کا بھی تعلق ہے اور جبتک سرحد، علاقہ غیر، افغانستان اور بلوچستان کی تمام اقوام افاغنہ کا ایک مشترکہ جرگہ جلال آباد یا پشاور میں بیٹھکر کوئی فیصلہ نہ کرے رسم الخط کا قطعی اور آخری فیصلہ ہونا مشکل ہے۔ خیر، بہت لے دے کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ مستورات اور کم تعلیم یافتہ لوگوں کی خاطر جو موجودہ رسم الخط سے زیادہ مانوس ہیں اور قرآن پاک کو آسانی سے پڑھ لینے کے لئے کتابیں اسی پرانے رسم الخط میں لکھی جائیں لیکن خط و کتابت اور دیگر کاروباری تحریر اردو رسم الخط میں کی جائے۔ اس تجویز کی تائید میں انگریزی کی مثال دی گئی کہ کتابیں اور طرح سے لکھی جاتی ہیں اور عام لکھنے کی انگریزی اور طرز کی ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی دن سے پشتو کا رسم الخط اردو رسم الخط میں تبدیل ہوا اور میں نے اور بہت سے دیگر اصحاب نے یہی (اردو) رسم الخط اختیار کیا۔ اگرچہ میری ذاتی رائے تو یہ ہے کہ کتابیں بھی نئی طرز تحریر (اردو رسم الخط) میں لکھی جائیں۔

یہاں تک تو ہمارا اور مولانا صاحب کا نظریہ ایک ہے کہ پشتو اردو رسم الخط میں لکھنی چاہیئے اور ایسا ہو بھی گیا۔ لیکن آگے چل کر ہمارے (میرے اور میرے ہمخیال لوگوں کے) اور مولانا صاحب کے نظریوں میں اختلاف پیدا ہوتا ہے۔ کیونکہ "اردو رسم الخط" کے مولانا صاحب کچھ اور معنی لیتے ہیں اور ہمارا مطلب کچھ اور ہے

مثلاً ہم یہ جملہ کہ "لښکر د بګل نعره په غوږو واوریدله"۔ (لشکر نے بگل کی آواز اپنے کانوں سنی) ہم اردو رسم الخط میں

یوں لکھیں گے "دُ لښکر دَ ښکل نعره په ښپلو غوږو واوریدلہ"۔ لیکن مولانا صاحب اور انکے ہمخیال لوگ اسی جملے کو یوں لکھیں گے۔ "لخکر دَ ښکل نعره په خپلو غوگو واوریدلہ"۔ چنانچہ یہیں سے ہمارا اور مولانا صاحب کا اختلاف شروع ہوتا ہے۔ ہم پشتو کے حروف تہجی سے بعض مخصوص حروف مثلاً ټ - څ - ځ - ډ - ړ - ږ - ښ، تک نہیں مٹانا چاہتے اور مولانا صاحب چاہتے ہیں کہ انہیں ترک کردیا جائے۔ اس بارہ میں مجھے اپنے ساتھیوں سے بھی اختلاف ہے اور میں کہتا ہوں کہ ټ ، ډ ، ړ ، اور ګ بالکل ٹ ، ڈ ، ڑ اور گ کی طرح لکھنے چاہئیں کیونکہ تمام افغان قبائل ان حروف کا تلفظ ٹے - ڈال ، ڑے اور کاف کی طرح ادا کرتے ہیں۔ اس طرح میرے اور مولانا صاحب کے درمیان اختلاف کچھ کم رہ جاتا ہے یعنی میں پشتو حروف تہجی میں ځ ، څ ، ږ اور ښ یہ چار مخصوص حروف بدستور قائم رکھنے کا حامی ہوں اور نہ صرف ان کی موجودگی کو ضروری سمجھتا ہوں بلکہ میرے خیال میں بغیر ان کے پشتو زبان ادھوری معلوم ہوگی۔ اس بارہ میں میرے دلائل یہ ہیں:۔

ملت افاغنہ کے بعض قبائل میں تلفظ ایکدوسرے سے جدا اور مختلف ہے۔ خوست اور جلال آباد۔ جلال آباد اور قندھار علاقہ تیہند اور ننگرہار ، یوسف زئی اور خٹک بنگش اور مروت آفریدی اور وزیر مسعود غرضیکہ مختلف طبقوں کے تلفظ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ پشتو کے علاوہ اور کسی زبان میں تلفظ کے اتنے اختلافات نہیں ہیں اور یہ اختلاف تلفظ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر رہنے والوں میں نمایاں نظر آتا ہے

جب ہم قوم افغان کی قلیل تعداد اور اس پر تلفظ کی اس کثرت اختلاف کو دیکھتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے لیکن حیرت کے ساتھ ساتھ ان اختلافات کی اہمیت بھی زیادہ ہوتی ہے اور ہم یہ خیال کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ پشتو دنیا کی زبانوں میں ایک امتیازی خصوصیت رکھتی ہے اور اسی امتیاز نے ہی اسے دنیا کے بڑے بڑے انقلابات میں بھی اب تک زندہ رکھا ہے۔ میں اتنا قدامت پسند نہیں کہ اس قدیمی امتیاز کو چاہے اچھا ہو یا برا ، قائم رکھنا چاہوں۔ لیکن پھر بھی اس میں ایک زبردست دلیل اور مسلّم حقیقت پوشیدہ ہے جو مجھے گھور گھور کر دیکھتی ہے اور میں اس سے چشم پوشی نہیں کرسکتا۔ وہ حقیقت کیا ہے ؟ یہی کہ پشتو کے اکثر الفاظ فارسی سے لئے گئے ہیں جنہیں بعض قبائل بالکل اسی طرح ادا کرتے ہیں جیسے کہ فارسی میں ہیں بعض ان کی شکل میں تھوڑی سی تبدیلی کرلیتے ہیں اور بعض بالکل ہی مسخ کرکے استعمال کرتے ہیں مثلاً لفظ "لشکر" پشتو زبان میں "لښکر" اسلئے لکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ اسے "لخکر" اور بعض "لشکر" کہتے ہیں۔ اسی چیز کو مد نظر رکھکر واضع اوّل نے بڑی عقلمندی سے یہیں ایک ایسا حرف یعنی "ښ" بنا کردیا جو "خ" کی بھی آواز دیتا ہے اور "ش" کی بھی میرے خیال میں یہ بات زبان کی فصاحت میں شامل ہے کہ ایک ہی حرف دو مختلف قسم کی آوازیں دے اور یہ خصوصیت دوسری زبان میں نہیں ہے۔ لفظ "ځوان" ہم اسلئے "ځ" سے لکھتے ہیں کہ یہ "جوان" سے بنا ہے بعض اسے "جوان" اور بعض "زوان" کہتے ہیں اسکا ایک بڑا فائدہ نوآموز کیلئے یہ ہے کہ اگر اسے تھوڑی بہت اردو یا فارسی آتی ہو اور لفظ کا مخرج معلوم ہو تو وہ پشتو لکھتے وقت ہجے کی غلطی نہیں کریگا مثلاً جسے ؎

؎ یہ معلوم ہو کہ لفظ "ځان"، "جان" سے بنا ہے تو وہ کبھی اسے "زان"، "ذان"، "ضان" یا "ظان" نہیں لکھیگا۔ (باقی پھر) ـــ: فضل حق شیدا

قدیم اور جدید اخلاق

(۵)

گذشتہ سے پیوستہ

اس لئے کہ اس میں پیدائشی اور نسلی اہلیت اور صلاحیت موجود ہے ۔ اسی طرح جرمن نسل کا ایک فرد اچھی تربیت سے فوق البشر بن سکتا ہے ۔ لیکن کسی دوسری نسل کے افراد میں ایسی اہلیت اور صلاحیت نہیں ہے ۔ وہ چاہے کچھ کریں اور کیسی ہی اچھی اُن کی پرورش اور تربیت کیوں نہ ہو وہ ہرگز فوق البشر نہیں بن سکتے ۔ اسلیئے کہ وہ پیدائشی ناقص ، بے اصل یا کم اصل ہیں ۔ خچر ہر حالت میں خچر ہی رہیگا اور خچر ہی اس سے پیدا ہوگا ۔ جرمن فلاسفر تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ارتقاء کے نقطۂ نظر سے بندر اور غیر مہذب یا وحشی انسان میں اتنا فرق نہیں جتنا کہ ایک حبشی اور ایک مہذب انسان میں ہے ۔ وہ جرمنوں ہی کو حقیقی معنوں میں مہذب سمجھتے ہیں ۔ کیونکہ ان میں نسلی خوبیاں موجود ہیں ۔

سب جانتے ہیں کہ مذہب کے نقطۂ نگاہ سے نسلی امتیاز کا یہ نیا اخلاقی فلسفہ ایک گمراہ کن خیال ہے مذہب ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ نسل کے لحاظ سے تمام بنی نوع بشر یکساں ہیں ۔

بنی آدم اعضاے یکدیگر اند
کہ در آفرینش زیک جوہر اند

انسانیت اور شرافت کا معیار کیا ہے ؟ نیک اعمال نہ کہ اصل و نسل ۔ نیک اعمال سے ہر اصل اور نسل کا آدمی کامل انسان بن سکتا ہے ۔ بُرے اعمال سے ہر اصل اور نسل کا آدمی گمراہ اور تباہ ہو سکتا ہے ۔

نیک اعمال وہ اعمال ہیں جنہیں مذہب نیک قرار دے لیکن یہ اعلیٰ خیال اور مذہب کی یہ عالمگیر اخوت محبت اور ہمدردی اور ان کا گذشتہ باہمی تعلق موجودہ جرمنی ۔ جاپان اور اٹلی کے نزدیک اعتقاداً اور عملاً کوئی قابل قبول چیز نہیں ہے ان کے سیاسی نظریے اور اخلاقی فلسفہ جن کی بنیاد نسل پر رکھی گئی ہے باقی دنیا کے لئے پیغام موت سے کم نہیں ۔

محوری طاقتیں دیگر ممالک کو محض سیاسی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے فتح کرنا نہیں چاہتیں وہ ایسی ہمہ گیر فتح کی آرزومند ہیں جس کے ذریعہ سے وہ انسانی دل و دماغ سے پُرانے مذہبی فلسفۂ حیات اور اخلاق کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں ۔ ان کے نئے سیاسی نظام کا دارومدار ان کے اس نئے فلسفہ اور نسلی اخلاق پر ہے ۔ جب تک ان کا نیا اخلاق پرانے اخلاق پر غالب نہ آجاے ان کے سیاسی نظام کو دوام حاصل نہیں ہو سکتا ۔ اسی خیال سے وہ جہاں سیاسی یا اقتصادی فتوحات پاتے ہیں ۔ وہاں دنیا کے پرانے اخلاق کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اس کوشش میں ہیں کہ اسی نئے اخلاق کے بل بوتہ پر ان کا نیا سیاسی نظام جائز قرار پاے اور قایم رہے

تبھی تو وہ کہتے ہیں کہ موجودہ لڑائی گذشتہ لڑائیوں سے بالکل علیحدہ طرز پر لڑی جا رہی ہے۔

پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جرمنی کے نئے نظام کا آسرا نٹشے کے اخلاقی فلسفہ پر ہے۔ جبتک ہم اس فلسفہ کی بنیادی غلطیاں معلوم کر کے مذہبی فلسفہ کی برتری اور بزرگی ثابت نہ کریں اس نئے نظام کے بنیادی اصولوں پر اخلاقی حملہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نٹشے کی نیت نیک تھی۔ وہ انسانی نسل کی مجموعی برتری بزرگی اور وقار کا خواہاں تھا لیکن حصول مقصد کے لئے طریق کار اختیار کرنے میں اس کے فلسفیانہ دماغ نے ٹھوکر کھائی۔ اس نے واردات قلب کا صحیح اندازہ نہیں لگایا۔ ذراسی غلطی اسے کہاں سے کہاں لے گئی ؎

یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ورنہ وہ تو اسلامی فلسفۂ حیات کے قریب آ چکا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر اقبالؒ اس کے بارہ میں فرماتے ہیں:۔

قلب او مومن دماغش کافر است

اس مشہور و معروف جرمن مجذوب کو ناقص دماغی استدلال نے گمراہ کردیا۔ صحیح راستہ سے بھٹک گیا اور فلسفہ کی الجھنوں میں حیران و سرگردان رہ گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ عشق حقیقی کی آب و تاب اور سوز و ساز ہی مشعل ہدایت ہوا کرتی ہے۔ اور اسی کو فضل کبریائی کہتے ہیں۔ بقول پشتو شاعر حافظ الپوری (ترجمہ شعر)

"اگر کوئی صرف علم سے اور بغیر فضل باریتعالی کے راہ حق پا سکتا تو لوگ بو علی سینا کو گمراہ کیوں کہتے۔"

مذہب کے نقطۂ نگاہ سے کامل انسان میں عقل اور محبت کی ایک مکمل آمیزش ہوتی ہے اسی وجہ سے مذہب کی قوت میں بہیمیت کا عنصر نہیں ہے۔ مذہبی طاقت میں روحانیت، انسانیت اور رحمت پوشیدہ ہے۔ نٹشے جس طاقت کو مانتا ہے اس میں حیوانیت ہے کیونکہ وہ تو اسی انسان کو فوق البشر سمجھتا ہے جس کے وجود میں حب کا مادہ نہ ہو نٹشے کے فلسفۂ اخلاق کا بنیادی نقص یہی ہے کہ وہ فوق البشر کی تخلیق میں حُب کو کوئی وقعت نہیں دیتا یہی وجہ ہے کہ اسکے کامل انسان یا فوق البشر کا تصور شرمندۂ تکمیل نہیں ہو سکا ہے۔

انسان میں حُب کا مادہ فطری ہے۔ یہ مادہ انسانی فطرت سے خارج ہو سکتا ہے۔ نٹشے چاہتا ہے کہ اسکے فوق البشر میں یہ مادہ ہی نہ ہو۔ اس وجہ سے اس کا فوق البشر نامکمل اور غیر فطری ہے اس کا فلسفۂ اخلاق فطرت انسانی کے منافی ہے یعنی اس کا مسلک فطری نہیں اور انسان کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ (باقی پھر)

پہنچا قبرستان میں اک بادشاہ
دیکھا اک درویش اس جا بیٹھا تھا
پوچھا آبادی میں کیوں آتے نہیں
بولا سب آبادی آتی ہے یہیں ؎

مڈغاسکر

(پُر اسرار جزیرہ)

کچھ عرصہ سے مڈغاسکر کا نام سیاسیات کی تیز روشنی میں آگیا ہے اور گذشتہ چند دنوں میں تقریباً ہر ایک نے مڈغاسکر کا ذکر پڑھا یا سُنا ہوگا۔ کیونکہ جس وقت سے جاپان جنگ میں کودا ہے اور اپنے مکارانہ حملوں اور فریبی چالوں سے مشرق بعید میں جن نے فتوحات حاصل کی ہیں اس کی وجہ سے اتحادیوں کو یہ خطرہ لاحق ہوا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں ہند چینی کی طرح جاپانی مڈغاسکر پر بھی قبضہ کر بیٹھیں چنانچہ حفظ ماتقدم کی خاطر اتحادیوں نے اس فرانسیسی مقبوضہ پر حملہ کیا اور تھوڑے ہی دن ہوے کہ اس پر مکمل طور سے قابض بھی ہو گئے

اتحادیوں کا یہ اقدام موجودہ جنگی شطرنج کی ایک زبردست چال سمجھی جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ محل وقوع اور دیگر جغرافیائی حالات کی بنا پر مڈغاسکر کو بے انتہا اہمیت حاصل ہے اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسے کہ اہم ترین سمندری شاہراہوں کے چوک میں ایک دیوہیکل سنتری کھڑا ہر طرف سے آمد و رفت کو قابو میں رکھتا ہو۔ مڈغاسکر کی بندرگاہوں اور ہوائی اڈوں سے بحر ہند، بحیرۂ قلزم، بحیرۂ عرب اور دور و نزدیک کے اور سمندری خطوں میں نہ صرف کامیاب سمندری حملے ہو سکتے ہیں۔ بلکہ نہایت آسانی سے جنوبی اور مشرقی افریقہ، عربستان اور بحر ہند کے دیگر جزیروں پر ہوائی حملے بھی کئے جا سکتے ہیں۔ انہی باتوں کو مدنظر رکھکر محوری طاقتیں اس جزیرہ پر اپنا قبضہ جمانے کے منصوبے باندھ رہے تھے لیکن اتحادیوں نے سبقت کی اور محوریوں کا جنگی نقشہ درہم برہم کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ موجودہ عالمگیر لڑائی کی وجہ سے آج مڈغاسکر کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی ہے جتنی کہ پچھلے زمانہ کے مشہور سیاحان مارکوپولو اور واسکوڈے گاما وغیرہ کے وقتوں میں بھی اسے نصیب نہ ہوئی تھی پھر بھی جیسا کہ ہزاروں سال سے اس جزیرہ کے تاریخی حالات تاریکی میں تھے اسی طرح آج بھی بہت کم لوگ اس عجیب و غریب جزیرہ کے اندرونی حالات اور قدیم تاریخ سے بے خبر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اسے اکثر پُر اسرار جزیرہ کہا جاتا ہے۔ ابھی تک اس پُر اسرار جزیرے کے تاریخی، جغرافیائی اور دیگر تھوڑے بہت جو حالات معلوم ہو سکے ہیں وہ بہت دلچسپ ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے قارئین کرام بھی ان عجیب و غریب حالات کو پڑھ کر محظوظ ہوں۔

جزیرہ مڈغاسکر بحر ہند کے جنوب مغربی گوشے میں جنوبی افریقہ سے تقریباً ڈھائی سو میل مشرق کی طرف واقع ہوا ہے اور جنوبی افریقہ کے مشرقی ساحل اور اس جزیرہ کے درمیان رود بار موزنبیق حائل ہے۔ یہ جزیرہ دنیا میں چوتھا بڑا جزیرہ ہے یعنی سب سے بڑا گرین لینڈ، دوسرا نیوگنی،

تیسرا بورینو اور چوتھا مڈغاسکر۔ اس جزیرہ کی لمبائی کچھ کم ایک ہزار میل، چوڑائی ساڑھے تین سو میل اور کل رقبہ دو لاکھ اٹھائیس ہزار پانسو مربع میل ہے۔ یعنی فرانس سے جس کا یہ مقبوضہ ہے ساڑھے سات فیصدی اس کا رقبہ زیادہ ہے۔

مڈغاسکر اگرچہ براعظم ایشیا کی نسبت افریقہ سے زیادہ قریب واقع ہوا ہے لیکن نہ تو اس کی آب وہوا افریقہ کی طرح ہے نہ یہاں کے لوگ افریقہ والوں سے کچھ مشابہت رکھتے ہیں اور نہ ہی تہذیب و تمدّن اور نباتات و حیوانات افریقہ سے ملتے جلتے ہیں۔ برعکس اس کے یہاں کی آب وہوا، پیداوار، لوگوں کی شکل وشباہت، وضع قطع اور طرزِ معاشرت کی بہت سی باتیں ایشیائی ممالک سے تعلق اور مناسبت رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مؤرخین اور سائینسدانوں کا یہ خیال ہے کہ مڈغاسکر ایشیا کا ہی ایک حصّہ ہے اور بعض یہ کہتے ہیں کہ زمانۂ قدیم میں بحرِ ہند کے اس حصّہ میں ایک اور براعظم تھا جس کا ایک سرا آسٹریلیا سے جا ملتا تھا اور دوسرا چھوٹے چھوٹے جزیروں کی وساطت سے ہندوستان کے ساتھ ملحق تھا لیکن بعد میں یہ براعظم نظامِ قدرت کے تغیر و تبدل کے ماتحت پانی کے نیچے آگیا اور صرف یہی حصہ باقی رہ گیا جو مڈغاسکر کے جزیرہ سے مشہور ہوا۔ خیر، کچھ بھی ہو اس جزیرہ کے قدیمی حالات ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں۔

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے اس جزیرہ کو چند عرب سوداگروں نے معلوم کیا تھا۔ یہ واقعہ تیرھویں صدی عیسوی کا ہے جب دنیا کا مشہور سیاح اور نئے ممالک کا دریافت کرنے والا مارکوپولو خلیج بنگال سے روانہ ہوا تھا اور دریائے سندھ کے دہانہ تک پہنچنے کے لئے راس کماری کے گرد چکر کاٹتا ہوا ادھر کو جا رہا تھا۔ مارکوپولو کا جہاز ابھی لنکا یعنی سیلون کے قریب ہی تھا کہ مخالف ہوا چلنے لگی اور ایسا طوفان آیا کہ جہازیوں سے کچھ بن نہ پڑا اور جہاز کو جنوب کی طرف لے گیا۔ مارکوپولو کے جہاز پر جو ہندوستانی ملّاح تھے وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ موسمی ہواؤں کا یہ طوفان تین چار مہینے سے پہلے پہلے تھمنے کا نہیں اس لئے انہوں نے جہاز کو ہوا کی مرضی پر چھوڑ دیا۔ کئی دن تک متواتر یہ لوگ بے بس و لاچار ہو کر چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہے کہ شاید کہیں خشکی نظر آئے۔ آخر ایکدن انہوں نے دیکھا کہ دُور سے ایک اور جہاز جس کے مستول ٹوٹے اور بادبان پھٹے ہوئے تھے سمندر کی بے پناہ موجوں میں جدوجہد کر رہا ہے۔ شاید اس جہاز کے ملّاحوں نے بھی مارکوپولو کا جہاز دیکھ لیا تھا اور اسی لئے اس کی طرف آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مارکوپولو نے بھی اس جہاز تک جلد از جلد پہنچنے کی ٹھانی چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں دونوں جہاز ایک دوسرے کے قریب آگئے

شکستہ حال جہاز عرب سوداگروں کا تھا جو مع ملّاحوں کے بھوک، پیاس اور تھکاوٹ سے نیم مردہ ہو رہے تھے مارکوپولو نے فوراً سب کو اپنے جہاز پر چڑھا لیا۔ ان کے کھانے پینے اور آرام و آسائش کا انتظام کیا اور جب لوگوں کی جان میں ذرا جان آئی تو اُن سے اُنکے سفری حالات پُوچھے ÷ باقی آئندہ (س۔ ع ر)

خمکدۂ خیام
اسرار قضا سے کوئی واقف نہ ہوا
اللہ کا بھید تھا کسی پر نہ کھلا
جو آیا قیاس سے کہا کچھ کا کچھ
معلوم نہ کچھ ہوا نہ قصہ نمٹا
قدرت نے مجھے حسن دیا تھا کیسا
رخ پھول سا قد سرو سے پیارا بخشا
پھر یہ نہ کھلا کہ خاک کرنے کے لئے
نقاش نے پھر مجھ کو سنوارا کیوں تھا
افسر الشعراء
آغا شاعر مرحوم

مضمون پڑھیں جو "انیس" کابل میں بتاریخ ۵ ستمبر ۱۹۴۲ء شایع ہوچکا ہے ۔ وہ لکھتے ہیں:-

"چند دن سے میں اخبارات میں پڑھ رہا ہوں کہ پشتو جرگہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ پشتو رسم الخط آیندہ سارے ملک میں ایک ہو اور رسم الخط کے فروعی اختلافات رفع کرنے کی کوشش کی جائے ۔ میرے خیال میں یہ نہ صرف ایک علمی اقدام ہے ۔ بلکہ ایک شاندار مہم اور قومی کارنامہ ہے جس سے قومی اتحاد کی قوی امید ہوسکتی ہے ۔

زبان اور رسم الخط کے درمیان ایسا مضبوط رابطہ ہے کہ ان کو جسم اور روح سے تشبیہ دی جاسکتی ہے پس بے جا نہ ہوگا اگر ہم اس شنز کہ زبان کے مسئلہ کو ایسی اہمیت دیں جس کا یہ مستحق ہے ۔

ہمارے ملک میں رسم الخط کے بارہ میں اتنا اختلاف کیسے پیدا ہوا؟

یہ مسئلہ چنداں تعجب انگیز نہیں کیونکہ اکثر ممالک میں ایسا مسئلہ درپیش ہے ۔ رسم الخط میں اختلاف کی وجہ صرف یہ ہے کہ لوگوں کے لہجے مختلف ہیں ۔ لہجہ کے اختلاف کی وجہ جغرافیائی حالات ہمسایہ قوموں سے میل جول اور ہمجو قسم اور واقعات ہیں ۔ لہجہ مختلف ہو تو رسم الخط کا مختلف ہونا لازمی ہے ۔ علاوہ اس کے گذشتہ زمانہ میں مختلف ملکوں اور شہروں میں چنداں ادبی اور معاشرتی رابطہ نہ تھا اور اس فقدان کی وجہ سے یہ اختلاف ایک مستقل صورت اختیار کر گیا ۔ جب ان اقوام میں بیداری کی لہر دوڑی جذبہ ملیت سے سرشار ہوئیں اور قومی اتحاد کا تخیل ان میں گھر کر گیا ۔ تو انہوں نے ان اختلافات کو مٹانے کی کوشش شروع کر دی ۔ جب اختلاف لہجہ کو نہ مٹا سکے تو رسم الخط کے اختلاف کو مٹانے کے درپے ہو گئے ۔

نتیجہ یہ ہوا کہ اب ہر طبقہ اور قبیلہ اپنے مخصوص لہجہ میں بات چیت کرتا ہے لیکن تحریر کے وقت اس رسم الخط سے کام لیا جاتا ہے جو ایک نمایندہ جرگہ نے منتخب اور مقرر کیا ہو ۔

اس طرح ان قوموں کے مطبوعات اور ادبیات میں یکرنگی قایم رہتی ہے اور یہ یکرنگی نہ صرف ان کے روزمرہ کے کاروبار میں آسانیاں پیدا کرتی ہے بلکہ ان کے قومی اتحاد اور وقار کی ترقی کا باعث ہوجاتی ہے

اس لحاظ سے مناسب ہے کہ ہم خدا کا شکر بجا لائیں کہ ہم اتنا بڑھ آئے ہیں کہ اپنی قومی وحدت اور ثقافت کی خاطر اتنا بڑا قدم اٹھا سکیں ۔ امید ہے کہ اتحاد فکر و عمل کی برکت سے جو ہمارے ادباء کے درمیان نظر آرہا ہے ایک شاندار اقدام کے قابل ہوجائیں گے اور قومی زبان اور تہذیب کی خدمت کر سکیں گے"۔

(مولانا) عبدالقادر

ضروری اعلان

"نن پروون" میں اب تک کسی قسم کے اشتہارات درج نہیں کئے گئے۔ ہماری خواہش رہی ہے کہ "نن پروون" کی کشش محض اس کی ادبی خصوصیات کی وجہ سے رہے۔ اسی لئے ہم مالی فائدہ نظرانداز کرتے رہے ہیں۔ کچھ عرصہ سے طبقۂ تجار کا اصرار ہے کہ ان کے اشتہارات "نن پروون" میں درج کئے جائیں بڑے غور و خوض کے بعد ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ اشتہارات قبول کئے جائیں اور اس امر کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے کہ ہمارے نرخ اخبارات اور رسالہ جات کے مقابلہ میں کم ہوں۔

خدا کے کرم اور قارئین کرام کی توجہ سے **"نن پروون"** کی اشاعت صوبہ سرحد۔ ریاستہائے سرحد۔ قبایلی علاقہ۔ بلوچستان۔ افغانستان وغیرہ میں بڑھ رہی ہے۔ امید ہے کہ ضرورتمند حضرات جلد از جلد استفادہ فرمائیں گے۔

اشتہارات کی اُجرت

(صرف پشتو یا اُردو ایڈیشن میں

پورا صفحہ ——— ایک اشاعت ——— پچاس روپے
نصف " ——— ایضاً ——— تیس "
چوتھائی " ——— ایضاً ——— پچیس "

پشتو اور اُردو ایڈیشن دونو میں)

پورا صفحہ ——— ایک اشاعت ——— پچھتر روپے
نصف " ——— ایضاً ——— پینتالیس "
چوتھائی " ——— ایضاً ——— ستائیس "

ادارہ

سرِّ کائنات

(...)

موجودہ دنیا کی طاقت اور ترقی کا سہرا تمام تر سائینس کے سر ہے۔ سائینس کے تجربات۔ دلائل اور مشاہدات نے پرانے خیالات تبدیل کر ڈالے اور قوانین قدرت سے خلق خدا آشنا ہوچکی۔ ابھی تھوڑا زمانہ پہلے ہماری یاد میں عوام الناس کے علاوہ تعلیم یافتہ لوگوں کا بھی یہی خیال تھا کہ زمین بیل کے سینگ پر کھڑی ہے۔ بیل مچھلی کی پیٹھ پر اور مچھلی پانی کی جھاگ پر۔
اسی طرح قدیم خیال یہ تھا کہ بارش آسمان سے اترتی ہے اور اس کا بادلوں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بادل صرف چھلنی کا کام دیتے ہیں۔ قدیم سائینسدانوں نے بھی کائنات کے اجرام اور اجسام کے متعلق اپنے نظریے وضع کیئے تھے۔ وہ زمین کو کل کائنات کا مرکز تصوّر کرتے تھے۔ لیکن علوم طبیعات اور ہیئت نے قدیم خیالات اور نظریوں کی بنیادی غلطی معلوم کرلی ہے اور اب انہوں نے زمان ومکان ، اجرام واجسام کے متعلق اپنی معلومات کی بنا پر نئے نظریے قایم کرلئے ہیں۔ ممکن ہوسکتا ہے کہ مستقبل کے سائینسدان نئے مزید معلومات کی روشنی میں کچھ اور ردّ و بدل کردیں۔ غرض کہ یہ سلسلۂ لامتناہی ہے۔ انسان کے فکر اور عقل کے استعمال کے ساتھ کائنات کی تخلیق کے متعلق بھی قیاسات اور نظریات تبدیل ہوتے جائیں گے۔ تخلیق کائنات قوانین قدرت۔ تخلیق اجسام واجرام اور ان کے ارتقائی مدارج ایک بحرِ بیکران ہے اور انسان علمی اعتبار سے بقول نیوٹن ایک ایسے بچے کے مانند ہے جو سمندر کے کنارے سنگریزوں سے کھیلتا ہو۔ لیکن باوجود اس کے علمی تحقیق اور تجسّس انسان کی فطرت ہے۔ اس لئے انسانی تفکّر نے جو کچھ اس ضمن میں حاصل کیا ہے اس کا مختصر ساذکر اس مضمون میں کردیا جاتا ہے۔ اس بے انتہا وسیع اور بسیط فضاء کی طرف سب سے اول اول سولہویں صدی میں علماء سائینس اور ہیئت نے توجہ کی اور اپنی معلومات کی بنا پر کچھ قیاسات وضع کردیئے یعنی

(۱) زمین متحرک اور گول ہے۔
(۲) زمین سورج کے گرد ایک سیارے کی حیثیت میں چکر لگارہی ہے۔

(۳) سورج بھی بذات خود ستارہ ہے اور دوسرے ستاروں کے مقابلہ میں معمولی جسامت کا مالک ہے۔

اٹھارہویں صدی میں علماء طبقات الارض نے یہ اعلان کیا کہ زمین کے طبقات اور اس کے خولوں سے یہ معلوم ہوتا ہے زمین کی عمر کروڑہا سال کی ہے علم طبیعات کے ماہرین نے وسعت کائنات اور اجرام فلکی کے متعلق جو معلومات حاصل کی ہیں وہ عوام الناس کی سمجھ سے باہر ہیں۔ اس لئے اس مضمون میں اُن سے بحث کرنا لا حاصل ہے۔ لیکن پھر بھی ان کی معلومات کے لئے چند باتوں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

علماء کا خیال ہے کہ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے لیکن یہ فاصلہ بمقابلہ دوسرے ستاروں کے بہت کم ہے۔ روشنی ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل طے کرتی ہے اور سورج کی روشنی زمین تک آٹھ منٹ میں پہنچ سکتی ہے لیکن سب سے نزدیک ستارے کی روشنی زمین تک چار سال میں پہنچ سکتی ہے۔ کہکشان تو زمین سے اس قدر دور ہے کہ روشنی کی رفتار کے مطابق اگر ہم زمین سے روانہ ہوں تو چار لاکھ سالوں میں وہاں پہنچ سکیں۔ کہکشان کا سب سے چھوٹا ستارہ بمقابلہ دوسرے اجرام فلکی کے بلحاظ جسامت ایک ہزار گنا ہے

اب اگر کائنات کی اس عظیم الشان وسعت کو مدنظر رکھکر انسان اس کا مقابلہ زمین کی وسعت کے ساتھ کرے اور پھر نسل انسانی پر نظر ڈال کر اس کائنات میں اپنی ہستی پر غور کی نظر ڈالے تو اُسے معلوم ہو جائے گا کہ خداوند کریم کی کائنات میں اس کا کیا درجہ ہے۔ بشرطیکہ انسان کی چشم عبرت وا ہو۔ کیونکہ وہ اس قدر خوردبین۔ خود دار اور برخود غلط ہے کہ اس کائنات میں سوائے اپنی ذات کے اس کی نظر میں کوئی چیز نہیں جچ سکتی۔

کائنات میں زمین نظام شمسی کے بہت قریب ہے اس لیئے اس کا مختصر سا ذکر کر دینا مناسب ہے۔

سورج کے گرد آٹھ سیارے گردش کرتے ہیں جن میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ فاصلہ کے لحاظ سے ان سیاروں کی پوزیشن یہ ہے :۔

عطارد .... سورج سے ۳ کروڑ ساٹھ لاکھ میل

زہرہ..... 〃 〃 ۶ کروڑ ۳۰ 〃 〃

مریخ ..... ایک ارب ۴ کروڑ ۳۰ 〃 〃

مشتری.....۴ 〃 ۸ 〃 ۳۰ 〃 〃

زحل.....۸ 〃 ۸ 〃 ۶۰ 〃 〃

یورینس.....۱۲ 〃 ۸ 〃 ۲۰ 〃 〃

نیپچون.....۲۲ 〃 ۹ 〃 ۲۰ 〃 〃

——— : (میاں سید رسول رسا)

رفتارِ زمانہ

سٹالن گراڈ

پورے تین مہینے سے سٹالن گراڈ دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کر رہا ہے۔ جرمنوں کے حملے بہت زیادہ شدت پکڑ چلے تھے۔ لیکن اب ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ دشمن تھک سا رہا ہے۔

دریائے وانگا روسیوں کے لئے ایک بڑی نعمت ثابت ہو رہا ہے۔ شمالی روس یا بحیرہ خضر سے جس قدر فوجی کمک اور جنگی سامان اس محاذ پر پہنچ رہا ہے وہ دریائے والگا ہی کے راستہ سے آرہا ہے۔ جرمنوں کا اصلی مدعا یہ رہا ہے کہ اس دریائی شاہراہ پر قبضہ پالیں تاکہ یہ امداد روسیوں کو نہ پہنچ پائے۔

اب ایک اور مصیبت کا سامنا ہے جاڑا آ رہا ہے۔ پچھلے جاڑوں میں ان کا برا حال ہوا اور روسی تلے ہوئے ہیں کہ آیندہ موسم سرما کو دشمن کے لئے ناقابل برداشت بنا دیں۔

مسلمانانِ بلغاریہ کی حالتِ زار

بلغاریہ کے مصیبت زدہ مسلمان ترکی آرہے ہیں۔ جو مصیبتیں مسلمانان بلغاریہ جھیل رہے ہیں وہ سب بیان کر دی ہیں۔ ان بیانات کی بنا پر ترکی اخبار "ینی صباح" نے ایک مفصل رپورٹ شایع کردی ہے اس رپورٹ کا خلاصہ یہ ہے :-

مسلمانان بلغاریہ پچانوے فیصدی بیکار اور قوت لایموت سے محروم ہو رہے ہیں۔ شرح اموات ان میں بڑھ رہی ہے۔ بہت سے لوگ کوچوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ پاس کوڑی نہیں۔ فاقوں سے نڈھال ہیں۔

مسلمانوں کا سب سے بڑا اور پُر رونق بازار اب ویران پڑا ہے۔ اکّے دکّے مسلمان وہاں آتے ہیں۔ اور قوت لایموت کی خاطر اپنے کپڑے اپنا اثاثہ بیچتے رہتے ہیں

بلغاری حکام مسلمانوں کے کنبوں کے کنبوں کو اپنے وطن سے نکال رہے ہیں تاکہ اور ملکوں میں جا آباد ہوں۔ مسلمانوں پر ٹیکس بڑھا دئے ہیں تمباکو سازی کے کارخانوں میں جو مسلمان کام کرتے تھے ان سب کو جواب مل گیا ہے اور انہیں مجبور کیا جا رہا ہے کہ بلا معاوضہ سڑکوں پر کام کریں۔

چین

مدتوں سے ممالک متحدہ امریکہ اور سلطنت برطانیہ

کی رعایا کو چین میں امتیازی حقوق حاصل رہے ہیں اور چینیوں کو یہ بات ناگوار تھی۔ اب امریکہ اور برطانیہ نے امتیازی حقوق سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا ہے۔ چینی بعد خوشیاں منا رہے ہیں۔ اس اعلان سے یہ معنی لئے جا رہے ہیں کہ امریکہ اور برطانیہ دل سے چاہتے ہیں کہ اس لڑائی کے بعد اقوام متحدہ میں مساوات اور اعتماد کی فضا قائم ہو جائے اور اسکے لئے ابھی سے راستہ صاف کر رہے ہیں۔ حال ہی میں جاپان نے مشرق اقصٰے کیلئے ایک نئی وزارت قائم کرنے کا اعلان کیا ہے یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ امریکہ اور برطانیہ کا یہ اعلان جاپان کے اس اعلان کا دندان شکن جواب ہے۔

لائبیریا: —— یہ ملک مغربی افریقہ میں واقع ہے اور وہاں حبشیوں کی ایک آزاد جمہوریت ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ کی فوجیں یہاں اتر چکی ہیں اور اس وجہ سے اس خطہ کا یکایک چرچا ہونے لگا ہے جنگی نقطۂ نظر سے اس خطہ کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ امریکہ اور یورپ سے غربی اور جنوبی افریقہ کو جو راستہ جاتا ہے وہ لائبیریا کے پاس سے گذرتا ہے اس کا ساحل ایسا ہے جہاں دشمن کی تحت البحریاں (یو۔ بوٹیں) آسانی سے چھپ سکتی ہیں تاکہ متحدین کے بحری قافلوں پر آئے دن حملہ کرتی رہیں امریکن فوجوں کے آنے سے یہ راستہ اس شر سے محفوظ ہو گیا ہے۔ یہ خطہ بھی ایک نوآبادی ہے اور اسکی مختصر سرگذشت یہ ہے: ممالک متحدہ امریکہ کی حکومت نے بہت سے امریکن حبشی غلام آزاد کر دیے تھے اور وہ لائبیریا میں آباد ہو گئے۔ انکا لیڈر جہووی لیشمین نامی ایک امریکن حبشی تھا ۱۹۴۷ء میں یہ ایک آزاد خود مختار جمہوریت بن گئی۔ امریکہ کو اس ملک سے خاص دلچسپی ہے۔

رفتارِ زمانہ

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلوفری رنگ بدلتا ہے کیا

اقبال

مصر: —— العالمین کے محاذ پر برطانوی سپاہ بڑھتی جا رہی ہے۔ محوری فوجیں بالمقابل حملے تو بہت کر رہی ہیں لیکن سب بے سود۔ تازہ ترین اطلاع سے پایا جاتا ہے کہ میدان جنگ جلے ہوئے محوری ٹینکوں سے پٹا پڑا ہے۔

افغانستان: —— والا حضرت صدر اعظم صاحب نے فن طب اور دواسازی کے فارغ التحصیل طلبہ کو اپنے دست مبارک سے سندات عطا فرمائیں۔ حکومت عظلیٰ نے قطغن اور بدخشان کے روئی کے کاشتکاروں کو نقد عطیے دینے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ روئی کی کاشت زیادہ ہو۔

حکام تلے ہوئے ہیں کہ بیوپاری ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں جو بیوپاری ایسا کرتے ہیں وہ چالان ہو کر سزائیں پا رہے ہیں ؎

یہ درگاہ جو سندھ کے معروف ترین مزاروں میں سے ہے شہر سہوان میں واقع ہے۔

سہوان ہندوستان کا ایک نہایت پرانا شہر ہے۔ اب اپنی اہمیت کھو چکا ہے اور اجڑ رہا ہے۔ یہ پتا لگانا مشکل ہے کہ حضرت لال شہباز قلندر کون اور کس زمانہ میں تھے۔ اس میں کلام نہیں کہ آپ بڑے ہر دلعزیز بزرگ اور قلندر یا خانہ بدوش درویش تھے اور اغلب ہے کہ آپ ایک بڑی فاضل اور مشہور ہستی تھے لیکن ایران یا ہندوستان کے صوفیائے معروف کی سوانحعمریوں میں آپ کا ذکر تک نہیں ہے۔ سہوان میں یہ مشہور ہے کہ آپ خراسان کے بڑے متبحر صوفی بزرگوار تھے اور آپ عثمان مروندی کہلاتے تھے۔ یہ روایت مانی نہیں جا سکتی۔ ایک دلیل تو یہ ہے کہ خراسان میں مروند کے نام سے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری دلیل یہ کہ اگر آپ واقعی اتنے ہی جید عالم ہوتے تو صوفیائے کرام کی کسی نہ سوانح عمری میں آپ کا ذکر ضرور ہوتا۔ لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ یہ درگاہ پہلے پہل ۱۳۵۶ء میں جبکہ جام ترخان حاکم سندھ تھا تعمیر ہوئی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ اس سے قبل وفات پا چکے تھے۔ موجودہ درگاہ میر کرم علیخان تالپور کے عہد حکومت میں شہنشاہ شاہجہان کے فرمان سے ۱۶۳۹ء میں بنائی گئی۔ کسی نہ کسی وجہ سے شاہجہاں اس بزرگوار کی بہت تعظیم کرتا تھا۔ اس درگاہ کے مجاور ہر مہمان کو بڑی متانت سے یقین دلاتے ہیں کہ مشہور تو یہ ہے کہ شاہجہاں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ مشہور عالم تاج محل آگرہ میں دفنایا گیا لیکن حقیقت میں اس کی اپنی وصیت کے مطابق اس کا جنازہ سہوان لایا گیا اور معمولی سی قبر میں سپرد خاک کیا تاکہ یہ ظاہر ہو کہ وہ حضرت قلندر کا ایک معمولی مرید تھا۔ ایسے عجیب و غریب افسانوں کی تحقیق بہر حال مشکل ہوتی ہے لیکن یہ افسانہ تو بادی النظر ہی میں بعید از قیاس ہے۔

سہوان کا اسٹیشن چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ زمانۂ قدیم میں یہ شہر دریائے سندھ کے کنارے تھا لیکن اب یہ دریا دور ہٹ گیا ہے اور جب کبھی سیلاب آئے تو ہی پانی سہوان کے پاس آسکتا ہے۔ اس شہر کی تین جانب ریگستان ہے اور خود شہر بھی حقیر اور کس مپرسی کی حالت میں نظر آتا ہے۔ نجف اشرف کی طرح یہ درگاہ بھی اہالی شہر کے لئے آمدنی کا ذریعہ تھی

مغلوں کے زمانہ کا شالامار باغ واقعہ سرینگر۔ کشمیر۔

لیکن زائرین آجکل بہت کم تعداد میں آتے ہیں۔ بازاروں
سے بھی غربت ٹپکتی ہے اور ماسوائے ان لوگوں
کے جو کراچی یا دیگر مقامات میں کام کاج کرتے ہیں
ہر فرد بھکاری دکھائی دیتا ہے۔

درگاہ کے پاس ہی ہر طرف کچ کے مکانات
ہیں۔ اس لئے شہر کے باہر
سے نظر نہیں آتی۔ البتہ
اسٹیشن سے شہر کو جاتے
ہوئے ایک اونچا علم نظر آتا
ہے جو درگاہ کے دروازہ
کے باہر نصب ہے۔

درگاہ تک ایک تنگ
گلی جاتی ہے جس کے دونو
طرف دیواریں ہیں۔ ان
دیواروں کے پیچھے مٹی کے
ٹیلے ہیں۔ ان ٹیلوں کے
اوپر دو منزلہ مکانات بنے
ہوئے ہیں جہاں پہلے
زائرین یا درویش ٹھیرا کرتے تھے۔ آج کل بیشتر مکانات
زیادہ تر خالی پڑے رہتے ہیں۔ ایک مکان میں
تیندوا رکھا ہوا ہے۔ مقامی لوگ اس کی وجہ یہ
بتاتے ہیں کہ
"بادشاہ کے گھر میں شیر ببر کا ہونا ضروری ہے"۔

رباعی

فانوسِ خودی میں آپ مستور ہیں ہم
پیدا ہوئے تو نور ہی نور ہیں ہم
دیکھا تو سہی تو نے مگر کیا دیکھا
جتنے نزدیک اتنے ہی دور ہیں ہم

[illegible]

کہا جاتا ہے کہ پہلے یہاں ایک شیر بلکہ کئی شیر ہوتے
تھے۔ اب درگاہ کی آمدنی اتنی گر گئی ہے کہ ایک تیندوا
بھی دو بھر ہے۔ اس لئے مجاور تیندوے کی خوراک
کے لئے زائرین سے کچھ نہ کچھ لے ہی مرتے ہیں۔

تعجب کی بات یہ ہے کہ اس جانور کی انچارج
ایک عورت ہے ہے تو
وہ مسلمہ لیکن پردہ نہیں کرتی
اور بہت سے بڑے بڑے
تعویذ پہنے رہتی ہے۔

مکانات کے پاس
ہی مذکورہ بالا علم کھڑا ہے
درگاہ کے دروازہ کے
قریب گلی کچھ چوڑی ہو
جاتی ہے۔ درگاہ کا صحن
بہت شاندار ہے اور
سترہویں صدی کے شروع
کی طرز پر بنا ہوا ہے۔ اس
کے چھتہ میں چکنے پتھر
لگے ہوئے ہیں۔ اندر کی طرف دروازہ سے نئی
پرانی طرح طرح کی گھنٹیاں کثرت سے لٹک
رہی ہیں یہ ذرا تعجب انگیز ہے کیونکہ ہندو اپنے
مندروں کے دروازوں سے گھنٹیاں لٹکائے
رکھتے ہیں۔ یہاں بھی ہندوؤں کا اثر پایا جاتا ہے۔

صحن نہایت پاکیزہ ہے۔ سنگ مرمر کا فرش ہے۔ اور ارد گرد کی عمارت کی بلندی اور صحن کی باہمی نسبت کے لحاظ سے یہ پتھر حیرت انگیز قرینوں سے جڑے ہوئے ہیں۔ دروازہ کے پاس ہی کئی بڑے بڑے لقارے پڑے ہیں اور دن چھپے بجائے جاتے ہیں۔ دائیں طرف ایک پرانا علم بھی پڑا ہے جو موجودہ علم سے پہلے استعمال ہوتا تھا۔ اس لئے ہٹا دیا گیا تھا کہ اس کی لکڑی کو گھن لگ گیا تھا۔ صحن کے دوسرے سرے پر اور دروازے کے بالمقابل مقبرہ ہے اس کے پاس ہی ایک مسجد ہے جس کی چھت لکڑی کے کھمبوں پر قایم ہے۔ مقبرہ کی عمارات میں بیشمار کھپرے جڑے ہوئے ہیں۔ اس کا حصہ بہت شاندار ہے اور اس کا دروازہ نہایت ہی خوبصورت آرائشی نقرئی پتھروں سے بھرا ہؤا ہے۔ قبر کے ارد گرد ایک کٹہرا ہے جس پر نفیس کام کیا ہؤا ہے اور جس سے ریشمی پردے لٹک رہے ہیں۔ حسب دستور قبر کے اوپر بہت سے لمپ، لمپ پوش، شتر مرغ کے انڈے وغیرہ لٹک رہے ہیں۔ قرآن شریف کے نئے نسخے حسب معمول آس پاس رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت لال شہباز کے مرید پہلے بہت کثرت سے تھے کیا سندھ میں کیا باہر۔ وہ زیادہ منظم بھی تھے۔ پڑھے لکھے بھی ہوتے تھے اور ملک میں بڑے کام بھی کر گذرتے تھے اب تو بہت ہی تھوڑے رہ گئے ہیں وہ بھی محض جاہل بھکاری ہیں نیک لوگوں کو ان سے چنداں ہمدردی بھی نہیں جو عام طور پر درگاہ کے آس پاس رہتے ہیں۔ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ البتہ خاص تیوہاروں میں خاص کر سالانہ عرس اور میلہ کے موقعہ پر بڑی تعداد میں جمع ہو جاتے ہیں درگاہ کا صحن تو ہر وقت کھلا رہتا ہے مگر مقبرہ رات کے گیارہ بجے ضرور بند ہو جاتا ہے

قطعہ

محفل برخاست ہے، پتنگے رخصت شمعوں سی ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو
کچھ ہوش نہیں سو رہے ہیں!

(سیماب)

اور رات کے دو بجے پھر کھول دیا جاتا ہے جب
دروازہ بند کیا جاتا ہے تو ایک دلچسپ رسم ادا
ہوتی ہے ۔ یعنی متولی درگاہ اور دیگر کارندے
سندھی میں دعائیں پڑھتے ہیں اور بار بار تعظیماً
جھکتے رہتے ہیں ۔ دن چھپے گانا نہایت دلکش ہوتا
ہے ۔ جونہی سورج ڈوبا قلندر بڑی تعداد میں
صحن کے اندر جمع ہو جاتے ہیں اور وقت مقررہ
کے منتظر رہتے ہیں ۔ جونہی اندھیرا ہونے لگا ۔ اور
اذان کی آواز آئی ۔ درگاہ میں ایک شور مچ جاتا ہے
سارے نقارے اور درجنوں نفیریاں بجنے لگ
جاتی ہیں ۔ کوئی دس منٹ تک یہ کیفیت جاری
رہتی ہے ۔ اور درحقیقت دلوں پر اثر ہوجاتا ہے
یہ ایک شاہی رواج ہے ۔ زیادہ عرصہ
نہیں گذرا کہ ایران کے نقار خانوں میں یہی
دستور تھا ۔

یہ دستور بہت پرانا ہے اور جاری رکھے
جانے کا مستحق ہے ۔

"ابوالقاسم بخاری"

قدیم اور جدید اخلاق

بقیہ ص ۲۸

خود غرضی اور نفسانی خواہشات کو پس پشت ڈال کر
مذہبی نظام قایم کریں ۔ انسانی فطرت پایۂ تکمیل
کو پہنچے ۔ رسم و رواج کو خیرباد کہکر مذہبی اخلاق
مذہبی فلسفہ ۔ اور مذہب کے اصولوں پر عمل پیرا ہوں
ان کا عمل اور نیت ایک ہو نہ کہ بمصداق

یقولون ما لا تفعلون

دل میں کچھ ہو اور کریں کچھ ۔ موجودہ تمدن میں بڑا
بھاری نقص یہ ہے ۔ کہ اعمال حسنہ کو ہم افضل تو
سمجھتے ہیں لیکن عملاً ان کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ۔ انسان
اس وقت مہذب کہلا سکتا ہے کہ اپنے عمل سے اپنی حیوانیت
کو قابو میں رکھکر انسانیت کا بول بالا کرے اور اس زمین کو
اپنے نیک عمل سے جنت بنادے ۔ دنیا میں آرام اور آسودہ
زندگی بسر کرے اور آخرت میں بھی سرخرو ہو ۔ اگر ایسا نہ ہوا
تو وہی جنگ و جدال ۔ قتل و خونریزی کا دور دورہ قایم رہیگا
ہر کوئی سرگردان و پریشان ۔ ہر کوئی مغموم اور بے آرام رہیگا
آفات عذاب و بلا کا نزول ہوگا اور سرکش انسانوں کو عبرتناک سزا ملیگی

فَاعۡتَبِرُوۡا یَا اُولِی الۡاَبۡصَار

(میاں سید رسول رسا)

پشتو رسم الخط

(۲)

اگر ہم افغان قوم کے ایک خاص قبیلے کی زبان کو معیاری تصور کریں اور اس کے تلفظ کے مطابق لکھیں جو مولانا صاحب کی منشاء ہے تو ہمیں ایک اور تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا مثلاً ناناکر 'لبنکر' - 'لخکر' لکھا جائے گا لیکن جب ہم کسی خٹک، مروت یا بنگش کو مخاطب کریں تو وہ ضرور اپنی زبان میں اسے لشکر پڑھیگا۔ علاوہ اس کے وہ ایک دماغی کشمکش میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور وہ بچے جو 'لشکر' بولتے ہیں یقیناً ایک ذہنی تکلیف محسوس کریں گے۔ جب ان کو یہ کہا جائے کہ 'لخکر' حقیقت میں وہی لفظ ہے جس کو وہ 'لشکر' بولتے ہیں۔ وہ حیران رہ جائیں گے کہ 'خ' کا تو حرف ہمیشہ 'خ' کی آواز دیتا ہے یہاں ش کیوں بولا جائے۔ وہ ساتھ ساتھ دماغ میں سوچنے لگ جائیں گے کہ 'لخکر' ان کی زبان کا 'لشکر' ہی تو ہے۔ اسی طرح 'کوکک' ان کا 'کوژ' اور 'اوُ خ' ان کا 'اوش' ہے علےٰ ہذ القیاس۔

پس میرے خیال میں آسانیوں کی جگہ مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ ہم تمام افغان قوم کو اس بات پر مجبور کر سکتے ہیں کہ وہ ایک قسم کا رسم الخط قبول کر لیں لیکن قبائل کا تلفظ بدلنا ناممکن ہے۔ کیونکہ تلفظ کا تعلق وطن۔ زمین۔ آب و ہوا خورد و نوش۔ طرز زندگی اور دیگر جغرافیائی حالات سے بہت گہرا ہے۔ میرے خیال میں اگر ہم 'زوان' کی جگہ 'خوان' اور 'لخکر' کی جگہ 'لبنکر' لکھیں تو ہم نہ صرف قبائل کے لئے آسانیاں پیدا کرینگے بلکہ اس سے وہ لوگ بھی جن کی مادری زبان پشتو نہیں اور جن کے لئے مولانا صاحب پشتو کو آسان کرنا چاہتے ہیں اسی قدر مستفیض ہونگے۔

میری ناقص رائے میں جو آدمی فارسی یا اُردو سے ذرا بھی واقف ہے وہ یقیناً 'زوان' کی جگہ 'خوان'۔ 'لخکر' کی جگہ 'لبنکر'۔ 'ھس' کی جگہ 'ہیچ'۔ 'ساور' کی جگہ 'ثادر' اور 'کوکک' کی جگہ 'کوز'۔ 'جبہ' کی جگہ 'ژبہ' اچھی طرح سمجھ سکیگا۔ کیونکہ فارسی اور اردو میں ان الفاظ کی شکل کم وبیش اسی طرز پر ہے۔ پس جس کسی نے یہ چار حروف پشتو زبان میں داخل کئے ہیں۔ اس نے بیشک قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے وہ انسانی فطرت اور زبان کے تلفظ کے گہرے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ پشتو زبان کے مختلف تلفظ میں اختلاف مٹانا ناممکن ہے اور یہ ہمیشہ رہیگا۔ اردو کے معمولی حرف جار 'س' کو لے لیجئے۔ ہندوستان کے ہر گوشہ میں 'س' ہی بولا جائے گا۔ فارسی کا 'در' بھی اسی طرح

افغانستان ہو خواہ ایران۔ ہر جگہ 'دڑ' ہی بولا جائے گا۔ عربی
کے 'فی' کا بھی یہی حال ہے۔ انگریزی کا 'تھ'، تمام ممالک
کینیڈا۔ امریکہ۔ آسٹریلیا اور ہندوستان میں 'اِن' ہی رہیگا
'آن'۔ 'اُن' وغیرہ سے کبھی موسوم نہ ہوگا۔

رہا سوال پشتو زبان کا۔ اس کا معمولی حرف چار 'ښ'
تین طرح بولا جاتا ہے۔ یعنی 'کشے'۔ 'کے' اور 'چے'۔ جس
طرح لوگوں کے حلق سے نکلے ہوئے الفاظ کی مخصوص طرز
بدل ڈالنا مشکل ہے۔ اسی طرح پشتو زبان سے 'ځ'
'څ'۔ 'ړ' اور 'ښ' نکال دینا بھی بہت دشوار ہے۔

اب سوال یہ باقی رہا کہ آیا ان چار حروف کی ایزادی
سے پشتو حروف تہجی اردو حروف تہجی سے بڑھ جائیں گے
میرے خیال میں ایسا ہرگز نہیں ہوگا گو بظاہر ایسا ہی معلوم ہوتا
ہے کہ پشتو کے چار حروف زیادہ ہو چکے ہیں۔ اگر اردو کے
حروف 'پھ'۔ 'تھ'۔ 'ٹھ'۔ 'جھ' وغیرہ حروف بھی شامل کئے
جائیں تو پشتو کے حروف تھوڑے رہجاتے ہیں۔ یہاں یہ
اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ پھ۔ تھ تو محض پ اور ھ یا
ت اور ھ کے مرکب ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ځ
بھی ج و ز اور څ۔ چ و س کے مرکب حروف ہیں۔ اگر
ایسا نہ بھی ہو تو بھی ان چند حروف کی ایزادی سے
پشتو رسم الخط بمقابلہ اُردو کے ناقص نہیں قرار دیا جاسکتا
جیسا کہ بعض حضرات کی رائے ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حروف تہجی کی کمی اس بات
کی ضامن نہیں ہوسکتی۔ کہ وہ زبان جلدی ترقی کرسکے گی
کیونکہ لوگ تو صرف وہ زبان سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں
جس سے مالی یا سیاسی فائدے کی توقع ہو۔ قطع نظر اس
سے کہ وہ سہل ہے یا مشکل۔ زبان میں حروف کی کمی اس
بات کی دلیل ہے کہ اس کے بولنے والے پسماندہ اور
کمزور ہیں۔ ایسی زبان کیونکر جاذب نظر ہوسکتی ہے۔ خاندان مغلیہ
کی حکومت میں فارسی منظور نظر زبان تھی۔ انگریزی عملداری
میں لوگ ہر قیمت پر انگریزی سیکھنے لگ گئے۔ لارڈ میکالے
لکھتا ہے کہ حکومت وظایف دیکر لوگوں کو فارسی سیکھنے کی
ترغیب دیتی ہے لیکن لوگ اپنی گرہ سے روپیہ صرف کرکے
انگریزی سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ انگریزی حروف کم ہیں لیکن انگریزی
کی ترقی کی یہ وجہ نہ تھی۔ بلکہ وجہ یہ تھی کہ اس میں دیگر زبانوں
مثلاً یونانی اور لاطینی وغیرہ کے الفاظ اپنانے کی صلاحیت
موجود ہے۔ وہ الفاظ کے دائیں اور بائیں دوسرے
الفاظ بڑھا کر نئے الفاظ بنا سکتی ہے۔ وہ ایسی قوم کی زبان
ہے جس کی سیاست دنیا پر غالب ہے۔ ورنہ یہی زبان
اور یہی حروف بلکہ الزبتھ کے زمانہ میں انگلستان سے
باہر غیر مانوس تھے۔ جب دنیا کے گوشہ گوشہ میں
انگریزی نوآبادیاں قائم ہوگئیں تو وہاں کے باشندوں
نے سیاسی اور مالی غرض سے اور دوسرے ممالک نے
تجارتی اغراض سے انگریزی زبان سیکھنا شروع
کی۔ اس طرح انگریزی زبان ترقی کرتی گئی۔ لیکن یہی
انگریزی خوان جب مختلف ممالک کے ساتھ خط و کتابت

کرتے ہیں تو ان کو انگریزی زبان سے تنگدامنی کی شکایت باقی
رہتی ہے کیونکہ اس میں ټ۔ څ۔ ځ۔ ړ۔ ژ۔ ط۔ غ۔ ق
وغیرہ حروف کے مقابلہ میں حروف نہیں۔ دو حروف ملا کر کام
چلانا پڑتا ہے۔ مثلاً (TH. SH. GH.) وغیرہ اپنے تلفظ
کے لئے بھی حروف ناکافی ہیں۔ یہ خامی چنداں اہم نہیں دوسری
زبانوں میں بھی پائی جاتی ہے انگریزی زبان جسکی مثال دیجاتی ہے ایک
اور لحاظ سے بھی ناقص ہے۔ باوجود ترقی یافتہ ہونیکے انگریزی
زبان میں پشتو زبان سے زیادہ پیچیدگیاں ہیں مثلاً Rough.
میں جی۔ ایچ کا تلفظ ف ہے لیکن یہی جی۔ ایچ لفظ Plough.
میں و بولا جائیگا۔ نمونیا Pneumonia. اور لفظ
ٹاک یعنی بولنا لے لیجئے۔ پہلے لفظ میں P. Talk.
اور دوسرے میں L. آواز نہیں دیتے۔ ان دو حروف کے بغیر
بھی کام چل سکتا تھا۔ ان مثالوں کو مشتے از خروارے سمجھیں ورنہ
انگریزی زبان ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ان باتوں کے باوجود انگریزی
زبان روبہ ترقی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ کسی زبان میں چند خاص امتیازی
حروف کی زیادتی اس کی ترقی میں مانع نہیں ہوسکتی۔

چینی زبان کے متعلق بھی یہ خیال ہے کہ حروف تہجی کا زیادہ ہونا
چینی قوم اور زبان کی ترقی میں حائل رہا ہے میرے خیال میں چینی زبان
ایک قدیم اور پائدار تہذیب کی ہمیشہ یادگار رہے۔ چند ہزار سال پہلے
جب دنیا جہالت اور وحشت میں زندگی بسر کر رہی تھی چینی سیاحوں
نے سفرنامے لکھے اور وہاں کے علماء اور مورخوں نے کتابیں تصنیف کیں
باقی دنیا فن تحریر تو ایکطرف کاغذ سازی سے بھی ناواقف تھی پس چین
کی تہذیب سے ثابت ہوتا ہے کہ چینی زبان قومی ترقی میں رکاوٹ نہ تھی
بلکہ زبان کی ترقی کا صحیح راز اُسکے بولنے والوں کا سیاسی اقتدار ہے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا میں اپنے خیالات کو مناسب طور سے پیش
کرسکا ہوں۔ اسلئے خلاصۃً پھر عرض کئے دیتا ہوں:۔ پشتو زبان
کا رسم الخط اردو ہونا چاہیئے۔ ټ۔ ډ۔ ړ۔ اور ګ بھی ٹ۔ ڈ
ڑ اور گ کی طرح لکھے جائیں لیکن یہ چار حروف څ۔ ښ۔ ږ۔ ڼ
حروف تہجی سے نکالے نہ جائیں۔ امید ہے قارئین کرام میری یہ تجویز
پڑھکر اپنی رائے سے بھی مطلع فرمائیں گے۔

مولانا صاحب کی خدمت میں بھی التماس کرتا ہوں کہ وہ اپنی نئی
طرز تحریر اختیار کرنے میں جلدی نہ کریں بلکہ اس بارہ میں سرحد اور
افغانستان کے علماء اور ادباء کے نظریوں کا انتظار کریں۔ امید ہے کہ
پشتو جرگہ کابل، انجمن ادبی قندھار اور ادبی جرگہ صوبہ سرحد جلد از جلد
اپنی قیمتی آرا کا اظہار کردینگے۔ مولانا صاحب کے مضمون کی دل کھولکر اشاعت
کرنا ضروری ہے کیونکہ معاملہ بہت اہم ہے۔ مندرجہ ذیل اصحاب کے
نام اگر فرداً فرداً مولانا صاحب کا مضمون ارسال کریں تو بہت مناسب ہوگا
یاغستان:۔ مولانا عبدالمجید افغانی۔ ریاست سوات:۔ زیب سر۔
سرحد:۔ قاضی عطاء اللہ سابق وزیر تعلیم۔ خانصاحب غلام سرور خان
گنڈہ پور۔ عبدالاکبر خان۔ مولانا عبدالرحیم۔ میاں احمد شاہ بیرسٹر۔ میاں صاحب
سید رسول۔ عبدالخالق خلیق۔ سمندر خان بدرشی۔ عبداللہ جان اسیر
محمد اکبر خادم۔ راحت زاخیلی۔ عبدالکریم خان۔ امیر حمزہ شنواری۔

ان کی آراء معلوم ہونے پر اکثریت سے فیصلہ ہونا چاہیئے
ایسا نہ ہو کہ ایک قوم میں دو تین قسم کے رسم الخط رائج ہوجائیں
جو رسم الخط پاس ہو اس کیلئے قواعد و ضوابط مرتب کرنا بھی ضروری ہیں

(فضل حق شیدا)

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

عطارد بمقابلہ زمین کے سورج سے زیادہ قریب ہے اس لئے عطارد کا ایک سال اٹھاسی (۸۸) دنوں کا بنتا ہے ۔ نظام شمسی میں سورج سے سب سے دور نیپچون ہے اسکا سال ۶۰۱۲۷ دنوں کا ہے یعنی نیپچون کا سال زمین کے سال سے ۱۶۴ گنا لمبا ہے گویا ۱۶۴ سالوں میں سورج کے گرد ایک چکر لگاتا ہے ۔ جسامت میں عطارد ۔ مریخ اور زہرا زمین سے چھوٹے ہیں لیکن باقی سیارے زمین سے بڑے ہیں ۔ عطارد زمین کا ۱/۲۰ حصہ اور مشتری زمین سے ۱۳۰۰ گنا بڑا ہے ۔ اکثر سیاروں میں اس قدر حرارت موجود ہے کہ وہاں خاکی ۔ ہوائی اور آبی زندگی لبسر کرنا مشکل ہے ۔ ناری زندگی کے متعلق ہمیں کوئی علم نہیں ۔ ارضی زندگی صرف مریخ میں ممکن ہو سکتی ہے ۔ لیکن وہاں کے متعلق ہماری معلومات اس قدر قلیل اور محدود ہیں کہ وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ۔ جس زندگی اور آبادی سے ہم آشنا ہیں وہ کائنات میں صرف کرۂ زمین پر پائی جاتی ہے ۔

ماہرین علم ہیئت کا خیال ہے کہ ابتدا میں کرۂ زمین سورج کا جزو تھا لیکن قریباً ۳۰ ارب سال ہوئے سورج سے ٹوٹ کر کروڑوں سال نیم سیال اور گیس کی حالت میں پڑا رہا ۔ چاند کرۂ زمین کا ایک ٹکڑا تھا جو زمین کا ۱/۸۰ حصہ تھا اور زمین سے جدا ہوگیا ۔ شدید زلزلوں سے زمین ٹھنڈی ہوگئی ۔ اس کے بعض حصے سمندر بن گئے اور بعض خشکی اور پہاڑوں میں تبدیل ہو گئے ۔ چونکہ چاند جسامت میں زمین سے بہت چھوٹا تھا ۔ اس لئے وہ جلدی ٹھنڈا ہوگیا یہاں تک کہ اب چاند میں حرارت باقی نہیں رہی ۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ چاند زمین کا وہ حصہ تھا ۔ جہاں اب بحرالکاہل موجود ہے ۔ کہتے ہیں کہ کرۂ ارض جوں جوں ٹھنڈا پڑتا گیا ۔ سورج سے ہٹتا گیا اور اس کا سال بھی لمبا ہوتا گیا یہاں تک کہ زمین کا سال ۳۶۵ دنوں کا بن گیا یعنی اب کرۂ زمین سورج کے گرد ۳۶۵ دنوں میں چکر پورا کر سکتا ہے ۔ اس چکر سے موسم پیدا ہوتے ہیں ۔

اس کے علاوہ کرۂ زمین اپنے محور پر بھی گھومتا ہے اس گردش سے دن رات پیدا ہوتے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ ابتدا میں کرۂ زمین کو اپنے محور کے گرد گھومنے میں تھوڑا عرصہ لگتا تھا اس وجہ سے دن اور رات بھی چھوٹے ہوتے تھے ۔ لیکن زمین کے سورج سے دور ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا محوری چکر بھی سُست

ہوتا گیا۔ اور اب یہ محوری چکر ۲۴ گھنٹوں میں پورا ہو جاتا ہے۔ زمین کے دن رات اور سالوں کی مدت میں تبدیلیاں اب بھی رونما ہو رہی ہیں یعنی دن رات اور سال بڑھ رہے ہیں۔ لیکن یہ تبدیلیاں اس قدر آہستہ آہستہ ہو رہی ہیں کہ عام لوگ انہیں محسوس نہیں کر سکتے

سائینسدانوں کا خیال ہے کہ اگر موجودہ نظام شمسی اسی طرح قائم رہا تو کئی ارب سال بعد زمین بالکل سرد اور ناقابل رہائش ہو جائے گی اور راتیں اور سال لمبے ہو جائیں گے۔

اب بھی کرۂ زمین اپنی جوانی گذار چکا ہے حرارت اور روشنی کی بہاریں لوٹ چکا ہے یعنی اب اسکا بڑھاپا آن پہنچا ہے۔ زمین کی اپنی طاقت۔ حرارت اور روشنی باقی نہیں رہی۔ سورج کے فیض سے اس کی حیات باقی ہے اگر آج سورج اپنی روشنی۔ حرارت اور طاقت زمین کو دینا بند کر دے تو زمین پر عرصہ حیات تنگ ہو جائے آب و ہوا میں شب و روز کے اختلاف اور موسموں کے تغیر و تبدل کے لئے زمین سورج کی محتاج ہے۔

کرۂ ارض کی خشکی اور تری کے متعلق ماہرین کا خیال ہے کہ ابتدا میں سطح زمین پر کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں ہیبت ناک زلزلے۔ سمندر۔ دریا۔ خوفناک طوفان بارش۔ برف۔ وغیرہ زمین پر اپنا دائمی اثر ڈال چکے ہیں یہ تو خبر نہیں کہ پہاڑ ٹیلے۔ وادیاں۔ درے۔ دریا سمندر کب بنے البتہ کروڑہا سال یہ سلسلہ جاری رہا۔ بالآخر جب کرۂ زمین کے اندر حرارت کم ہوئی اور وہ ان انقلابات سے تھک کر چور ہو گیا تو اس نے مستقل صورت اختیار کر لی۔ کہیں خشکی اور پہاڑ بن گئے۔ کہیں میدان اور وادیاں اور کہیں دریا اور سمندر۔

آجکل بھی سطح زمین پر تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں کہیں سمندر میں سے جزائر اُبھر آتے ہیں اور کہیں جزائر سمندر میں دب جاتے ہیں تغیر و تبدل کائنات کا خاصہ ہے۔ روزِ اول سے تغیر و تبدل۔ حرکت و حرارت ہیجان و طوفان اور حادثات و واقعات کا لاانتہا سلسلہ جاری ہے۔ یہ تغیر اور انقلاب قانونِ قدرت ہے اور کائنات کا ایک مسلسل شغل ہے۔ حرکت میں کائنات کی بقا ہے۔ قرار۔ سکون و ثبات کائنات کے لئے پیغام اجل ہیں۔ بگاڑنا اور بنانا اور بنے کو پھر بگاڑنا ہی کائنات کے قوی اور بنیادی اصول ہیں؛

(میاں سید رسول۔ رسا)

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں
(مصحفی)
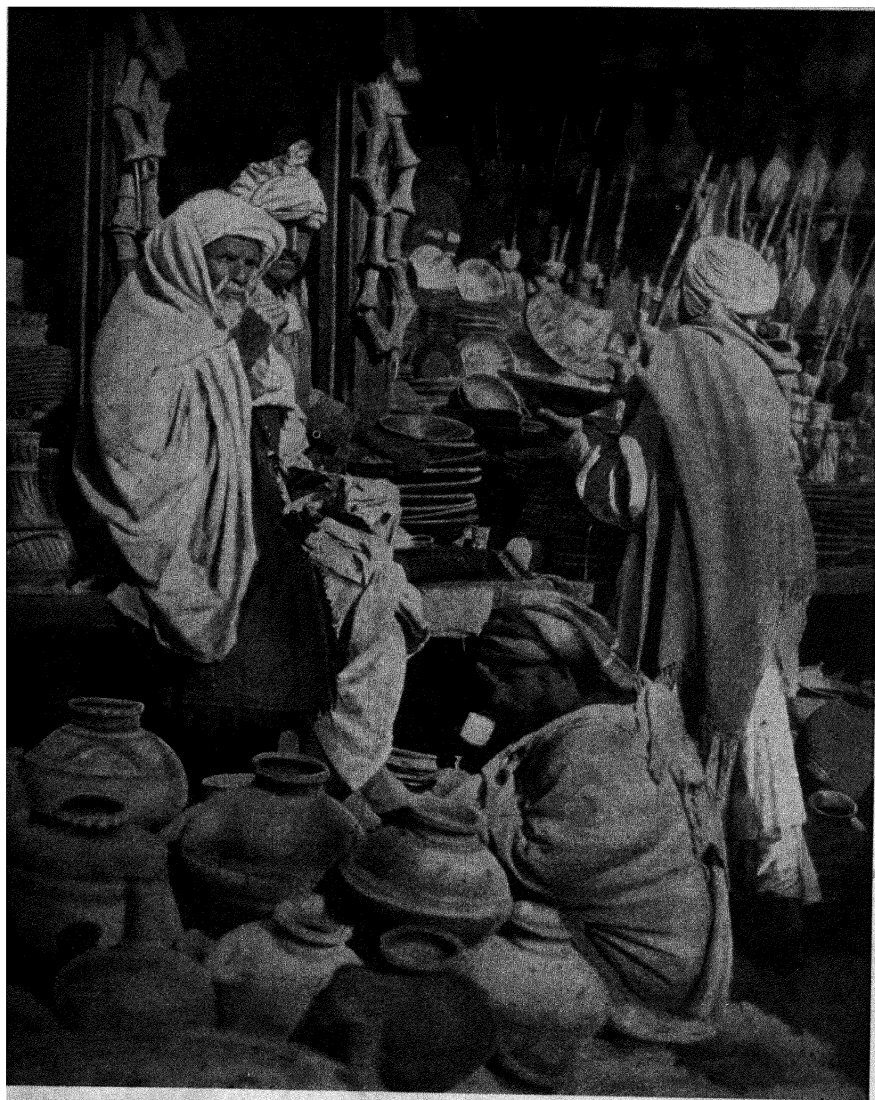
پشاور میں مٹی کے برتنوں کا بازار۔

مڈغاسکر

(۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

انہوں نے کہا کہ ہم تجارت کی غرض سے زنجبار اور سمبا جہاز لیجا رہے تھے کہ باد مخالف نے ہمارا رُخ ادہر کو پھیر لیا اور ہم راستہ بھول بیٹھے چند روز ہمارا جہاز جنوب کی طرف جاتا رہا لیکن ہمیں کچھ خبر نہ تھی کہ کدھر جا رہے ہیں۔ چاند کی پہلی تاریخ کو ہمیں خشکی نظر آئی اور بڑی مشکل سے ہمارا جہاز کنارے لگا۔ ہم نیچے اتر کر اِدھر اُدھر دوڑا کئے کہ شاید کوئی انسان مل جائے لیکن وہاں آدمی کہاں۔ گرمی کی شدّت سے زمین تانبے کی طرح سرخ تھی۔ رات کو ہر جانب سے جنگلی درندوں کی خوفناک آوازیں آیا کرتی تھیں اور آدم قد بند رہزاروں کی تعداد میں اِدھر اُدھر کھیدکتے نظر آتے تھے۔ تمام فضاء اس قدر ہیبت ناک تھی کہ انسان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ رات ڈرتے ڈرتے گذری۔ دن چڑھے ہم جزیرہ کے اندر گئے اس امید میں کہ شاید اندرونی حصّہ میں انسان آباد ہوں۔ لیکن راستہ میں اس قدر دشوار گذار پہاڑ اور گھنے جنگلات پڑے کہ آگے بڑھنا ناممکن تھا۔ ناچار لوٹے۔ اپنے جہاز پر سوار ہوئے اور ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کرنا شروع کیا۔ پورا ایک مہینہ اسی طرح گذرا لیکن ساحل ختم ہونے کو نہیں آتا تھا ہم سمجھے کہ یہ جزیرہ نہیں ایک نیا براعظم ہے جو ابھی تک دریافت نہیں ہُوا تھا اور نہ کسی نے اس کا نام سنا تھا۔

ایک دن ہم اپنے جہاز سے اس پر اسرار ملک کے بلند پہاڑوں، گھنے جنگلات اور شکستہ ساحل کا نظارہ دیکھ رہے تھے کہ ہمیں ایک بلند پہاڑ پر ایک پرندہ اڑتا نظر آیا۔ یہ پرندہ جسامت میں ہمارے جہاز سے بڑا تھا اور پنجوں میں ایک جانور پکڑے ہوئے تھا جو جثہ میں ہاتھی سے ہرگز کم نہ تھا۔ ہمارے ہوش اڑ گئے۔ ہم جہاز کو ساحل سے دور لے گئے

مارکوپولو بہت غور سے عرب جہازرانوں کی باتیں سنا کیا۔ اس نے دل میں مصمم ارادہ کر لیا کہ اس پراسرار ملک کے مکمل حالات معلوم کرکے اس پر قبضہ کیا جائے۔ اپنے دماغ میں یہ تصور باندھنے لگا کہ ایک زبردست بیڑا اپنی کمان میں لائے اور اس پر اسرار جزیرہ پر قبضہ کر ڈالے لیکن اس کی یہ امید بر نہ آئی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ اس تجویز کو کیوں عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

دوسو سال بعد ایک پرتگیزی جہاز کا کپتان لورنیکو کی زیرکمان جنوبی افریقہ سے اپنے ملک کو واپس لوٹا لیکن مقررہ

میعاد کے چھ ماہ بعد لوگ سمجھے بیٹھے تھے کہ غرق ہو چکا ہے۔ لزبن پہنچتے ہی کپتان لورنیکو نے اپنے امیر البحر ٹرسٹاڈ کو اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ لزبن میں خوشیاں منائی گئیں۔ امیر البحر مذکور اپنے کپتان کی آمد پر کھولا نہ سمایا اور کپتان لورنیکو نے اپنے سفر کے حالات امیر البحر کے آگے یوں بیان کئے:۔

''موزنبیق سے روانگی کے وقت ہوا موافق تھی۔ اور ہم سب خوش تھے کہ وطن لوٹ آرہے ہیں۔ تیسرے دن ایک شمال کی جانب سے ایسی تند و تیز ہوا چلی کہ جہاز جنوب کی طرف بہہ نکلا۔ پانچ رات اور پانچ دن برابر ہمارا جہاز اس طوفان میں بھٹکتا پھرا۔ ہر گھڑی یہ خوف دامنگیر تھا۔ کہ اب جہاز ڈوبا اور ہم مچھلیوں کا شکار ہوے۔ چھٹے دن ہوا کچھ تھمی۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ ہم ایک غیر معلوم ملک کے قریب تھے۔ جہاز کا ساحل کے قریب لنگر ڈالا۔ ہم اترے۔ ساحل کے کنارے کنارے چل پڑے۔ اس جزیرہ میں ہمیں ایسے آدمی ملے جن کا رنگ سیاہ تھا لیکن افریقہ کے حبشیوں سے کم۔ ہم انہیں دیکھ کر حیران ہوتے وہ ہمیں دیکھکر۔ ہم چند دن ٹھیرے یہاں کے لوگ بندر کے گوشت پر گذارہ کرتے ہیں۔ بندروں کے علاوہ دوسرے عجیب و غریب جانور بھی یہاں پائے جاتے ہیں۔ یہ جزیرہ بہت بڑا معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کے بلند پہاڑ دور دور تک دکھائی دیتے ہیں''۔

امیر البحر ٹرسٹاڈ نے سب حالات سن کر کپتان مذکور سے کہا کہ وہ شاہ پرتگال سے یہ سب کچھ کہدیگا۔ تاکہ اس کی اجازت حاصل کر کے ایک سمندری بیڑہ تیار کرے اور بادشاہ کی طرف سے اس نا معلوم جزیرہ پر قبضہ کیا جائے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے مارکوپولو کیطرح ٹرسٹاڈ کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

اس واقعہ کے کئی سال بعد یعنی ۱۶۴۱ء میں فرانس کے لاٹ پادری رشلیو نے شاہ فرانس لوئیس ۱۳ کی خدمت میں ایک نقشہ پیش کیا اور ساتھ یہ بھی عرض کی کہ یہ نقشہ اسے پرتگال سے ہاتھ لگا ہے۔ سو سال ہوے پرتگال کے مشہور امیر البحر ٹرسٹاڈ نے اسے تیار کیا تھا۔ افریقہ کا تمام ساحل ولندیزوں اور پرتگیزوں کے قبضہ میں ہے۔ لیکن بحر الہند کے جنوبی حصہ میں یہ عظیم الشان جزیرہ کسی کے قبضہ میں نہیں۔ گو اس جزیرہ کے اصلی حالات اور محل وقوع سے بہت کم لوگ واقف ہیں لیکن نقشے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پر اسرار جزیرہ موزنبیق سے مشرق کو واقع ہے۔ آج تک جو معلومات حاصل ہوے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں سونے اور جواہرات کی کانیں موجود ہیں۔ اگر بادشاہ سلامت اجازت دیں تو سمندری بیڑہ بھیجکر شاہ فرانس کے نام سے جزیرہ پر قبضہ کر لیا جائے۔

شاہ فرانس نے اجازت دے دی اور فرانس

کا سمندری بیڑہ اس جزیرہ کی تلاش میں نکل پڑا۔

اس واقعہ کے اڑھائی سو سال بعد یعنی ۱۸۹۵ء میں ایک دن انتانا ناریو دار الخلافہ مڈغاسکر کے باشندے علی الصبح باجوں اور ڈھول کی آواز سے بیدار ہوتے دیکھتے ہیں کہ شاہی محل پر شاہ فرانس کا جھنڈا لہرا رہا ہے اور شہر کے بازاروں میں فرانسیسی سپاہی بینڈ باجہ کے ساتھ مارچ کر رہے ہیں۔

باشندے تعجب سے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ فرانسیسی فوج کا جرنیل جوزف سائمن گیلینی فوجی وردی پہنے ہاتھ میں تلوار لئے شاہی محل کے سامنے گھوڑے سے اترا اور محل سے ایک نازک بدن عورت ریشمی لباس میں ملبوس چار سپاہیوں کی حراست میں محل سے باہر آئی۔ اس وقت گو مڈغاسکر کی اس بدنصیب ملکہ کے چہرہ سے روحانی صدمہ نظر آرہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں غرور اور خودداری سمائی ہوئی تھی۔

ملکہ فرانسیسی جرنیل سے کچھ فاصلہ پر آکر کھڑی ہو گئی۔ جرنیل آگے بڑھا اور فرانسیسی جمہوریت کیطرف سے یہ تحریری فرمان بلند آواز سے پڑھنے لگا:-

"فرانسیسی جمہوریت کے نام سے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ملکہ رانا ویلونا سوم تخت و تاج سے محروم کی گئی ہے اس کے بعد ملکہ مذکورہ یا دیگر ورثاء تخت کا مڈغاسکر کے تخت و تاج کے ساتھ کچھ واسطہ نہ ہوگا۔ مڈغاسکر کی خود مختار حکومت آج سے ختم ہے اور اب بہمہ دیگر مقبوضات کے فرانس کی نوآبادی تصوّر ہوگی۔ ملکہ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ جلد مڈغاسکر چھوڑ کر باہر چلی جائے اور تا حین حیات پھر یہاں قدم نہ رکھے"

ملکہ رانا ویلونا نے جرنیل کا یہ اعلان نہایت صبر و استقلال سے سنا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے لیکن زبان پر حرفِ شکایت نہ لائی اس دن سے اب تک مڈغاسکر فرانس کے قبضہ میں چلا آرہا ہے۔ (باقی پھر) —— (س۔ع۔ر)

قدیم اور جدید اخلاق

(۶)

برعکس اس کے مذہبی اخلاق میں جذبۂ محبت کو بہت وقعت حاصل ہے۔ کامل مذہبی انسان میں محبت اور عقل کی مکمل آمیزش ہوتی ہے۔ اس لئے مذہبی اخلاق فطری ہیں اور انسانی فطرت کو مدِنظر رکھکر وضع کئے گئے ہیں۔ گویا مذہب کا مکمل انسان حقیقت میں مکمل اور قابلِ قبول انسان ہے۔

فلسفۂ قوت میں نٹشے اسلامی فلسفۂ حیات کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن قوت کی قسم اور طریقۂ استعمال میں اختلاف ہے۔ اسلامی مذہبی فلسفۂ حیات مختصراً یہ ہے کہ مسلمان کے لئے مومن ہونا شرط اور مومن کے لئے عمل اور عمل بھی وہ جو انسان کو روحانی اور خداوندی طاقت بخشے۔ اسی خدائی طاقت کا حاصل کرنا مسلمان کا مقصد اولین ہے۔ گویا خدائی اصولوں کی مطابقت ہی درحقیقت رحمانی اور روحانی طاقت کا سرچشمہ ہے۔ لیکن نٹشے کے فلسفۂ حیات سے مراد صرف طاقت ہے۔ نٹشے کی طاقت حیوانی اور شیطانی ہے۔ کیونکہ یہ محبت اور روحانیت سے عاری ہے۔ برخلاف اس کے اسلامی طاقت بوجہ جذبۂ محبت رحمانی اور نورانی ہے۔ نٹشے کی تعلیم سے فوق البشر اور اسلامی تعلیم سے مردِ مومن پیدا ہوا۔ فوق البشر یعنی حیوانی اور شیطانی طاقت کا مجسمہ روحانیت سے عاری ہے۔ اس کی انسانیت نامکمل اور محتاجِ تکمیل۔ اس لئے وہ کامل انسان بننے سے رہا۔ جب فہم اور ادراک کو محبت اور عشق کی رفاقت حاصل نہ ہو۔ تو منزلِ مقصود سے ہمکنار ہونا ناممکن ہے۔ پس فوق البشر کی تخلیق غیر فطری ہے کیونکہ اس کے وجود میں بمقابلہ خیر کے شر کا پلّہ بھاری ہے اور اس لئے وہ دنیا کے لئے ایک تباہ کن قہر ہے۔

مردِ مومن رحمانی اور نورانی طاقت کا مجسمہ ہے۔ اس کا وجود باعث رحمت اور اس کی طاقت رحمانی ہے جب تک مردِ مومن خدا کی طاقت کا صحیح استعمال کر کے دنیا میں خدائی نظام قائم رکھتا ہے تو دنیا کی تہذیب و تمدن ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے۔ لیکن خداوندی اصول ترک کرنے اور مذہبی اخلاق چھوڑنے سے عارضی طور پر شیطانی طاقت کا برسرِ اقتدار آنا اور لوگوں کا معتوب ہونا ضروری ہے۔ لیکن تاریخ عالم سے بخوبی روشن ہے کہ شیطانی اخلاق اور حیوانی طاقت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتے کیونکہ دائمی طاقت صرف قوی اور ابدی اخلاق سے ہی حاصل ہوسکتی ہے جس کا دوسرا نام مذہبی

اخلاق ہے ۔ ان اخلاق سے انسان کا حیوانی جذبہ نشوونما نہیں پاتا بلکہ ان سے انسانیت کا جذبہ فروغ پاتا ہے ۔

یہ تو ظاہر ہے کہ وجود انسانی میں حیوانی جذبات کی افراط ہے ۔ مذہبی اخلاق آہستہ آہستہ ان جذبات کو انسانی بناتے رہتے ہیں لیکن نٹشے کے فلسفیانہ اخلاق یا موجودہ نسلی اخلاق انسان میں حیوانی جذبات کی پرورش کرتے ہیں ان اخلاق کی رو سے سچ اور جھوٹ میں تمیز کا معیار صرف طاقت ہے ۔ اور یہی حیوانی طاقت اور نظام نٹشے کے نزدیک سچائی کے مترادف بلکہ کار ثواب ہے ۔ کمزوری اس کے نزدیک ایک عیب بلکہ گناہ کبیرہ ہے ۔

مانا کہ بقول نٹشے اس کارگاہ عالم میں طاقت ایک بڑی حقیقت ہے لیکن مذہبی اعتبار سے صرف روحانی اخلاق ہی جائز ہیں ۔ حیوانی اور شیطانی طاقت میں نہ بھلائی ہے نہ دوام ۔ بلکہ یہ طاقت شر کا پیش خیمہ ۔ نئے فساد اور جھگڑوں کا منبع ۔ دائمی تباہی اور بربادی کا باعث ہے حقیقی امن ۔ دائمی خوشحالی ۔ صحیح ترقی تمدن صرف مذہبی اخلاق سے حاصل ہوسکتی ہیں ۔

الغرض مذہب ہی صحیح طاقت ہے دنیا کی نجات اس کی معاشرت اور تہذیب کی ترقی کا راز صرف مذہب ہی میں مضمر ہے گویا یہ صراط المستقیم ہے ۔

نٹشے کے فلسفہ قوت کا یہ اثر ہے کہ آج دنیا تباہی بربادی اور رنگارنگ انقلابات سے دوچار ہے ۔ حیوانی طاقت کا یہ تخریبی فلسفہ تہذیب انسانی کے لئے نہایت خطرناک اور انسانی ترقی میں بہت بڑی رکاوٹ ہے ۔

کمزور اور طاقتور کے درمیان یہی حیوانی اور شیطانی طاقت ایک فیصلہ کن امر ہے ۔ انسان کی تمام قوت اور علم اس شیطانی تباہ کن اور مردم آزار طاقت کے حاصل کرنے میں خرچ ہوتے رہے ہیں اور یہ اس لئے کہ اس خونی اور وحشی دنیا میں اقوام کی حیات ۔ غلبہ اور حکومت کا دارومدار زیادہ حد تک اسی حیوانی طاقت پر ہے ۔ دنیاوی مفاد حیوانی اور نفسانی خواہشات کا پورا کرنا ۔ عیش وعشرت اور آرام کی زندگی سب اسی حیوانی طاقت کی رہین منت ہیں اس لئے سب اقوام تہذیب اور ترقی کی خاطر حیوانی طاقت ہی کے دست نگر ہیں ۔ اسی لئے ہمیشہ صفحۂ ہستی پر میدان کارزار گرم رہتا ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان اور عالمگیر کشمکش کا حل کیا ہے ۔ ہر صحیح الدماغ انسان کے نزدیک اس پیچیدہ سوال کا خاطر خواہ اور فیصلہ کن حل صرف یہ ہوسکتا ہے کہ ہم سب مذہب کے اصولوں پر کاربند رہیں ۔ دنیا کی موجودہ پریشانی ۔ خونریزی اور لامذہبی کا علاج صرف مذہب کے سچے اور پاک اخلاق میں مل سکتا ہے ۔ نسل انسانی کی سچی ترقی اس دن سے شروع ہوگی جب اقوام اور افراد کے نزدیک مذہبی اخلاق اور اصول ایک فیصلہ کن چیز تسلیم ہوجاے ۔ خوش اخلاق ۔ صاف نیت اور مذہبی انسان برسر اقتدار آکر خدائی اخلاق کی ماہیت سے دنیا کو شناسا اور نیک عمل پر آمادہ کردیں ۔ حیوانی ،

بقیہ صـ۱۳

پندرہ روزہ رسالہ اُردو

آجکل
اُردو ایڈیشن
نن پرون

چندہ سالانہ تین روپیہ

قیمت فی پرچہ دو آنے (۲ر)

سال دوم	۲۵ نومبر سنہ ۱۹۴۲ء	فہرست	۱۵ ذیقعدہ سنہ ۱۳۶۱ھ	نمبر (۱۴)

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے:-

ایڈیٹر:- آجکل (نن پرون) ۱۵ راجپور روڈ دہلی

ندائے غیب!

نیندوں کے متوالو! جاگو
بھاگ رہی ہے دنیا ساری
خویش تمہارے، قوم تمہاری
تم بھی جاگو، تم بھی بھاگو

تن دزدی سے جان چھڑاؤ
ورنہ، تنہا رہ جاؤ گے
ہاتھ ملو گے، پچھتاؤ گے
آنکھیں کھولو، ہوش میں آؤ

عزم مصمم کر کے نکلو،
ارمانوں کو دل میں دبا کر
طوفانوں کو دل میں چھپا کر
ناکامی سے ڈر کے نکلو،

غفلت کے تاریک مکان سے
یوں نکلو، جیوں تیر کمان سے
اور میدان میں آجاؤ تم
اک دنیا پر چھا جاؤ تم

الطاف پرواز (ہزارہ)

شمالی افریقہ اور ممالکِ اسلامی
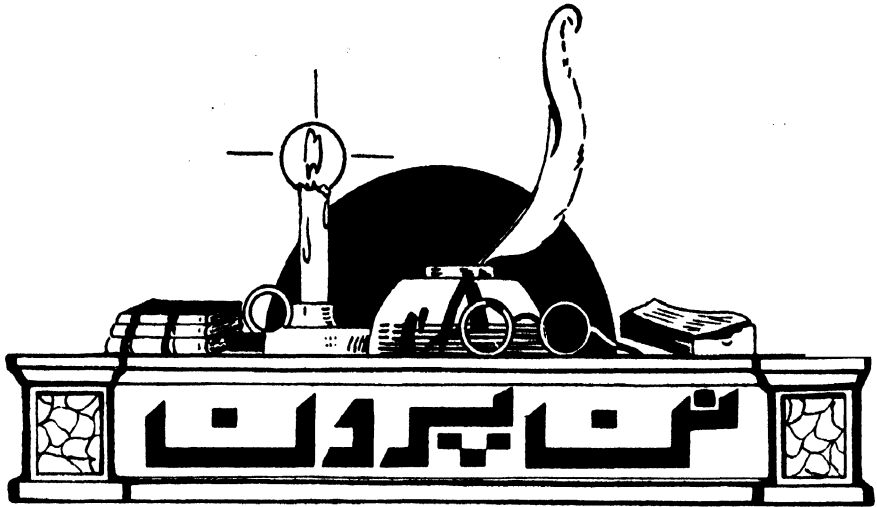
گو بڑی حد تک آج میں کل مُضمر ہوتی ہے اور واقعات حاضرہ سے واقعات آیندہ کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے تاہم حتی المقدور آنیوالے واقعات کے بارے میں رائے زنی کرنے سے ہم احتراز ہی کرتے رہے ہیں۔ بعض اوقات ہم سے بھی رہا نہیں جاتا تھا اور ہم یہ لکھ دیتے تھے کہ "ایسا ہو سکتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ محاذِ مصر کے بارہ میں چند موقعوں پر ہم نے یہ اظہار رائے کیا تھا کہ محوری سپاہ مصر میں بڑھنا تو چاہتی ہے لیکن اتحادی قوے نے اسے العالمین ہی پر روک رکھا ہے بلکہ قرائن سے پایا جاتا ہے کہ برطانیہ کا آٹھواں لشکر عنقریب ایک بہت زبردست دھاوا امارا چاہتا ہے۔

ہمارا خیال صحیح نکلا۔ اتحاد قوے محوری مورچوں پر یکایک پل پڑیں۔ محوری افواج میں ایسا افراتفری پڑی کہ فرار کے سوا کوئی چارہ نہ دیکھا۔ اتحادی قوے بھی انکے

پیچھے۔ چند دنوں ہی میں سینکڑوں میل لیبیا میں جا نکلیں۔ طبروق، سلوم۔ باردیا وغیرہ سب اتحادیوں کے ہاتھ آئے اور بن غازی بھی آیا کہ آیا۔ کیونکہ دشمن کے پاؤں ایسے اکھڑے ہیں کہ سنبھالے نہ سنبھل سکے۔ اٹھارہ دن میں اتحادی سپاہ تین سو میل بڑھ نکلی۔ یہی نہیں دشمن کے ستاون ہزار سپاہی گئے۔ ان میں کچھ مارے گئے کچھ گھائل ہوئے اور کچھ اسیر۔ بےشمار ٹینک، طیارے توپیں، بندوقیں اور دیگر سامان جنگ اتحادیوں کے ہاتھ آئے۔ جو تباہ ہوئے ان کا کہنا ہی کیا؟

مصری محاذ پر دشمن کی بھگدڑ اور بربادی اور اتحادیوں کی شاندار فتح بذات خود بہت ہمت افزا خبریں تھیں لیکن ان سے بھی زیادہ ہمت افزا خبر یہ آئی ہے کہ امریکن اور برطانوی افواج فرانسیسی شمالی افریقہ میں اچانک ہی آدھمکی ہیں۔ کوئی سان گمان ہی نہ تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کا ایسا عظیم الشان بیڑا جدید ترین اسلحہ جات سے مسلح ڈیڑھ لاکھ سپاہ شمالی افریقہ کے ساحل پر اتار دیگا۔ اور اتنے اہم شہروں، بندروں اور فوجی ٹھکانوں پر اتحادیوں کا آناً فاناً قبضہ ہو جائیگا۔

یہ سب کچھ چند دنوں کے اندر ہی ظہور میں آیا۔ بارہا خیال آتا ہے یہ کیا کا فرما جرائی ہے؟ حقیقت ہے کہ رویا؟ محوریوں کی حیرت اور سراسیمگی کا تو کیا ہی کہنا؟ انہوں کو پتا نہ تھا انہیں کیا پتہ چلتا۔ یہ واقعہ ناقابل فراموشی ہے۔ اور مشرق وسطیٰ کے حالات پر جو حیرت انگیز اثرات پڑے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

شمال مغربی افریقہ میں فرانس کی تین مستعمرات ہیں۔ مراقش، الجزائر، اور ٹیونسیا۔ جونہی اتحادی افواج فرانسیسی علاقوں میں اتریں حکومت وشی نے اپنی افواج کو حکم دیدیا کہ اتحادیوں کا مقابلہ کریں پہلے پہلے مقابلہ ہوا لیکن برائے نام۔ اب ان علاقوں کی فرانسیسی افواج اور باشندے ہر ممکن طریقہ سے اتحادی قوے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ بلکہ بڑھ بڑھ کے محوریوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان علاقوں میں زیادہ تر مسلمان ہی آباد ہیں۔ کبھی یہ علاقے اسلامی سلطنت کے جزو تھے۔ یہاں یہ ذکر کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ اتحادیوں کی یہ شاندار فتح ان اسلامی ممالک کیلئے ایک خوشنما مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

فرانس کے سقوط کے بعد محوریوں نے مصر پر چڑھائی کرنا چاہی لیکن جرنیل ویول نے پہل کر ڈالی۔ اور ۴۱-۱۹۴۰ء کی سردیوں میں ایسا کرارا وار کیا کہ شمالی افریقہ میں اطالوی اقتدار کے پرخچے اڑنے لگے۔ لاکھوں اطالوی اسیر ہوئے۔ برطانوی فوج بڑھتی گئی یہانتک کہ طرابلس کے پاس پہنچ گئی۔ افریقہ محوریوں سے پاک ہو گیا ہوتا۔ اگر وشی حکومت جرمنوں کو اثر میں اگر برطانیہ کی مزاحمت پر تل نہ گئی ہوتی۔ برطانیہ وشی حکومت سے بھی نپٹ لیتا۔ لیکن جرمنوں نے یونان

پر یلغار کر ڈالی۔ اور جرنیل ویول کو اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ یونان کی طرف بھیجنا پڑا۔ اتحادیوں کو مغربی صحرا میں کمزور پا کر جرنیل روّمل نے حملہ کر کے سارا کھویا ہوا علاقہ پھر ہتھیا لیا اور مصر اور مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک پھر خطرہ سے دوچار ہو گئے۔

مئی ۱۹۴۱ئہ سے مئی ۱۹۴۲ئہ تک کے واقعات کا تعلق زیادہ تر ابی سینیا سے ہے جو اسلامی نقطۂ نظر سے چنداں اہمیت نہیں رکھتے۔ اس لئے انہیں دہرانا ضروری نہیں۔ مئی ۱۹۴۲ئہ میں جرنیل روّمل پھر بڑھا۔ واقعات ایسے سازگار ہوتے گئے کہ روّمل کامگار رہا۔ طبروق میں اتحادیوں کو نیچا دیکھنا پڑا۔ محوری مصر میں بڑھ آئے اور اسکندریہ سے سات میل پرے ٹھہر گئے۔ اس کارزار میں اتحادی سخت خسارہ میں رہے۔ اس فتح کے نشہ میں جرمن لگے مارنے ڈینگیں۔ کہ سارا مصر، نہر سویز وغیرہ ہم نے لیا کہ لیا۔ برطانوی، ہندوستانی، آسٹریلوی اور نیوزی لینڈی افواج نے انہیں العالمین پر روکے رکھا۔ اور ساتھ ساتھ ایک عظیم الشان حملہ کی تیاریاں ہوتی رہیں۔ ان تیاریوں کی حقیقت اب کھلی۔ آٹھویں فوج نے ایک ہی وار میں محوریوں کو بن غازی تک مار بھگایا اور ادھر سے امریکن اور برطانوی افواج شمال مغربی افریقہ میں آ اتریں۔ چند ہی دن میں محوریوں کی بچی کھچی طاقت کا صفایا ہوا چاہتا ہے۔

گذشتہ تین سال کے واقعات سے عیاں ہے کہ برطانیہ اور امریکہ نے نہ صرف شمالی افریقہ میں اپنے قدم ہی جمائے رکھے بلکہ جان توڑ تیاریوں کے بعد دشمن کی طاقت پر بلا کی ضرب لگائی ہے۔ آج شمالی افریقہ میں متحدین کی برّی اور فضائی قوت محوریوں سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ دن دور نہیں جبکہ شمالی افریقہ اور مشرقِ وسطیٰ کے تمام اسلامی ممالک محوری خطرہ سے محفوظ ہو جائیں گے۔

مصر اور مغربی صحرا کی تازہ لڑائیوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ جب کبھی جرمنی نے فتح پائی تو اس لئے پائی کہ ان کی قوتے بہ لحاظِ تعداد اور اسلحہ زیادہ ہوتی تھیں۔ جہاں بھی قوتے برابر ہوئیں جرمن نہ ٹھیر سکے۔

یہاں یہ ذکر کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مغربی صحرا کی موجودہ مہم میں صوبہ سرحد کے افغان اور خاص کر آزاد قبائل کے نوجوان نہایت شجاعت اور تہوّر سے لڑے۔ انہوں نے افغانوں کی شہرت کو چار چاند لگائے۔ یہ شاندار فتح تمام افغانوں کے لئے باعثِ فخر ہے۔

شمالی افریقہ میں دشمن کے اکّے دُکّے منشینی

دستے مزاحمت کر رہے ہیں۔ لیکن کب تک؟ ہم بارہا اپنے اس عقیدہ کا اظہار کر چکے ہیں۔ کہ اتحادیوں کا شکست کھا کر مشرق وسطی سے نکل جانا محالات سے ہے اب ہم زیادہ وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ دن قریب ہے کہ محوری بحیرہ روم کے جنوبی ساحل سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہوں اور کروڑوں مسلمان محوری ظلم اور اسارت کے شکنجہ سے ہمیشہ کے لئے نجات پائیں انشاء اللہ۔

افغانستان کی عظمت

" افغانستان کے جوان سال اور روشن خیال حکمران اور اسکے بیدار مغز مدبرین مستحق تحسین و تبریک ہیں کہ انہوں نے موجودہ جنگ کی دوران میں انتہائی تدبر اور ہوشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ اس عالمگیر جنگ میں غیر جانبدار رہنا اور اس غیر جانبداری کو اس خوش اسلوبی سی نباہنا کہ طرفین میں کسی کو شکایت پیدا نہ ہو بہت بڑا کمال ہے۔ اور افغانستان نے اس کمال کا نہایت روشن ثبوت مہیا کر دیا ہے اور اس کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ قابل تعریف اور پائیدار فوائد کی حامل ہے وہ تعمیر ملت کا پروگرام ہے۔ جس پر افغانستان نہایت چستی اور مستعدی سی عمل پیرا ہو رہا ہے۔ زراعت، صنعت، تجارت، تعلیم، امور عامہ، فوج اقتصاد۔ غرض قومی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں افغانستان نے گذشتہ دس گیارہ برس کے اندر حیرت انگیز ترقی نہ کی ہو۔ اگرچہ جنگ کی وجہ سے بین الاقوامی رسل و رسائل کا سلسلہ بہت بڑی حد تک منقطع و مخدوش ہو رہا ہے اور یہ امر کسی ترقی کرنے والی قوم کے لئے کافی پریشان کن ہے۔ لیکن اس کے باوجود افغانستان وسائل حاصلہ سے بہ وجہ احسن مستفید ہو رہا ہے۔ اگر یہی رفتار چند سال اسی طرح جاری رہی تو ایشیا میں بہت کم ملک ہوں گے جو ہمہ گیر ترقیات میں افغانستان کا مقابلہ کر سکیں۔

ہماری دعا ہے کہ باریتعالی افغانستان کو مدت دراز تک بے خدشہ ترقی کا موقعہ عطا کرے اور اسے ہر قسم کی بیرونی اور اندرونی مشکلات سے محفوظ رکھے۔"

(روزنامہ انقلاب لاہور۔ ۵ر نومبر ۱۹۴۲ء)

ہم بھی اپنے محترم معاصر کے ہم خیال اور دست بدعا ہیں کہ افغانستان کی عظمت دن دونی رات چوگنی ہوتی رہے قارئین کرام یہ پڑھکر خوش ہوں گے کہ "آجکل" میں عنقریب ایک سلسلۂ مضامین شروع ہونیوالا ہے جنمیں افغانستان کی عظمت اور ہمہ گیر حیرت زا ترقیات کے کوائف مختصر لیکن محققانہ طور پر درج کئے جائیں گے۔

(ادارہ)

رفتارِ زمانہ

شمالی افریقہ :-

مصری محاذ کے نئے برطانوی کمانڈر جرنیل منٹگمری نے ۲۳ اکتوبر کو اپنی افواج کے نام ایک بڑا ہمت افزا پیغام بھیجا تھا۔ اس پیغام میں یہ الہامی فقرہ بھی تھا: "اگر ہم مل جل کے کام کریں تو جیسے ایک کرکٹ کا کھلاڑی گیند کو چھکا مارتا ہے اسی طرح ہم بھی جرمنوں اور اطالویوں کو چھکا مار کر افریقہ کی باونڈری کے باہر کر سکتے ہیں"۔ یہ پیشینگوئی بھی خوب پوری ہوئی۔ کیونکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جرمن اور اطالوی بیک بینی و دو گوش مصر اور لیبیا سے بھاگ رہے ہیں اور اتحادی فوجیں ٹیونیسیا کے سرحد پر پہنچ چکی ہیں اور ٹیونیسیا میں گھسیں کہ گھسیں۔ صحرا محوریوں کی لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔ محوری سپاہیوں کے پرے کے پرے پکڑ لئے گئے ہیں اور بے شمار ٹینک اور دیگر اسلحہ اتحادیوں کے ہاتھ آئے ہیں۔ بس انہی چیزوں سے "یادرفتگاں" باقی ہے۔ مسٹر چرچل نے صحیح فرمایا کہ یہ فتح اول درجہ کی ہے۔ آپ ہی نے مشرق وسطیٰ کا کمانڈ سارا کا سارا بدل ڈالا تھا اور انہیں تبدیلیوں کی برکت سے یہ شاندار فتح نصیب ہوئی۔ مسٹر چرچل اپنے انتخاب پر جتنا اترائیں بجا ہے۔

یہ "غیر مغلوب" جرمن آگے آگے اور اتحادی انکے پیچھے اس بھاگا بھاگ سے دنیا ابھی محو حیرت ہی تھی کہ اسے ایک اور خبر نے یکایک چونکا دیا۔ وہ یہ کہ برطانیہ اور امریکہ نے اپنی فوجیں فرانسیسی شمالی افریقہ کے ساحل پر اتار دیں اور وہ نہایت سرعت کیساتھ بڑھ رہی ہیں۔ اب تو ٹیونس (دارالحکومت) اور بیزرٹا (بندرگاہ) کے نزدیک پہنچ رہی ہیں۔ متحدین کا یہ منصوبہ بھی ایسے مکمل طور پر صیغۂ راز میں رہا اور تیاریاں بھی ایسی بلا کی کی گئیں کہ محوریوں کے ہوش ہرن ہوگئے اور انہیں ایسی افراتفری پڑگئی کہ پھر سنبھل ہی نہ سکے۔

متحدین کو یہ بھی خوب سوجھی۔ عملدرآمد بھی خوب ہوا۔ یہ مشترکہ مہم ہر لحاظ سے فن جنگ کا ایک حیرت انگیز کارنامہ سمجھی جائیگی۔ اب اٹلی پر اور بھی زیادہ کثرت سے اور زیادہ تباہ کن ہوائی چھاپے مار ی جاسکیں گے۔ یوگوسلوویکیہ کے ضلع کردشیہ میں اور نیز جزیرہ کارسیکا میں بغاوت کر جھنڈے لہرانے لگ گئے ہیں۔ خوب نظر آرہا ہے کہ اب اونٹ کس کل بیٹھتا ہے۔

روس :-

سٹالن گراد ۔ ٹواپسی ۔ نالچک کے محاذ پر لڑائی بدستور ہو رہی ہے ۔ روسی حسب معمول جوش اور استقلال کے ساتھ دشمن سے نپٹ رہے ہیں اور اسے جانی اور مالی نقصان پہنچا رہے ہیں ۔

شمالی افریقہ میں متحدین کو جو شاندار کامیابی حاصل ہوئی ہے اس سے سارے روسیوں کی ڈھارس بندھ گئی ہے ۔ ان کے قائد اعظم سٹالن نے متحدین کے اس کارنامہ کو بہت سراہا ہے ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اب یورپ کے حالات میں بنیادی تبدیلی ہو جائیگی اور محوری بھی ڈھیر ہو جائیں گے ۔

جزائر سلیمان :-

لڑائی جاری ہے ۔ جاپانی اس دھن میں ہیں کہ اپنے کھوئے ہوئے ٹھکانوں پر پھر سے قبضہ کرلیں ۔ ساتھ ہی یہ کوشش کر رہے ہیں کہ متحدین کی فوجوں کو جو جزیرہ گواڈل کنار کے ساحلی ٹھکانوں پر قبضہ جمائے بیٹھی ہیں کوئی رسد یا کمک نہ پہنچ پائے ۔

چین :-

ایک برٹش پارلیمنٹری مشن چنگکنگ پہنچ گیا ہے ۔ مارشل چیانگ کائیشک نے مشن کا خیر مقدم کیا ۔ اور اپنی تقریر میں دنیا کے "پارلیمنٹوں کی ماں"، یعنے برطانوی پارلیمنٹ کو خراج تحسین کیا اور یہ امید ظاہر کی کہ اس مشن کے آنے سے چین اور برطانیہ کے درمیان پہلے سے زیادہ حسن تفاہم اور تعاون ہونے لگے گا ۔

افغانستان :-

حال ہی میں حکومت افغانستان نے حکومت ہند سے ایک سو باربردار گاڑیاں، اور گھوڑوں کی (فوجی نمونہ کے) زین وغیرہ کے دو سو سٹ خریدے ہیں ۔ ۳۱ ۔ اکتوبر کو بمقام تورخم افغانستان کے مامورین نے گاڑیاں اور سازو سامان اپنی تحویل میں لے لئے ۔ گاڑیاں کھینچنے کیلئے کابل سے گھوڑے آئے تھے ۔ جب یہ گاڑیاں اور سازو سامان کابل پہنچ جائیں گے تو ایک افغان ٹرانسپورٹ کمپنی بنائی جائے گی ۔ افغانستان کی فوج کیلئے ایسی کمپنی پہلے کبھی نہیں بنی ۔

ترکی :-

گو ترکی کا محکمۂ سنسر بہت چوکنا رہا ہے تاہم محوری نامہ نگار بے تکی خبریں اڑاتے ہی رہے ہیں اب معلوم ہوتا ہے کہ ترکی حکومت تنگ آگئی ہے ۔ چنانچہ تازہ ترین اطلاعات سے پایا جاتا ہے کہ ترکی حکومت نے جاپانی اخبار نشی نشی کے نامہ نگار مقیم ترکی مسٹر اینو موتو کو ترکی سے نکال دیا ہے اس بنا پر کہ وہ سراسر جھوٹی اور سنسنی خیز خبریں بھیجتا رہا ہے ۔

لئون نے کہا :۔ اس بھیڑ بھاڑ میں موٹر چلانا دشوار ہے۔ بہتر یہ ہے موٹر یہیں چھوڑ پیدل ہولیں "
ناچار مہاجرین میں گڈ مڈ ہو گئے۔ اندھیرے میں چلنے سے بیحد کوفت ہو رہی تھی۔ لئون نے جہاں تک بس چلا ان کی امداد کی۔ میرین کو بھی اس رات کی سراسیمگی اور بیکلی ہمیشہ یاد رہیگی۔

یکایک ایک کڑی گرج سنائی دی۔ آسمان پر اجالا ہو گیا۔ ہوائی جہاز ہر آن نزدیک ہوتے جاتے تھے۔ ایک اور گرج اور بعد اس کے دھماکا! لئون چلایا :۔ " ارے! یہاں تو بم برسنے لگے! چلو کھائی میں" ایک کھائی میں گھس گئے اور مٹی کی دیوار کی آڑ لے لی۔ آس پاس بم گرتے اور پھٹتے تھے۔ عورتوں اور بچوں کی چیخ پکار سے وحشت اور بھی بڑھ رہی تھی۔ اچانک ان کے پاس ہی ایک سخت بھڑاکا ہوا۔ کوئی چیز میرین کے سر میں لگی اور وہ زمین پر گرتے ہی بیہوش ہو گئی۔

ہوش آئی تو اپنے آپ کو ایک ہسپتال میں پایا۔ چوٹ چنداں سخت نہ تھی۔ اتنے میں لئون نے اندر آ کر بتایا کہ اس کی ماں ایک دستی بم پھٹنے سے مر گئی میرین کا جی بھر آیا چاہتی تو تھی روئے چلّائے مگر ایک اندرونی قوت نے اسے یکایک روک دیا۔ وہ قوت کیا تھی؟ **جذبۂ انتقام!**
آخر کار بول اٹھی :۔ آہ میری بے گناہ ماں!
اے پاپی قاتلو!! فرانس ان حرکتوں سے دب بیٹھے! ہرگز نہیں ہو سکتا۔ نازی اپنے کئے کی سزا پا ہی کے رہینگے۔ فرانس کو بچانے کیلئے میں جان تک لڑا دوں گی

لئون :۔ سچ کہتی ہیں آپ!

میرین :۔ اور نہیں کیا جھوٹ کہتی ہوں؟ سب کچھ کر گذرونگی۔ بتلاؤ کیا کروں۔

لئون :۔ پیرس لوٹئے۔ وہاں ایک خفیہ جماعت نازیوں کے خلاف کام کر رہی ہے۔ اس میں ملجایئے۔ بس یہی کام ہے جو آپ کر سکتی ہیں۔

میرین پیرس لوٹی۔ اس جماعت میں جا ملی اور بڑے انہماک سے کام کرنے لگ گئی۔ پیرس سے اسے بورڈو بھیجا گیا۔ یہاں اپنے رفقائے کار سے ملی۔ اور ایک قہوہ خانہ میں پیانو بجانے کا کام اس کے سپرد ہؤا۔ اس پیانو کے اندر ریڈیو ٹرانسمٹر کا ایک سٹ چھپا رہتا تھا۔ جس سے ایک خاص مخفی کوڈ کے توسط سے انگلستان خبریں بھیجی جاتی تھیں۔ میرین جب پیانو بجاتی تو فرانس کی خبریں بھی متحدین کو پہنچا دیتی تھی۔

ایک رات جرمن گسٹاپو یعنی خفیہ پولیس کے چند اہلکار قہوہ خانہ میں آدھمکے۔ وہ "جورڈن" نامی ایک امریکن ہوا باز کی تلاش میں تھے جو انگریزوں کے ساتھ فرانس سے انگلستان لوٹ نہ پایا تھا۔ میرین پہلے ہی تاڑ گئی تھی۔ اس نے قہوہ خانہ والوں کو اطلاع دیدی۔ جورڈن کو جونہی پتہ چلا اٹھا اور لگا ایک لڑکی

کے ساتھ ناچنے۔ پیانو کے پاس پہنچا تو میرین نے چپکے سے اسے کہا "میرے کمرہ کی تلاشی لے چکے ہیں وہاں جا چھپو۔" جورڈن میرین کے کمرہ میں جا گھسا۔ گسٹاپو والوں نے بہت الٹ پھیر کئے۔ میفروش پر بھی بگڑے لیکن سب بے سود۔ آخر کار اپنا سا منہ لیکر چلدئے میرین اپنے کمرہ میں گئی۔ جورڈن نے بہت شکریہ ادا کیا۔ اسی ملاقات میں ایک دوسرے پر لٹو ہو گئے۔ خفیہ کمیٹی کے بعض افراد جورڈن سے کچھ بدگمان ہو گئے تھے اور اسے جرمن جاسوس سمجھنے لگے تھے۔ میرین اور جورڈن دونو صدر کمیٹی کے روبرو پیش کئے گئے۔ جورڈن اپنے آپ کو نازیوں کا مخالف تو ثابت کر سکا لیکن اس سے ان دونوں کا پورا چھٹکارا نہیں ہوا۔ میرین ایک خطرناک کام پر پیرس بھیجدی گئی۔ وہ خطرناک کام کیا تھا؟ اس پکڑ دھکڑ میں میرین کا پرانا یار اینڈرا فرانسیسی غداروں کیساتھ ملکے نازیوں کی امداد کرنے لگا تھا۔ جرمنوں نے ایک خفیہ معاہدہ بنایا تھا جسے وہ وشی حکومت پر مڑھنا چاہتے تھے اس معاہدہ کا مسودہ اینڈرا کے پاس تھا۔ میرین کو اس کام پر لگایا گیا کہ اپنے پرانے یار کے قبضہ میں سے وہ مسودہ اڑا لائے۔

میرین پیرس پہنچکر اینڈرا سے ملنے گئی۔ اینڈرا سمجھتا تھا کہ میرین اب بھی اس پر مرتی ہے یہ وہم وگمان بھی نہ تھا کہ وہ نازیوں کی مخالف خفیہ کمیٹی کی کارکن ہے۔ چنانچہ اس نے میرین سے خواہش کی کہ اس سے بیاہ کرے اور فرانسیسی غدّاروں کی جماعت میں داخل ہو جائے۔ میرین کو اپنا کام نکالنا تھا۔ فوراً مان گئی لیکن بیاہ کل پر ٹالا۔ اُدھر اینڈرا خوش خوش نکلا کہ بیاہ کا بندوبست کرے۔ اِدھر میرین نے سارا گھر چھان مارا مگر مسودہ نہ ملا۔ ایک مقفل بکس پڑا تھا۔ میرین نے سوچا ہو نہو اسی میں ہوگا۔ بہتیرے جتن کئے نہ کھلا۔ اپنے نازک ہاتھوں سے زور آزمائی کر ہی رہی تھی کہ پاؤں کی آہٹ سنی۔

اینڈرا لوٹ آیا۔ بیاہ کل ٹھیرا ہی تھا۔ میرین نے سویرے ہی آنے کا وعدہ کیا۔ نہ کرتی کیا کرتی؟ جیسے بھی ہو مسودہ اڑانا چاہیئے۔

سویرے ہی پہنچی۔ اینڈرا لگا اس کے ہاتھ چومنے۔ دیکھا انگلیاں گھایل ہیں۔ "ہیں! یہ یہ زخم کیسے؟" میرین لگی ٹال مٹول کرنے۔ اینڈرا سوچ میں پڑ گیا یہ تو وہ کل ہی تاڑ گیا تھا کہ کسی نے بکس کھولنے کی کوشش کی ہے۔ مگر میرین پر شبہ نہ تھا۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ میرین ہی کا کام تھا۔ آپے سے باہر ہو گیا۔

"ابھی ابھی پولیس کو بلاتا ہوں اور تمہیں ان کے حوالہ کرتا ہوں۔" میرین سمجھی کہ کام بگڑا لیکہ بگڑا۔ فوراً اپنا ریوالور نکالکر اینڈرا پر چلانا چاہی

تھی کہ اینڈرا اس کی جانب جھپٹا۔ اسی کھینچا تانی میں ریوالور چل گیا۔ اینڈرا کا پاؤں زخمی ہؤا۔ اور وہ زمین پر گر پڑا۔ میرین بکس اٹھا بورڈ دوچلدی۔ جرمن پولیس اس کے پیچھے ہے۔

اس عرصہ میں جورڈن میرین کے ہجر میں دیوانہ ہوچلا تھا۔ اس کا راز بھی طشت از بام ہوگیا۔ پولیس کو اس کی بھی تلاش تھی۔

قہوہ خانہ کو پولیس نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جورڈن اور میرین سمجھ گئے کہ اب بچنا محال ہے۔ بے بس ہوکر ہر طرح کے تشدد اور ایذا سہنے کے لئے تیار ہو رہے تھے اتنے میں گولی چلنے کی آواز آئی۔ قہوہ خانہ کے کواڑ کھلے اور برطانوی سپاہیوں کا ایک دستہ اندر داخل ہؤا انہوں نے سمندر سے حملہ کرڈالا تھا۔ پولیس کافور ہوئی۔ برطانوی سپاہیوں نے عین موقعہ پر پہنچ کر ان دونوں شیدائیوں کو بچالیا اور اپنے ساتھ انگلستان لے گئے۔

(م ۔ی۔ د)

(بقایا از ۲۱ صفحہ)

کتاب کے اوپر پھینک کر تمہارے جیب میں جو کچھ ہو جھاڑنے کی کوشش کریگا اور کہیگا وہ خانصاحب تمہاری گھات میں ایک دشمن بیٹھا ہوا ہے۔ ایک روپیہ عنایت کیجئے تو اس کا نام بھی بتادوں۔" ایک روپیہ وصول کرکے پھر تم سے تیغ بندی تعویذ لینے کیلئے کہیگا۔ جس کا شکرانہ پانچ روپیہ بتائیگا اور کہیگا کہ اس تعویذ کے ہوتے ہوئے تلوار اور بندوق اثر نہیں کرسکتیں۔

بازار کے ایک کونے پر ایک شخص پتھر کا کوئلہ "لنگری" میں کوٹ کر سرسوں کے تیل کے چھینٹیں دے رہا تھا میں حیران کھڑا اُسکی ماہیت معلوم کرنے کو تھا ہی کہ ایک سادہ لوح دیہاتی آیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کوئلہ کوٹنے والے نے ایک چھوٹی چھڑی لی جسکے دونوں سرے ذرا باریک تھے۔ اس عجیب چھڑی کو "لنگری" میں ذرا ہلاکر دیہاتی کے آنکھوں میں پھیر دیا۔ میں نے دل میں کہا کہ وہ آنکھیں نکال چلا ہے۔ دیہاتی فوراً آنکھیں بند کرکے سر ہاتھوں میں دباکر بیٹھ گیا۔ کوئلہ لگانے والے نے کہا کہ کچھ فکر کی بات نہیں تمام گندا اور خراب پانی آنکھوں سے باہر نکل آئیگا۔ کیونکہ یہ بالکل تازہ سُرمہ ہے۔ اس کے بعد پھر گلا ٹھیک کرکے اور منہ کھول کھول کر بلند آواز سے یہ کہنے لگ گیا:۔

"دلدار گڑئی رابخہ واخلہ کجل او مرخم دی"

(دلدار گڑھی کا سُرمہ خریدلو یہ کجل اور مرہم ہے۔)

(سید فرید اللہ)

بی۔اے۔

مدغاسکر

۳

فرانس ۱۸۹۶ء سے مدغاسکر پر قابض چلا آرہا ہے۔ اس عرصہ میں فرانس نے اس کو شاہراہ ترقی پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی نئی تہذیب سے آشنا کر دیا۔ رہن سہن کے طریقوں میں بڑی حد تک اصلاح کر ڈالی باوجود اس کے چند بڑے بڑے شہروں اور بندرگاہوں کے سوا سارے جنوبی اور وسطی حصوں میں وہی پرانا رنگ جما ہوا ہے۔ بات یہ ہے کہ بعض جغرافیائی حالات اور وسایل آمدورفت کی کمی اسکی ترقی میں حائل رہے ہیں۔

سطح کے لحاظ سے مدغاسکر کے دو حصے کئے جاسکتے ہیں۔ درمیانی اور ساحلی۔ درمیانی حصہ بہت مرتفع ہے اور شمال سے جنوب تک چلا گیا ہے۔ اس میں پہاڑ، جنگل اور آبشاریں سرسبز اور زرخیز وادیاں اور دیگر دلکش مناظر بکثرت ہیں۔ اس کی مغرب مشرق اور شرق شمالی میں سمندر کے کنارے وسیع اور زرخیز میدان ہیں۔ آبادی کا بیشتر حصہ خاصکر نوآبادکاروں کا طبقہ انہیں میدانوں اور درمیانی حصہ میں پایا جاتا ہے۔ دریاؤں میں سب سے بڑا بیٹیبو کا ہے۔ جو خوشنما وادیوں اور قابلدید مناظر میں سے ہوتا ہوا سمندر میں جا گرتا ہے۔

سال بھر جا کے انگلینڈ میں دیکھا جا کر
سر سید کو بھی وہ اک ایسا ہی مسلمان نکلا
میں نے سمجھا تھا مسلماں یہاں آ کم ہیں مگر
عیسیٰ کو ان لوگوں میں مسلماں ہی نکلا

آب وہوا کے لحاظ سارا مدغاسکر خاصکر اس کا مشرقی ساحل بہت مرطوب ہے۔ موسمی بخار عام ہے۔ البتہ درمیانی علاقہ کی آب وہوا معتدل ہے۔ یورپین خاصکر فرانسیسی نوآبادکار

لیکن وہ چالاک باوجود اپنی بہت مختصر تعلیم کے تعزیرات ہند کے تمام دفعات سے باخبر رہا اور کبھی حد سے نہ بڑھا۔ البتہ قسم دوم کو آپ ہمیشہ بر سرپیکار دیکھیں گے۔

سیاح کو چاہئے کہ وہ اپنی سیر کابلی مورچہ سے شروع کرے اُسے سب سے پہلے ایک پولیس کا سپاہی سفید لمبی آستینیں زیب تن کئے ہوئے سڑک کے درمیان اس فوجی مورچہ میں کھڑا مختلف قسم کے اشارات کرتا ہوا دکھائی دیگا۔ ان اشارات کے ظاہراً کچھ بھی معنے آپ لیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان سے مقصود صرف دیہاتی باشندوں کو ڈرانا ہے تاکہ وہ شہر میں قدم نہ رکھیں۔ لیکن دیہاتی بھائیوں سے التماس ہے کہ ان اشارات کو نظر میں نہ لاکر سیدھے بازار میں داخل ہوں۔

اس بازار میں سخت جاڑے میں بھی بہت عمدہ اور ٹھنڈا فالودہ بکتا ہے۔ دوکاندار زور سے چلاتے ہیں "غراغرو اوڑے داخلہ ما گلہ غراغرو اوڑے" (پہاڑ کی برف لو ما جی پہاڑ کی برف) فالودہ بیچنے والوں کو حقیقت میں پشاوری ڈاکٹروں سے تنخواہ ملتی ہے۔ انہیں دوکانداروں کی بدولت پشاور میں مرض نمونیا عام ہوتا ہے۔ دیہاتی فالودہ نگلتے ہی ڈاکٹر کا پتہ پوچھتے ہیں اور لبسا اوقات فالودہ کھاتے وقت خود دوکاندار ہی باتوں باتوں میں اچھے ڈاکٹر کا پتہ دیدیتے ہیں۔

دوسری جانب بازار ٹھٹیگران ہے۔ ان دوکانوں میں شب و روز برتن بنانے کی آواز آتی ہے۔ لیکن رائیٹر اور ایسوشی ایٹڈ پریس کا نمائندہ اس خبر کا ذمہ دار ہے کہ یہ دوکاندار آجکل توپیں بنانے میں مشغول ہیں اور اسوجہ سے برتن مہنگے ہوتے جا رہے ہیں۔

قصہ خوانی میں سارے بھکاری ایک لمبی قطار میں بیٹھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تقریباً ہر ایک کی ایک ایک ٹانگ ندارد۔ اپنی ایک ٹانگ دکھا کر راہگذر کو پیسہ دینے پر مجبور کردیتے ہیں۔ ایکدن کا ذکر ہے میں ایک فقیر سے اس کی ایک ٹانگ نہ ہونے پر اظہار ہمدردی کر رہا تھا کہ سامنے ایک موٹر کا تانگہ سے تصادم ہوا۔ فقیر مجھ سے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ میں نے جب تحقیقات کی تو وہ حقیقت میں لنگڑا نہیں تھا بلکہ دوسری ٹانگ یوں ہی باندھ رکھی تھی۔ مزید تفتیش سے معلوم ہوا کہ پشاور میں کسی پوشیدہ جگہ پر فن گداگری سیکھنے کا کالج بھی قائم ہے اور یہ آدمی غالباً اسی کالج کا گریجویٹ تھا۔

میوہ جات فروخت کرنے کی خاص دوکانیں ہیں۔ یہاں جاکر انسان یوں سمجھتا ہے کہ دنیا بھر کے میوے یہاں لا رکھے گئے ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں۔ ایک دو ٹوکریوں میں ناشپاتیاں ہوتی ہیں جنکو رنگدار کاغذ میں ملفوف کردیتے ہیں چاروں طرف آئینوں میں انکے عکس پڑنے سے انسان سمجھتا ہے کہ دوکان بھری پڑی ہے۔ دوکان کی سجاوٹ خوب ہوتی ہے لیکن کہتے ہیں کہ یہ دوکاندار مٹی کے بنے ہوئے مصنوعی میوے بھی دوکان میں رکھے ہوئے ہیں۔

قصہ خوانی کا نجومی بھی ایک عجیب ہستی ہے۔ پاؤں کر بل زمین پر بیٹھا رہتا ہے ایک پرانی کتاب اور ایک زر و زنجیر پاس رکھتا ہے۔ آپ کو دیکھکر کہیگا: خانصاحب اپنی قسمت دیکھتے جا۔ ایک پیسہ اُس کے نذر کرنے پر وہ وہی زنجیر یا نصیب پیما،

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

فیلڈ مارشل سمٹس

آپ نہ صرف برّاعظم افریقہ کی سب سے بڑی اور دلچسپ ہستی ہیں بلکہ اس صدی کے شروع ہی سے آپکا دنیا کی سب سے زیادہ معروف اور اہم شخصیتوں میں شمار رہا ہے آجکل سب سے اعلیٰ فوجی رتبہ فیلڈ مارشل کا ہے مستعمرات برطانیہ کے باشندوں میں آپ پہلے فرد ہیں جو سلطنت برطانیہ کے فیلڈ مارشل مقرر ہوئے اور امپیریل وار کیبنٹ میں بحیثیت رکن کے شامل ہوئے۔ آپ سب سے پہلے شخص ہیں جو بہ یک وقت جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم اور وزیر دفاع قرار پائے۔ آپ مستعمرات برطانیہ کے پہلے باشندہ ہیں جس نے برطانوی دارالامراء اور دارالعوام کے خاص مشترکہ اجلاس میں اس بین المللی لڑائی کے موضوع پر تقریر کی۔ بہتّر برس کا آپ کا سن ہے، اس وقت بھی آپ جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم، وزیر دفاع، وزیر خارجہ، کمانڈر انچیف، وار کیبنٹ اور سپلائی بورڈ کے صدر اور اتحادی پارٹی کے لیڈر ہیں جنوبی افریقہ کے ایک دہقان کا بیٹا ایسی بین الاقوامی اہمیت اور ایسی عالمگیر شہرت پائے! محض اسی بات سے قیاس ہو سکتا ہے کہ قدرت نے اس مرد فرید میں کچھ خاص قوتیں اور خوبیاں ودیعت کی ہیں اور یہ طولانی اور درخشاں زندگی اپنے دامن میں بہت سے اہم واقعات اور گوناگوں دلچسپیاں لئے ہے۔ اس مقالہ کی گنجائش کے پیش نظر اس برگزیدہ ہستی کے چیدہ چیدہ سوانح حیات اور اس کے خلقی خصائص بطور اجمال ہی بیان کئے جا سکتے ہیں۔

آپ ۱۸۷۰ء میں جنوبی افریقہ میں موضع مامزبری کے پاس پیدا ہوئے۔ بچپن میں بہت لاغر اور شرمیلے تھے دس برس کے سن تک سکول ہی نہیں گئے۔ پاس کے گاؤں میں کچھ عرصہ پڑھے تو یہ حقیقت کھلی کہ آپ کو مطالعہ کا بیحد شوق ہے۔ سکول ہی میں نصاب کے علاوہ اور بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ مزاج میں متانت تھی۔ تنہائی کی عادت تھی۔ سکول کا آخری امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا اور وکٹوریہ کالج (سٹیلین بوش) میں داخل ہوگئے۔ وہاں بھی ذوق اور محنت کا یہی عالم رہا ادبیات اور سائنس آپ کے مضامین تھے۔ پاس ہوئے تو قانون پڑھنا شروع کر دیا۔ اسی عرصہ میں ایک خاص امتحان میں ایسا امتیاز پایا کہ کیمبرج یونیورسٹی

میں مزید تعلیم حاصل کرنے کیلئے آپ کو ایک خاص وظیفہ
ملا۔ کیمبرج میں قانون کے امتحان میں دو مضامین میں
اول رہے۔ کرائسٹ کالج کیمبرج میں پروفیسری ملتی تھی
لیکن آپ وطن لوٹ گئے۔

واپسی پر کیپ ٹاؤن کی عدالت عالیہ میں بیرسٹری
شروع کی۔ کام چمک اٹھا۔ سیاسیات میں نام نکلا۔
۱۸۹۸ء میں آپ جمہوریت ٹرانسوال کے اٹارنی جنرل
مقرر ہوئے۔ اس وقت آپ انتیس برس کے تھے۔ سال
بعد ہی "جنگ بوئر" شروع ہوگئی۔ آپ فوج میں بھرتی
ہوگئے۔ اور جرنیل کی حیثیت سے انگریزوں کے خلاف لڑتے
رہے اور اپنی ذاتی شجاعت بلکہ تمرد کے بہت سے ثبوت
دئے۔ اس لڑائی کے بعد صلح کانفرنس میں جنوبی افریقہ
کی آپ نے نمایندگی کی۔

پھر سیاسیات میں پڑگئے۔ جرنیل بوتھا وزیر اعظم
ٹرانسول کیساتھ گہری دوستی ہوگئی۔ صلح کے دو سال
بعد جب سر ہنری کیمبل بنیرمین وزیر اعظم برطانیہ ہوئے
تو آپ انگلستان گئے اور ٹرانسوال کو مکمل خود مختارانہ
حکومت ملجانے کا مژدہ لیکر لوٹے۔ اور جو منافرت انگریزوں
اور بوئروں میں چلی آتی تھی اسے مٹانے میں بڑی خلاقی
جرأت دکھائی۔ اس وقت جنوبی افریقہ میں چار
خود مختار حکومتیں تھیں۔ ۱۹۰۸ء میں باہمی مشاورت
سے یہ چاروں حکومتیں "اتحاد جنوبی افریقہ" میں ملگئیں
اس شاندار کارنامہ میں آپ کا نمایاں حصہ رہا۔ اِس
اتحادی حکومت میں جرنیل بوتھا وزیر اعظم اور
آپ وزیر مالیات مقرر ہوئے۔

گذشتہ عالمگیر جنگ میں آپ برطانوی فوج
میں لفٹننٹ جنرل مقرر ہوگئے۔ اور جرمن مشرقی افریقہ
کی مہم کی کمان انہیں ملی۔ ۱۹۱۷ء میں امپیریل وار
کانفرس میں شرکت کرنے کیلئے لندن بلائے گئے اور
مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم نے انہیں وار کیبنیٹ میں
شامل کرلیا۔ اس بینظیر اعزاز پر اُن دنوں بہت لے دے
ہوئی تھی۔ اس دوران میں آپ مختلف محاذات جنگ
پر گئے۔ متارکۂ جنگ کے بعد جرنیل بوتھا کے ساتھ
پیرس کی صلح کانفرنس میں شریک ہوئے۔ لیکن
معاہدۂ ورسائے سے بہت مایوس اور دل شکستہ ہوگئے
بعد میں اس معاہدہ پر ایک تنقیدی رپورٹ لکھی جسمیں
بڑی صاف گوئی اور جسارت سے کام لیا۔ اس کے بعد
جمعیت بین الاقوامی کو کامیاب بنانے کی دھن میں
لگ گئے۔

تھوڑے عرصہ بعد جرنیل بوتھانے وفات پائی
اور آپ جنوبی افریقہ کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔
یہ زمانہ آپکی تعمیری مصروفیتوں کا تھا۔ اسی درمیان
میں آپ امپیریل کانفرنس میں شرکت کیلئے لندن گئے
اُن دنوں "سین فین" پارٹی نے آئرلینڈ میں دھما
چوکڑی مچھا رکھی تھی۔ آپ کی کوشش سے آئرلینڈ اور
حکومت برطانیہ میں عارضی صلح ہوگئی۔

۱۹۲۴ء میں آپ کی کیبنٹ نے استعفیٰ دیدیا۔ اور عام انتخابات میں آپ کی پارٹی نے شکست کھائی۔ جرنیل ہرٹزوگ آپ کی جگہ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ اسکے بعد آپ ایک حد تک خانہ نشین ہو گئے۔ کیمبرج کے زمانہ میں آپ کو ایک متعلّمہ سے محبت ہو گئی تھی۔ دس برس بعد اسی سے شادی کر لی تھی۔ اب اپنے بال بچوں سمیت تنہائی اور آرام کی زندگی بسر کرنے لگے۔ اس عرصہ میں آپنے مسئلۂ ارتقاء پر ایک فلسفیانہ کتاب لکھی۔ ۱۹۲۹ء کے عام انتخابات میں بھی آپکی پارٹی کو اکثریت حاصل نہ ہوسکی آپ انگلستان اور شمالی امریکہ کے سیاحت کیلئے نکلے۔ قصر سینڈ رنگھم میں اعلیحضرت ملک معظم کے مہمان رہے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں لکچر دئے اور "ڈاکٹر آف سول لا" کی ڈگری پائی۔ ایڈنبرا۔ گلاسکو اور کیمبرج میں بھی تقریریں کیں۔ سکاٹ لینڈ کی سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی کے "لارڈ ریکٹر" چنے گئے۔ لنڈن اور بہت سی اور برطانوی بلدیات نے ان کی خدمت میں سپاسنامے پیش کئے۔ امریکہ میں پریذیڈنٹ ہُوور کے یہاں مہمان رہے۔ وہاں سے وطن لوٹے۔

پھر انگلستان جانا پڑا۔ برٹش ایسوسی ایشن کی صدسالہ سالگرہ تھی۔ دنیا کے پانسو نامور سائینسدان شریک تھے۔ اس سالگرہ کے موقعہ پر آپنے صدارت کے فرائض ادا کئے۔ اس اعزاز کو آپ اپنی عمر کا انتہائی عروج سمجھتے تھے۔ ۱۹۳۲ء میں جرنیل ہرٹزوگ کا اقتدار گھٹنے لگا۔ ملک کے مفاد کے پیش نظر آپ نے اس سے صلح کر لی۔ ۱۹۳۳ء کے عام انتخابات میں دونو کامیاب ہو گئے۔ ۱۹۳۹ء تک دونو ملکر حکومت چلاتے رہے۔ جب موجودہ جنگ چھڑی تو جرنیل ہرٹزوگ چاہتا

معصومیتِ شباب

الغرض فلسفۂ ذوق جوانی یہ ہے
کہ جوانی نہ لٹائی جائے
مئے پارینہ کی خوبی کی نشانی یہ ہے
مدّتوں تک وہ چھپائی جائے
عصمت اور اُس کے مظاہر کی کہانی یہ ہے
شاعروں کو نہ سُنائی جائے
مذہب شعر کی الہامی نشانی یہ ہے
معصیت خوب بڑھائی جائے

(ملخاکر شباکرانی)

تھا۔ کہ جنوبی افریقہ غیر جانبدار رہے اور آپ چاہتے تھے
کہ برطانیہ کا ساتھ دے۔ اس کشمکش میں جرنیل ہرٹزوگ
ناکام رہا اور آپ بڑی اکثریت کے ساتھ وزیراعظم ہو گئے۔
ہوتے ہی جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر کے جرمن سفیر کو
چلتا کیا۔

آپ متحدین کی امداد میں پوری تن دہی سے مصروف
ہیں۔ برّی بحری اور فضائی قوے میں نمایاں اضافہ ہو چکا
ہے۔ جنوبی افریقہ کی طبعی استعدادیں وسیع پیمانہ
پر کام میں لائی جا رہی ہیں۔ آپ کی دو لڑکیاں جنوبی
افریقہ میں فوجی خدمت پر مامور ہیں۔ آپ کا ایک لڑکا
لیبیا کے محاذ میں لڑ رہا ہے۔

قدرت نے آپ کو غیر معمولی دماغ اور حافظہ بخشا ہے
اس پر طرّہ یہ کہ محنت و مشقت کا نادر مادہ بڑھاپے میں
اتنا ہی موجود ہے جتنا جوانی میں تھا۔ آپ کی اس حیرت
انگیز ترقی کی ایک وجہ آپکی فصاحت ہے۔ الفاظ نپے
تُلے۔ اندازِ ادا متین اور دلپذیر۔ آواز اونچی اور رسیلی۔
یہ محاسن بیان بڑے اہم اور نازک موقعوں پر کام
آتے رہے ہیں۔

اس وقت آپ بہترویں برس میں ہیں مگر لگتے
پچاس ہی کے ہیں۔ چشم بد دور، صحت ایسی کہ جوانوں
کو بھی رشک آئے۔ کیوں نہ ہو۔ ساری عمر جفاکشی میں کٹی
تن آسانی کبھی پاس نہیں پھٹکی۔ اب بھی صبح سویرے
گھوڑے کی سواری کرتے ہیں۔ دن میں بارہ گھنٹے تو ضرور
کام کرتے ہیں۔ کبھی جنوبی افریقہ میں ہیں کبھی شمالی افریقہ
میں۔ آج کل انگلستان میں۔ کسی صعوبت سے گریز نہیں
اس کے علاوہ طرز زندگی نہایت سادہ۔ انگریزی فیلسوف
کارلائل کی رائے میں نبوغ (GENIUS) ان تھک
محنت کا دوسرا نام ہے۔ اس لحاظ سے تو فیلڈ مارشل
سمٹس نے زمرۂ نابغان میں خاص پایہ پایا ہے۔

دنیا میں ایسے بشر کم پائے گئے ہیں جو بیک وقت اہل سیف
بھی ہوں اور اہل قلم بھی۔ یہاں بیرسٹری کرتے کرتے جرنیل بن گئے
لڑائی نہ رہی تو قلمدان وزارت سنبھال لیا۔ دینداری، سادگی
جفاکشی، سپاہگری، ادب، تحریر، تقریر، حب وطن، بلند آہنگ
بصیرت، تعمیری تدبّر، ان سب قوتوں اور خوبیوں نے جنوبی افریقہ
کے ایک گمنام کسان کے بیٹے کو آسمان فکر و عمل کا ایک ضیا بار
ستارہ بنا دیا ہے۔

(م-ی-د)

(بقایا از ۱۱ صفحہ)

اُردو رسالے پڑھ نہیں سکتے۔

بہتر ہوگا کہ نن پرون میں عورتوں کے فائدہ کیلئے
ایسے مضامین مثلاً تربیت اولاد، سینے پرونے کے نئے اصول
گھر کی صفائی پر مضامین لکھے جائیں اور مردوں کے فائدہ کیلئے
زراعت، احکام خدا و رسول، ہمسایہ اقوام یا راعی اور رعایا کا
باہمی سلوک وغیرہ وغیرہ موضوعات پر مضمون لکھے جائیں۔

بر رسولاں بلاغ باشد و بس

(ملخوذ)

اِتحادِ افغان

از جناب محترم مولانا عبدالقادر خان صاحب - ایم - اے - ایل ایل - بی (علیگ)

مجھے انتہائی مسرت ہے کہ مجھے آج ایک ایسے موضوع کے متعلق اپنے خیالات اور جذبات کے اظہار کا موقع ملا جو میرے نزدیک ہر صاحب نظر افغان کا چاہیے وہ دنیا کے کسی حصہ میں ہو نصب العین ہونا چاہیئے - گذشتہ سو ڈیڑھ سو سال کی تاریخ ملل ونحل کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جذبۂ قومیت کے احیاء سے پسماندہ اقوام زندہ قومیں بن گئیں اور ترقی یافتہ اقوام ارتقا کے بلندترین مقامات پر پہنچ گئیں - اسوقت شاید ہی دنیا کا کوئی ایسا حصہ ہو جہاں قومیت کا جذبہ کسی نہ کسی صورت میں موجود نہ ہو - افریقہ کے حبشی اور امریکہ کے ریڈ انڈین بھی غالباً بحیثیت ایک قوم کے اپنے اجتماعی بہبودی کے متلاشی ہیں - اسلئے ہر متمدن ملت ضرور کسی نہ کسی صورت میں اس جذبہ کو اپنی ملی حیات اور ارتقا کیلئے ضروری سمجھتی ہیں - اور اپنے ماحول اور ضروریات کو مدنظر رکھکر اس نصب العین تک پہنچنے کیلئے مختلف طریقے اور نظریئے وضع کرتی ہے -

بعض اقوام نے تو جذبۂ قومیت کو مذہب سے بھی مقدم رکھا ہے مگر یہاں میرا مقصد انکے متعلق اظہار رائے کرنا نہیں اور نہ ہی میں ان اسلامی ممالک کا ذکر دُھرانا چاہتا ہوں جہاں "پان اسلامزم" کی جگہ "پان تورانزم" نے لے لی تھی اور پھر اسکے بعد ہوتے ہوتے یہ تمام "اِزمز" یا نظریات غائب ہوگئے، اور صرف مغربی اقوام کے نظریۂ افادیت پر مبنی ایک جذبۂ قومیت معرض وجود میں آیا - جسکی مثالیں ترکی اور ایران موجود ہیں - شاید عربوں میں بھی جذبہ "پان اریبینزم" موجود ہو لیکن اسلام کی عالمگیریت کا تصور عربی دماغ پر ایسا چھایا ہوا ہے کہ وہاں سوائے اس تصور کے جو "کافۃ الناس" کیلئے ہو دوسرا تصور نشوونما نہیں پا سکتا - سید جمال الدین افغانی ترکی میں تو "پان اسلامزم" کی تعلیم کسی حد تک پھیلا گئے - لیکن عرب ممالک میں انکی یہ تحریک اس پیرائے میں کامیاب ہو سکی -

اب سوال یہ ہے کہ کوئی ایسا خیال جسکو ہم "پان افغانزم" کے لفظ سے تعبیر کرسکیں قوم افاغنہ کے اندر مقبول ہو سکیگا یا نہیں میرے بعض دوست جن سے اکثر اس موضوع پر بحث رہتی ہے تو صاف کہدیتے ہیں کہ ملت افغان کی تاریخ میں وحدت ملت کا تصور نہ کہیں پایا گیا ہے اور نہ ہی آیندہ امید ہو سکتی ہے - زیادہ سے زیادہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب کبھی لشکر کشی کا موقع آیا ہے، قوم افغان نے ہتھیار اُٹھاکر فتحیابیاں ضرور حاصل کیں ہیں - لیکن جب یہ مرحلہ طے ہوا تو اسکے بعد منظم طریقے سے حکومت کرنیکا جذبہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا - اسلئے ایسی قوم کے اندر جسکے ملی عنعنات ہی یہ ثابت کرتے ہیں کہ انکے درمیان وحدت کا تصور کبھی پھولا پھلا ہی نہیں، کیسے "پان افغانزم" کے تصور کی متحمل ہو سکتی ہے "اتحاد افغان" دنیا کے اندر بہت سے اور اچھے الفاظ کی طرح بھلا

معلوم تو ہوتا ہی مگر یہ کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہوا۔ میرے بعض رفقاء کی رائے البتہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی دیگر ملتوں کی طویل زندگی میں یہی تمام مدارج جسمیں سے ملت افاغنہ گذر چکی ہے، یا آج گذر رہی ہے، کسی نہ کسی وقت موجود رہتے ہیں اور جو اصول ارتقاء کے بموجب اب ترقی یافتہ ہیں، افاغنہ میں بھی یہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ آجکل کی فضا اس قسم کے تصورات کے نشو ونما کیلئے موزون ہے۔ اور اتحاد افغان یا "پان افغانزم" دنیا کیلئے ضرور مفید نتائج پیدا کر سکتا ہے۔

میرے ایک فلسفی دوست کا یہ بھی خیال ہے کہ "اتحاد افغان" اور "افغان" میں ایک اندرونی تضاد اور تناقض ہے "افغان" اور "اتحاد" نقیض ہیں اور جمع "بین النقیضین" ناممکن ہے وہ فرماتے ہیں کہ جس قوم کے افراد قبائل اور خیلوں میں اس قدر اختراق چلا آیا ہو جیسا افغانوں کے اندر چلا آرہا ہے، نہ اُن کی زبانوں میں یگانگت رہی ہو۔ نہ اُنکے درمیان کچھ مشترک مفاد ہو کوئی کسی ہوا میں پلا ہو کوئی کسی میں، کوئی کیسا لباس پہنتا ہو اور کوئی کیسا۔ کوئی ایک زبان بولتا ہے کوئی دوسری پروفیسر لیبان کے "روح الاجتماع" کے فیصلے کے مطابق بھی ایسی قوم میں کوئی واحد، جاذب تصور جس سے ملت کی حیثیت سے یہ قوم آگے بڑھ سکے پیدا نہیں ہو سکتا اور نہ ہی ابن خلدون کا نظریۂ عصبیت ایسے مختلف الانواع قبائل کو ایک تار میں پرو سکتا ہے۔ اختلاف زبان، تہذیب، تمدن و روایات وغیرہ کو تو ایکطرف رکھئے، ملت افغان کے مختلف اجزاء، مختلف سیاسی نظام اور مختلف طرز تعلیم کے اثرات سے کیسے بچ سکتے ہیں؟ بعض جگہ مثلاً تعلیم فارسی اور فرانسیسی میں دیجاتی ہے۔ بعض جگہ اُردو اور انگریزی میں، کوئی ہندوستان میں ہے تو کوئی افغانستان میں۔ اسلئے ایسے اختلاف کے دیرینہ اثرات سے لازماً انمیں اتحاد کیلئے کوئی مشترکہ مواد موجود نہیں۔

میں نے خود بھی اس مسئلے پر کافی غور و خوض کیا ہے اور اس قسم کے کئی نظریات زیر بحث رہ چکے ہیں لیکن میں خود کوئی خاص کلیہ قائم نہیں کر سکا ہوں جو میں قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر سکوں یا دعوے سے کہہ سکوں کہ یہ نظریہ دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ وقیع ہے اور اسلئے یہ قابل قبول ہے۔ ملت افغان کے متعلق جو بھی نظریات پیش کئے جا رہے ہیں۔ ہر ایک میں ضرور کچھ نہ کچھ شائبہ حق موجود ہے۔ اسلئے قابل غور ہیں۔ ان مشکلات کے ہجوم کی موجودگی میں ہم اگر یہ کہیں کہ قوم افاغنہ فقط فاتح ہی ہے، تنظیم کے اہل نہیں یا مدارج ارتقا میں ابھی ان کا درجہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، یا اتحاد افغان جمع بین النقیضین ہے، یا مختلف سیاسی محاذوں میں رہنے سے تعلیم و زبان میں فرق آ گیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں دو چیزیں اب بھی ایسی ہیں جنکے وجود سے یہ امید ہو سکتی ہے۔

اوّل تو یہ ہے کہ پٹھان یا افغان چاہے افغانستان میں ہو، چاہے سرحد، بلوچستان میں، یا پنجاب، دہلی، رام پور، بھوپال، بمبئی، کلکتہ مدراس، رنگون، چین، آسٹریلیا، امریکہ میں غرضیکہ دنیا کے کسی حصہ میں (اور یہ یاد رہے کہ خدا کی زمین کا کوئی حصّہ ایسا نہیں، جہاں افغان کا قدم نہ پہنچا ہو) غریب ہو یا امیر، ملازم ہو یا مزدور، تاجر ہو یا زمیندار، گورا ہو یا کالا، جسیم ہو یا نحیف، نیک ہو یا بد، کچھ ہو لیکن "مسلمان" ہوتا ہے۔ افغان بغیر مذہب اسلام یعنے بغیر اسکے کہ مسلمان ہو متصوّر نہیں۔ افغانیت یا "پختو" کا تقاضا ہی یہ ہے کہ پٹھان ہو

توسوائے مسلمان کے دوسرا کچھ ہو ہی نہیں سکتا - دھدت مذہب گو یا ایک مشترک اصول ہے - جو ہر قسم کے پٹھان یا افغان پر حاوی ہے اور سب سے اہم وجہ اتحاد ہے - دوسری چیز یہ ہے کہ پٹھان چاہے ہندوستانی ہو یا چینی، چاہے جالندھر، کنجپورہ، رام پور، بھوپال کا ہو یا ڈھاکہ اور مدراس کا رہنے والا ہو کئی پشتوں سے جاکر کہیں آباد ہوا ہو، بلند تعلیم یافتہ ہو، صاحب ثروت ہو، نواب ہو، رئیس ہو، کچھ ہو لیکن اُسے اگر کسی چیز پر واقعتاً فخر ہوا کرتا ہے تو صرف اس بات پر کہ وہ "افغان"، "پٹھان" یا "پختون" ہے گو یا ہزاروں انقلابات کے باوجود پٹھان میں "قلب ماہیت" واقع نہیں ہوئی - گویا اس کی "قبائلی روح" زندہ رہتی ہے - اور اس کا جوہر "پختو" یا "افغانیت" کبھی نہیں مرتا - دنیا میں ماسوا یہودیوں کے شاید ہی کوئی قبیلہ ایسا ہو جسمیں یہ عصبیت اتنی دیر تک اور ایسی پختگی سے موجود رہ سکی ہو - اس واسطے پشتو میں ایک ضرب المثل مشہور ہے کہ "پختو" یا "افغانیت" کا پتھر (یعنی جوہر) نہ پانی میں گل سکتا ہے اور نہ ہی اُسے آگ جلا سکتی ہے - تو ایسی دوام اور بنیادی صفات کی موجودگی میں با وجود مشکلات کے ہرگز نا امید نہیں ہونا چاہئے - زمانہ خود بخود "اتحاد افغان"، یا "پان افغانزم" کے تصور کی توسیع کیلئے مناسب موقع پیدا کریگا - شرط یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہو جائے کہ اب یہ ملت بھی ملت بن کر ترقی کرے -

اسلئے میرے نزدیک لودیانہ، جالندھر، ہوشیارپور، کنجپورہ کے بعض اصحاب فکر و نظر افاغنہ کا یہ اقدام نہایت مستحسن معلوم دیتا ہے کہ انہوں نے "اتحاد افغان"، کے نام سے ایک اخبار جاری کیا ہے - جسکے ذریعہ وہ نہ صرف ہندوستان کے اندر آباد شدہ افاغنہ کو اتحاد کی طرف متوجہ کرتے ہیں - بلکہ صوبہ سرحد وغیرہ کے پٹھانوں کو بھی اپنے ان ہندوستانی عزیزوں کے ساتھ رشتہ برادری گازہ" کرنیکی تلقین کرتے ہیں - کوئی ذی فہم اور صاحب بصیرت افغان نہ ہندوستان میں اور نہ ہی سرحد یا بلوچستان میں ایسی مستحسن اقدامات کو نظر انداز کر سکتا ہے - جماعت بندی اور تنظیم تو آجکل دنیا کی طرح پھیلی ہوئی ہے - اور ہر قبیلہ اور ہر پیشہ کے لوگوں میں اتحاد و نظام کے سرشتے قایم ہو رہے ہیں - اسلئے واقعات گرد و پیش کو دیکھکر افاغنہ ہند کو اپنی تنظیم ضرور کرنی چاہئے - دور بینی اور عاقبت اندیشی کا تقاضا تو یہ تھا کہ اس قسم کے اقدام میں پہل افاغنہ رام پور، بھوپال، مالیر کوٹلہ یا جوناگڈھ میں سے کسی کی طرف سے ہوتی اور مدراس سے لیکر سرحد تک سب افغانوں کو آپس کے رشتہ برادری کو مضبوط بنانیکی دعوت دیجاتی - یہ امر یقینی ہے کہ اس نیک اقدام سے سب ملت کی توجہ ملی روایات کی طرف منعطف ہو جاتی اور ہر فرد کو اس امر کا احساس ہو جاتا کہ وہ پہلے بھی افغان تھا اور اب بھی افغان ہے اور چاہے وہ ڈھاکہ میں آباد ہو یا مدراس میں، اسکی برادری اسکی ہر طرح خبر گیری کر سکتی ہے - اور اسکو بھی اپنی برادری کے بُرے بھلے میں شریک ہونا چاہئے - مجھے یقین ہے کہ افاغنہ رام پور یا بھوپال کو اس امر کی طرف خاص توجہ نہیں دلائی گئی ہے ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ وہاں کے افغان بھائی خود اس اہم معاملے کی طرف توجہ نہ کرتے - ہم اہالیان سرحد نے بھی اتحاد افغان کے اس عمدہ خیال کی پوری طرح سے امداد نہیں کی - اور اگر خان بہادر محمد زمان خان خٹک، ڈاکٹر سید انوار الحق، اور میر افضل خان جدون نے ہماری نمایندگی نہ کی ہوتی تو مجھے آج یہ جرأت نہ ہوتی، کہ اس موضوع کی طرف رام پور بھوپال اور دیگر افاغنہ ہند کی توجہ مبذول کرا سکتا -

مجھے کامل امید ہے کہ سرحد کے افغان عموماً اور ہندوستانی افاغنہ (رام پور، بھوپال، مالیر کوٹلہ، جوناگڈھ) خصوصاً اس معاملہ کی طرف فوری توجہ فرمائیں گے -

ماہنامہ "اتحاد افغان"، لدھیانہ

نومبر ۱۹۴۲ء

سال دوم | ۲۵ر دسمبر سنہ ۱۹۴۲ء | ۱۶ر ذی الحجہ سنہ ۱۳۶۱ھ | نمبر (۱۶)

فہرست

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے :۔
ایڈیٹر :۔ آج کل (نن پرون) ۱۵ راجپور روڈ دہلی

بہادر سپاہی

وطن کے سپاہی کسی سے نہ ڈرنا
بہادر ہی جینا بہادر ہی مرنا

تیرے نام سے ہے شجاعت وطن کی
تیرے دم سے قایم ہی عظمت وطن کی
بدل ڈال اکبار قسمت وطن کی
اگر کچھ بھی ہے دل میں الفت وطن کی

بہادر سپاہی کسی سے نہ ڈرنا
بہادر ہی جینا بہادر ہی مرنا

زمانہ کی قسمت بنا کر ہی دم لے
یہ ظلم و تشدّد مٹا کر ہی دم لے
حریفوں کی خوں میں نہا کر ہی دم لے
کسی طرح بھارت بچا کر ہی دم لے

بہادر سپاہی کسی سے نہ ڈرنا
بہادر ہی جینا بہادر ہی مرنا

کوئی ظلم ڈھائے تو پروا نہ کرنا
زمانہ ہلائے تو پروا نہ کرنا
قیامت بھی آئے تو پروا نہ کرنا
اگر جان جائے تو پروا نہ کرنا

بہادر سپاہی کسی سے نہ ڈرنا
بہادر ہی جینا بہادر ہی مرنا

گھر آئی ہے چاروں طرف سے مصیبت
لٹا چاہتی ہے تیرے گھر کی دولت
یہ آواز دیتی ہے بھارت کی عظمت
بڑھے جا بڑھے جا اسی میں ہے عزت

بہادر سپاہی کسی سے نہ ڈرنا
بہادر ہی جینا بہادر ہی مرنا

سحاب بنت آغا شاعر قزلباش مرحوم دہلوی

تالیف یا ترجمہ

(از مولنا عبدالقادر صاحب)

روزنامہ انیس کابل کے ایک نہایت مفید اور عالمانہ بحث میں حصّہ لینا ہمارے لئے مسرت و افتخار کا موجب ہے اور علے الخصوص جبکہ ہمارے فاضل دوست واسعی صاحب جو اس بحث کے بانی مبانی ہیں، خود اُن کا ارشاد ہے کہ تمام اصحاب الرّائے اپنے اپنے نظریات و خیالات کا اظہار کریں۔
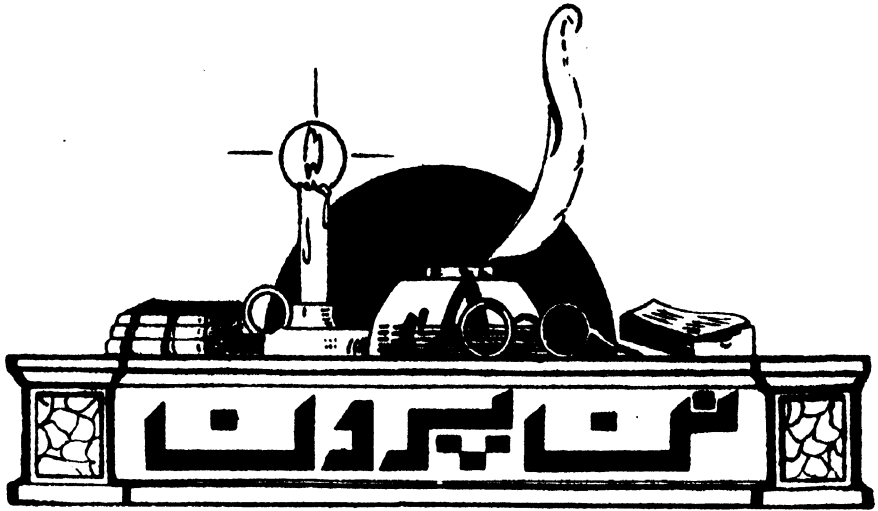
ایک عرصہ تک تو ہم اس خیال میں رہے کہ ہماری شال بن بلائے مہمان کی سی ہے۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اب افغانوں کا جذبۂ قومی بیدار ہو گیا ہے اور یہ کوشش کیجارہی ہے کہ افغان قوم کے منتشر اجزا میں کچھ اس طرح ربط و موانست پیدا کی جائے کہ ایک دوسرے سے نزدیک تر ہو جائیں لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب ہم اپنی زبان کو ترقی دیں اور اسی واسطہ سے تمام قوم میں ذہنی، قلبی، ملّی اور قلمی یگانگت پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملہ میں اکثر بنیادی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً رسم الخط کی یکسانی، تالیف یا ترجمہ کا مسئلہ، معیاری ادبی زبان کا تقرر وغیرہ۔

دُنیا کی ہر وہ قوم جو شاہراہ ترقی پر گامزن ہے،

اُسے اسی قسم کے سوالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جنہیں صحیح طور پر حل کئے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اِنہیں مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے جسے فاضل واسعی صاحب نے انیس کابل شمارہ ۱۹۳ میں اُٹھایا ہے۔ افسوس کہ میں واسعی صاحب کا یہ مضمون نہ پڑھ سکا، اور نہ فاضل عبدالحی صاحب حبیبی کے خیالات سے استفادہ کرسکا۔ البتہ بعض دوسرے ادبا کے افکار میری نظر سے گذرے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ فاضل واسعی صاحب نے اپنے مضمون میں یہ استفسار کیا ہے کہ آیا موجودہ زمانہ میں ملّت افغانیہ کی علمی، سیاسی اور معاشرتی ترقی کیلئے تالیف کی زیادہ ضرورت ہے یا ترجمہ کی۔ دوسرے یہ کہ ترجمہ سادہ ہو یا مغلق۔ افغان ادیبوں کا یہ سوال اُٹھانا اس امر کی دلیل ہے کہ قومی تعمیر کی جو مہم اُنہوں نے شروع کی تھی اُس میں اُنہیں ایک حد تک کامیابی حاصل ہوئی ہے اور اب وہ ایسا طریقہ کا اختیار کرنا چاہتے ہیں جو اُنہیں منزلِ مقصود تک پہنچا بھی دے اور آسان بھی ہو۔ کچھ دن پہلے ترکی، مصر اور ایران میں بھی یہی مسئلہ درپیش تھا بلکہ اب بھی ہے۔ میری خیال میں اِن قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا، وقت اور محنت کی بچت ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت حیدرآباد دکن کی کوششیں اور تجربے بھی قابل تقلید ہیں۔ دیگر مشرقی اقوام کی وہ کوششیں بھی کچھ کم سبق آموز نہیں جن میں اُنہوں نے مغرب کے علمی اور معاشرتی اصولوں سے کافی فائدہ اٹھایا ہے۔ لیکن اِن کے علاوہ ہمیں خود بھی کوئی ایسا طریقہ کار سوچنا چاہیئے جس میں ہماری زبان کی موجودہ علمی حالت، قومی ضرورت اور ماحول کا لحاظ رکھا جائے تاکہ ہماری تصانیف و تراجم سے خود ہماری قوم بالخصوص اور دوسری قومیں بالعموم استفادہ کرسکیں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ترجمہ ہمارے لئے زیادہ کارآمد ہوگا یا تالیف۔ سچ پوچھیئے تو دونوں اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ اگر ایک غیر ترقی یافتہ قوم ترقی یافتہ قوم کی برابری کرنا چاہتی ہے تو اُسے موخرالذکر قوم کے علوم و فنون سے بذریعہ ترجمہ استفادہ کرنا پڑیگا۔ لیکن صرف ایسے ہی تراجم کو اپنی دینی اور دنیوی ترقی کا منبع سمجھنا بندر کی نقالی کے مترادف ہے۔ دوسری قوموں کے علوم و فنون ترجمہ کی وساطت سے اپنائے تو جا سکتے ہیں لیکن ملّی اور ذاتی جوہر کا اظہار صرف تالیف و تصنیف ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرنا کہ کس طریقہ کار کو کس پر فوقیت ہے، کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ جہاں ترجمہ مناسب ہو وہاں ترجمہ، جہاں تصنیف موزون ہو وہاں تصنیف ہونی چاہیئے۔ مثلاً سائنس، طب، انجنیرنگ یا موجودہ ایجادات کے سلسلہ میں ہم ایسے اشخاص کا انتظار نہیں کرسکتے جو اِن علوم میں کافی دستگاہ حاصل کرنے کے بعد خود اپنی زبان میں تصنیف و تالیف کریں۔

میرا خیال ہے کہ بہتر یہ ہوگا کہ ہم یورپ اور امریکہ کے مستند علما کی تصانیف کا انتخاب کرکے ترجمے کی کوشش کریں۔ لیکن اس سے یہ مراد نہیں کہ محض ترجمہ ہی ہماری زبان کا سرمایہ بن جائے۔ پہلے ہمارا اِن علوم وفنون پر حاوی ہونا ضروری ہے پھر تو ہم میں سے خود بخود ایسے متخصص عالم اور مصنّف پیدا ہوں گے جن کی فطری استعداد اور صلاحیتیں ہماری تصنیف وتالیف کی دنیا میں اضافہ کریں گی۔ پس ہماری قوم کی موجودہ علمی حالت کا تقاضا یہ ہے کہ ترجمہ اور تالیف دوش بدوش رہے۔ اب رہا اِن کی تقدیم وتاخیر کا سوال۔ سو یہ ضرورت پر منحصر ہے۔ پشتو ادب، تاریخ یا شاعری میں ترجمہ کی ضرورت نہیں پڑیگی کیونکہ یہ تو وہ موضوع ہیں جن پر خود ہمارے ہی قلم کا زور صرف ہونا چاہیئے۔ دوسروں کے علم وادب میں یہ اضافے ہماری طرف سے ہونا چاہئیں۔

تصنیف یا تالیف کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ یہ ہمیشہ ہر قید وبند سے آزاد رہی ہے۔ جسکے پاس قلم اور جوہر ذاتی ہے وہ بغیر کسی پابندی کے تالیف وتصنیف پر مجبور ہے۔ ایسے ہی شخص کی تصنیف یا تالیف کو پائندگی اور ابدیت نصیب ہوتی ہے۔ ایسی ہی تصنیف یا تالیف سے ایک دُنیا فائدہ اٹھاتی ہے۔ مگر ترجمہ میں یہ اصول کام نہیں دیتا کیونکہ مترجم کو ایک خاص موضوع کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ اُسے مقید ومجبور سمجھیئے۔ اور اگر مترجم پر سے یہ پابندیاں اٹھائی جائیں تو بجائے فائدہ کے نقصان کا احتمال ہے۔ ترجمہ کیلئے مفید، موزون اور اہم موضوعات کا انتخاب بھی بہت ہی ضروری ہے، لیکن ایک ماہر مترجم کیلئے یہ لازمی نہیں کہ وہ اچھا انتخاب بھی کرسکے، مصر، ترکی اور ہندوستان کے اکثر مترجم یہ غلطی کرچکے ہیں۔ اسلئے افغانستان کے علما اور مفکرین اس بات کا خاص طور سے خیال رکھیں۔ مصر کے علما نے باوجود بلند پایہ تالیفات وتصنیفات کے ترجمہ کیلئے بعض ایسے موضوع منتخب کئے جو تضییع اوقات کے سوا اور کسی کام کے نہیں۔ لیکن بعد کو انہوں نے سمجھ سے کام لیا اور آج مصر سے جو تراجم شائع ہو رہے ہیں وہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے تو کچھ زیادہ نہیں مگر افادیت کے اعتبار سے کافی اہم ہیں۔ گذشتہ پچاس سال سے ایران ادھا دھند ترجمے کررہا ہے۔ ترکوں کے متعلق تو البتہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے لیکن وہاں بھی کم وبیش یہی ہوتا رہا ہے۔ لیکن اب وہاں بھی یہ حالت نہیں۔ ہندوستان میں بھی یہی عالم تھا۔ یورپ خاصکر فرانس کے پرانے ناولوں کے ترجمے اُردو، فارسی اور ترکی میں کئے جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ پڑھنے والوں پر اُنکا کیا اثر پڑتا ہوگا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر سائنس، طب، ہندسہ، اقتصادیات اور دیگر جدید علوم کے ترجمے یورپ کی زبانوں سے مشرق وسطیٰ، افغانستان، ہند اور چین کی زبانوں میں کئے جائیں تو کم از کم ایسے عالموں سے ضرور مشورہ کرلیا جائے جو اپنے ماحول سے اچھی طرح باخبر ہوں۔ لیکن ادبیات یا فنون لطیفہ کا بلاسوچے سمجھے اس خیال سے ترجمہ کرنا کہ یہ ہمارے ادب کا جزو بن جائینگے سراسر نادانی ہے۔ فنون لطیفہ اور خاص طور سے ادبیات تو ہر قوم کے مخصوص تصورات، جذبات اور ماحول کا عکس ہوتی ہیں۔ پس دوسری قوم کی ادبیات کو اپنے اوپر مسلّط کرنا، اپنے ادب کی تخریب کرنا ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ دوسری قوموں کی ادبیات سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا یا وہ ہمارے لئے مفید ثابت نہیں ہوسکتیں۔ یہاں بھی دراصل غور وفکر سے کام لینا چاہیئے۔ یعنی اگر کسی قوم میں ایسا ممتاز مصنف گذرا ہو جسکی تصانیف بنی نوع انسان کی علم فطرت، جذبات اور تصورات کی عکاسی کرتی ہوں تو ایسے مصنف کے تراجم یقیناً مفید ثابت ہونگے۔ مثلاً

(باقی بر صفحہ ۱۰)

رفتار زمانہ

شمالی افریقہ :-

۷۰۰ میل بھاگنے کے بعد رومل نے العقیلہ پر جاکر دم لیا۔ اُسے کافی امید تھی کہ وہ وہاں کے تیار شدہ مورچوں میں پناہ گزین ہوکر آٹھویں لشکر کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک لیگا۔ لیکن ادھر جنرل منٹگمری نے ذرا اقدم جماکر حملہ کیا ہی تھا کہ رومل پھر مغرب کی سمت بھاگا۔ اور تمام رقبہ میں سرنگیں بچھادیں کہ اتحادی کم از کم بری راستہ سے اس کا تعاقب نہ کرسکیں۔ لیکن اتحادیوں کے ہوائی جہازوں نے بھاگتی ہوئی فوجوں کا پیچھا نہ چھوڑا اور مسلسل تباہ کن حملے کرتے رہے۔ العقیلہ بھی بغیر کسی سخت مزاحمت کے فتح ہوگیا۔ رومل کا یہ آخری اہم مورچہ تھا۔ اس فتح کا سہرا بھی جنرل منٹگمری کے سر ہے۔

رومل اب طرابلس میں پناہ لے رہا ہے۔ آٹھواں لشکر بڑی تیزی سے تعاقب کر رہا ہے۔ اب اس کے لئے اور کوئی چارہ کار نہیں رہا تو لڑے یا طرابلس بالکل چھوڑ دے۔ طرابلس پر اگر قبضہ ہوگیا تو اتحادیوں کے ہاتھ بندرگاہ اور فضائی میدان آجائیں گے۔ بیزرتا اور ٹیونس پر خاطر خواہ دباؤ ڈالا جاسکے گا جہاں فی الحال محوری ہوائی طاقت کو فوقیت حاصل ہے۔

جزائر سلیمان :-

جزائر سلیمان سے جو خبریں موصول ہوئی ہیں وہ کچھ کم مسرت افزا نہیں۔ گوناکے بعد بوناکو بھی جنرل میک آرتھر نے بہت ہی جلد لے لیا۔ چنانچہ اب نیوگنی کا جنوب مشرقی حصہ اتحادیوں کے قبضہ میں ہے۔ سنا جاتا ہے کہ جاپانیوں نے گوناکے قریب ایک نیا محاذ قائم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی ایک بھی پیش نہ گئی۔ اگرچہ بعض مقامات پر وہ کچھ فوجیں اُتارنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن اُنکا بہت جلد قلع قمع کر دیا جائے گا۔

روس :-

روس میں جرمنوں کی بُری حالت ہے۔ دریائے ڈون اور والگا کے درمیان اُن کے بیس ڈویژن پھنس گئے ہیں جنہیں وہ دیوانہ وار بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن سب بے سود۔ یہ بھی خبر ملی ہے کہ انہوں نے روسی مورچہ میں ایک آدھ جگہ چھوٹا موٹا درار کر دیا ہے۔

وسطی محاذ میں بھی بہت ہی خوفناک لڑائیاں جاری ہیں اور روسی جو جگہیں لے چکے ہیں ان کو مستحکم کر رہے ہیں۔

روسیوں نے اب پورے محاذ پر اپنی نقل و حرکت کی رفتار تیز کر رکھی ہے۔ اس سے بڑا فایدہ

یہ ہوا کہ اب محوری اپنی فوجیں زیادہ تعداد میں ایک محاذ سے دوسرے محاذ پر منتقل نہ کر سکیں گے۔

ایران میں ۵ نومبر کو جس نئی ریلوے لائن کا افتتاح ہوا تھا وہ اب نہایت کارآمد ثابت ہو رہی ہے۔ اس سے صرف عراق اور ایران ہی کو نہیں بلکہ روسی محاذ کو بھی فائدہ پہنچ رہا ہے۔ خرم شہر (نیا ایرانی بندرگاہ جسے پہلے محمرہ کہتے تھے) کو ٹرانس کیسپین ریلوے سے ایک ۷۵ میل لمبی براہ نچ لائن کے ذریعہ سے ملا دیا گیا ہے جو ریگستان میں سے ہو کر جاتی ہے۔ کوئٹہ ریلوے بھی بلوچستان کے اُس پار تک بڑھا دی گئی ہے۔

ایران کی سڑکیں بھی پہلے سے کہیں اچھی حالت میں کر دی گئی ہیں۔ الغرض ایران کی وساطت سے جو مدد روس کو دی جا رہی ہے اس میں بڑی تیزی سے دن دونا اضافہ ہو رہا ہے۔

امریکی پیداوار:-

پرل ہاربر کی سالگرہ کی تقریب پر امریکہ نے ۴۵۰۰۰ ٹن کا ایک نیا جنگی جہاز جس کا نام نیوجرسی تھا، سمندر میں اُتارا۔ اسی قسم کا آیئووا جہاز چند ماہ قبل اُتارا جا چکا ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ نیوجرسی اپنے معینہ وقت سے ۱۸ ماہ قبل تیار ہو گیا۔ پچھلے پانچ مہینہ میں امریکہ نے ۵ طیارہ بردار جہاز تیار کئے ہیں جن میں تین کے نام ایسیکس، لکزنگٹن اور بنکر ہل ہیں۔ اِن میں سے ہر ایک کا وزن ۲۵۰۰۰ ٹن ہے، ۸۹ سے زائد طیاروں کی گنجائش ہے اور بحری فوج اور عملہ کی تعداد ۲۰۰۰ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اُن امریکی جہازوں کو جنہیں پرل ہاربر کی بمباری کے موقعہ پر نقصان پہنچا تھا، مرمت کے بعد دوبارہ کام کرنے کے قابل بنا دیا گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء کے اختتام تک امریکہ ۴۹۰۰۰ طیارے، ۳۲۰۰۰ ٹینک اور خود چلنے والی توپیں، ۱۷۰۰۰ طیارہ شکن توپیں اور ۸۲،۰۰،۰۰۰ ٹن وزن کے تجارتی جہاز تیار کر لے گا۔

افغانستان

ہز مجسٹی شاہ افغانستان کے بڑے صاحبزادے شہزادہ محمد اکبر خان کی وفات پر ترکی اور ایران کے صدروں کی طرف سے بذریعہ تار تعزیت کے پیغامات موصول ہوئے ہیں۔

ایک نئی تجارتی کمپنی خشک ادرک اور ریشم مہیا کرنے کی غرض سے ایک کروڑ افغانی سرمایہ کے ساتھ قائم کی گئی ہے۔ اور اس سرمایہ میں سے ۵۰ لاکھ افغانی کے حصے سید محمد ابراہیم اور دوسرے ڈائرکٹر خرید چکے ہیں اور بقیہ کو ۱۰۰ افغانی فی حصہ کے حساب سے ۵۰،۰۰۰ حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔

عید الضحیٰ

سمندر خان بدرشی

عید الضحیٰ۔ خوشی کا دن۔ یہ خوشی کیوں ہے؟ کیا بات ہے کہ لوگ نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں؟ ہر طرف ہنسی، مسکراہٹ، گلے ملنا، مبارکبادی، خیرات، صدقے، قربانیاں غرض ہر شخص مصروف نظر آتا ہے اور جس سے جو کچھ بن پڑتا ہے، کرتا ہے۔ لیکن یہ سب کیوں ہو رہا ہے۔ سنئے اور غور سے سنئے کہ عید الضحیٰ سے کیا مراد ہے۔

خداوند کریم کے بلند مرتبت پیغمبر حضرت ابراہیمؑ کی عمر چھیاسی سال اور ان کی اہلیہ بی بی سارا کی عمر پچھتر سال کی ہو چکی تھی لیکن وہ ابتک اولاد سے محروم تھے اور آیندہ بھی کوئی امید نہ تھی۔ ہاجرہ، بی بی سارا کی کنواری لونڈی تھیں اور ان کی اجازت سے حضرت ابراہیمؑ کی نکاح میں آئیں۔ ہاجرہ ہی کے بطن سے حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بشارت ہوئی کہ حضرت اسمٰعیلؑ کے بارہ بیٹے پیدا ہوں گے۔ اور سب کے سب سردار بنیں گے۔ اس بشارت نے بی بی سارا کے دل میں حسد کی آگ بھڑکا دی۔ انہیں اب بی بی ہاجرہ کا گھر میں رہنا گوارا نہ تھا۔ حضرت ابراہیمؑ کو مجبور کیا گیا کہ بی بی ہاجرہ کو گھر سے نکالدیں۔ لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی جب خدا کے اس جلیل پیغمبرؑ نے بی بی سارا کا کہنا مان لیا۔ لیکن وحی نازل ہو چکی تھی کہ بی بی سارا کی بات مان لی جائے۔

حضرت ابراہیمؑ نے بی بی ہاجرہ کو ساتھ لیا اور اسطرح کچھ کھجور اور پانی کا مشکیزہ لئے یہ مختصر سا قافلہ ایک نامعلوم مقام کی طرف چل نکلا۔ دل میں حسرتیں تھیں۔ لیکن زبان پر اُف نہ تھی۔ خدا کے فرمان کے آگے سر جھکائے، بیابانوں اور صحراؤں کو طے کرتے چلے جا رہے تھے۔ نہ معلوم کہاں جا کر قیام کرینگے۔ وطن سے دور ایک لق و دق صحرا سے گذر رہے تھے کہ اچانک ابراہیمؑ پر وحی کی کیفیت طاری ہوئی۔ خچر رُک گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی جبین مبارک سے پسینہ پونچھا، بی بی ہاجرہ کو خچر سے اُتارا اور آنکھوں میں آنسو بھرے بی بی ہاجرہ سے یوں مخاطب ہوئے "آپ اور آپ کے نور چشم کیلئے یہ مقام مقرر ہے"۔ یہ فرما کر واپس ہونے ہی کو تھے کہ بی بی ہاجرہ نے اُن کا دامن تھام لیا اور کانپتے ہوئے رو رو کر عرض کرنے لگیں "آپ ہم دونوں کو اس بیابان میں بے یار و مددگار کس کے حکم سے چھوڑے جاتے ہیں" حضرت ابراہیم نے درد بھری آواز سے جواب دیا "میرے پروردگار کا حکم ہے"۔ بی بی ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ کا دامن چھوڑ دیا اور اطمینان کا سانس لیکر بولیں "اگر یوں ہے تو وہ یقیناً ہمیں تباہی و بربادی سے بچائیگا"۔

کم عمر بی بی ہاجرہ اور ان کا لاڈلا اور اکلوتا بیٹا اس بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا تھے۔ نہ کہیں آبادی کا نام تھا، نہ خوراک کا

سامان ۔گھر تو بڑی بات ہے، چھپّر بھی نہ تھا ۔آدمی کا تو ذکر کیا، چرند وپرند تک نہ تھے ۔بس اوپر آسمان اور نیچے زمین نظر آتی تھی ۔ ایسے حالات میں ذرا آپ خود کو رکھکر دیکھیں اور پھر حضرت ابراہیم کی مشکلات اور آزمائش کا اندازہ کریں۔ بی بی ہاجرہ کے پاک دل پر کیا گذرتی ہوگی ۔عورت ذات، دودھ پیتا بچّہ، وہ سنسان صحرا جہاں پرندہ تک پر نہ مار سکے، نہ دوست، نہ مددگار، ہرطرف ہیبت اور خوف، معصوم بچّے کی محبت، بیوی کی الفت، آنکھوں کے آگے اندھیرا۔ بھاری بھاری قدم حضرت ابراہیمؑ واپس لوٹے ۔ خدا کا حکم سب سے اولیٰ۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنی پیاری بی بی ہاجرہ اور اپنے لخت جگر حضرت اسمٰعیلؑ کو خدا کے بھروسے پر چھوڑا، صبر سے کام لیا۔ چلتے چلتے دور نکل گئے اور بی بی ہاجرہ کی نظروں سے اوجھل ہوگئے : پھر پیچھے مڑ کر ان کی طرف دیکھا اور خدا کے حضور میں نہایت خلوص سے دعا کی :-

"اے میرے پروردگار تیرے مقدّس گھر کے پاس بے آب وگیاہ صحرا میں تیرے ہی آسرے پر اپنی اولاد کو چھوڑتا ہوں ۔ اے پروردگار ان کو یہاں اسلئے چھوڑا گیا ہے کہ وہ یہاں نماز ادا کریں ۔ان کو پاک اور عمدہ روزی عطا کر کہ وہ تیرا شکریہ ادا کریں ۔تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف متوجہ کر"

اب بی بی ہاجرہ تھیں اور یہ خوفناک تنہائی ۔گود میں معصوم بچہ، ملک ویران، آدم زاد کا نہ نام نہ نشان ۔خاموشی اور سکوت، بس اللہ کا نام ۔حیران وپریشان دن گذر گیا ۔سورج ڈھلنے کو تھا۔ مشرق کو تاریکی نے گھیر لیا ۔ بی بی ہاجرہ نے معصوم بچے کو کلیجہ سے لگا کر ساری رات خوف اور ڈر میں گذاری ۔چند کھجور لیکر منہ میں ڈالے اور مشکیزہ سے دو چار گھونٹ پانی پیا ۔ کھانے پینے کا ذخیرہ ناکافی تھا ۔ یہ خیال بھی کھائے جا رہا تھا کہ یہ سب ختم ہوا جا رہا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ خدا پر بھی پورا بھروسہ تھا ۔آخر کھجور ختم ہوگئی اور مشکیزہ خالی ہوگیا ۔چھاتی میں دودھ کہاں ۔حضرت اسمٰعیلؑ بھوک سے بے چین ہو رہے تھے ۔ پیاس سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہے تھے ۔ لب خشک ۔ روتے روتے گلا بیٹھ گیا ۔ چند گھڑیوں کے مہمان نظر آرہے تھے ۔ پیاری ماں نے لاکھ جتن کئے ۔بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن بے سود ۔ہوش جاتے رہے کانپیں، روئی، دل میں درد اٹھا، بچّے کو پیار کیا، زاری ہونے لگی۔ اِس آہ وزاری میں آنکھیں آسمان کی طرف اٹھیں اور ادھر بچے پر نزع کی حالت طاری ہوئی ۔ بی بی ہاجرہ خوف کے عالم میں کوہ صفا پر دوڑ کر چڑھ گئیں اور پانی کا چشمہ ڈھونڈنے لگیں ۔آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کونہ کونہ میں پانی کی تلاش کی ۔لیکن پانی کہاں ۔ ناکام واپس لوٹیں ۔بچہ سسکیاں لے رہا تھا ۔حسرت کی آنکھوں سے بچے کو دیکھا اور پھر دوڑ کر کوہ مروہ پر گئیں ۔لیکن وہاں بھی پانی نہ مل سکا ۔ آکر پھر اپنے دلبند کو دیکھا اور پھر کوہ صفا پر پانی کی تلاش میں گئیں ۔ بچے کی حالت زار، پانی کی تلاش، کوہ بکوہ تگ ودو، عجیب روح فرسا نظارہ تھا ۔آخری بار کوہ صفا سے اترنے پر خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھنے میں آیا ۔ بچہ جس جگہ ایڑیاں رگڑ رہا تھا، وہیں سے پانی کا چشمہ اُبل اُبل کر بہہ رہا تھا ۔ بی بی ہاجرہ نے خدا کا شکر ادا کیا ۔ پانی کو چاروں طرف پھیلنے سے روک دیا ۔ اوک بھر کر پہلے بچہ کو پلایا اور پھر خود پیا ۔ اب اس پانی پر ماں بیٹے

کا گذارہ ہونے لگا۔ اسکے سوا تو وہی لق و دق صحرا تھا۔ لیکن رحمت کا دروازہ وا ہو چکا تھا اور آبادی کا سامان ہونے کو تھا۔ مرغانِ صحرائی یہاں پانی دیکھکر اُترنے لگے۔ قافلوں کا گذر بھی ادھر سے ہونے لگا۔ تھوڑے فاصلہ پر جُرہم قبیلے کا قافلہ اُترا تھا۔ پرندوں کو اُترتے دیکھکر سب حیران رہ گئے۔ "یہ بے آب و گیاہ صحرا، یہ بیابان اور پرندے۔ یہ خشک اور بنجر ریگستان اور جانداروں کا وجود۔ یہ کیسی اور کونسی جگہ ہے؟" امیر قافلہ نے دو آدمی حالات معلوم کرنے کیلئے بھیجے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ پانی کا ٹھنڈا چشمہ بہہ رہا ہے۔ کنارے ایک عورت بیٹھی معصوم بچے کو کھلا رہی ہے۔ خوبصورت، فرشتہ سیرت۔ واپس لوٹ کر قافلے کو اطلاع دی۔ سب دوڑ کر چشمہ کے پاس آئے۔ بی بی ہاجرہ کو ایک بزرگ عورت سمجھا۔ وہاں مقام کرنیکا ارادہ ظاہر کرکے اجازت چاہی۔ بی بی ہاجرہ نے اس شرط پر اجازت دیدی کہ پانی جتنا چاہو استعمال کرو لیکن اپنی ملکیت نہ سمجھو۔ امیر قافلہ نے تسلیم کرلیا اور سارا قافلہ وہاں ٹھیر گیا۔

بیابان آباد ہوا اور بی بی ہاجرہ اِس بیابان کی شہزادی بنیں۔ قبیلہ جرہم اُنہیں عظمت و وقار کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اُن کا بچہ اسمٰعیلؑ ناز و نعمت میں پلنے لگا۔ آہستہ آہستہ عربی زبان میں فصیح اور بلیغ بول چال کر قابل ہوگیا۔ قبیلہ کے بچوں کے ساتھ کھیلتا اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرتا۔

یہ تو نہیں معلوم کہ حضرت ابراہیمؑ پہلی بار کب بی بی ہاجرہ اور اپنے نورچشم کو دیکھنے کیلئے آئے۔ لیکن حضرت اسمٰعیلؑ سات یا نو یا تیرہ سال کے ہوں گے جب آپنے ایک ڈراؤنا اور ہیبت ناک خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ خواب سے بیدار ہوئے تو طبیعت بہت زیادہ خراب تھی۔ سوچتے تھے کہ یہ خواب ہی یا خیال دن بھر اسی فکر میں پڑے رہے۔ شام ہوگئی۔ رات کو پھر وہی خواب۔ سمجھے کہ خواب سچا ہے خدا کو یہی منظور ہے کوئی شیطانی وسوسہ نہیں۔ تیسری رات بھی وہی خواب، اب تو کامل یقین ہوگیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے چھری اور رسی لی اور اپنے نورچشم سے یوں مخاطب ہوئے۔ "چلو جنگل سے لکڑیاں کاٹ لائیں۔" شریف باپ کا شریف لڑکا ساتھ چل پڑا۔ راستے میں باپ نے بیٹے سے کہا:-

"میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ کہو تمہاری کیا رائے ہے؟" (قرآن)

خدا کے رسول کا بیٹا بھی رسول۔ "کیوں"؛ "کس لئے"؛ اور "کب" کہنا کیا جانے۔ ہنسی خوشی، ماتھے پر بل ڈالے بغیر، باپ کو جواب دیا:-

"ابا جی آئیے، جو حکم بھی ملا ہو اُس کی تعمیل کر ڈالیں۔ انشاء اللہ میں صابر ثابت ہوں گا" (قرآن)

باپ بیٹا دونوں خدا کا حکم بجا لانے پر تیار ہوگئے۔ جب پیارے باپ نے بیٹے کو منہ کے بل زمین پر لٹایا تو خوش نصیب بیٹے نے یہ وصیت کی:-

"ابا جی چھری خوب تیز ہو۔ میرے ہاتھ پاؤں سخت باندھ دیجئے۔ ایسا نہ ہو میں زور کرکے آپ کے ہاتھ سے نکل جاؤں اور بے صبری کا ملزم بنوں۔ ابا جی اپنے کپڑوں پر لہو کی چھینٹیں نہ آنے دیجئے گا ایسا نہ ہو ماں دیکھکر غمگیں ہوں۔ ابا جی مرنا مشکل ہے

(باقی بر ۲۳ صفحہ)

فلسفۂ وحی

ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان۔ اسلامیہ کالج پشاور

(۲)

اس مسئلہ کا حل دو طریقوں سے ہو سکتا ہے۔ بعض مفکرین کے نزدیک تو خدا کو جاننے کیلئے انسانی استعدادیں ہی کافی ہیں۔ بعضوں کا خیال ہے کہ وحی ہی ایسا وسیلہ ہے جس سے خدا کی ذات اور صفات معلوم ہو سکتی ہیں۔ اس خیال سے مجھے بھی اتفاق ہے۔ بلکہ میرا تو یہ دعویٰ ہے کہ اس مسئلہ کا حل وحی کے سوا ہے ہی نہیں۔ پس اہم ترین سوال یہ ہے: آیا وحی سے خدا کے وجود اور تصور کی کافی توضیح ہو سکتی ہے؟ میرا اصلی موضوع بھی یہی ہے۔

علمائے مافوق الطبیعیات کا دعویٰ ہے کہ وجود باری کی تصدیق کیلئے بشری استعدادیں ہی کافی ہیں اور وحی محض ایک ڈھکوسلا اور خیال باطل ہے۔ اس لئے ان کے سلسلوں میں وحی کیلئے کوئی جگہ نہیں۔

تمہید طول پکڑ گئی مگر مسئلہ واضح ہو گیا۔ مجھے اب کوئی ایسا موزون طریق کار درکار ہے جس سے اس مسئلہ کے تمام پہلو صاف دکھائی دینے لگیں اور کوئی شافی نتیجہ نکل سکے۔ طریق کار جو مجھے نہایت مرغوب ہے تنقید ہے۔ آیئے اب مافوق الطبیعی دعوے پر ناقدانہ نظر ڈالیں۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ علمائے مافوق الطبیعیات کا دعویٰ ہے کہ ہم اپنی بشری استعدادوں سے خدا کی حقیقت کو پا سکتے ہیں۔ یہ بشری استعدادیں ہیں کیا؟ اوّل:۔ تحریک باطنی۔ دویم:۔ ادراک یعنی وہ استعداد جس سے ہم اشیاء کی ماہیت دریافت کر سکیں۔

(۱) تحریک باطنی

تحریک باطنی کے مدعی کہتے ہیں کہ یہ مادہ ہر فرد بشر کے اندر موجود ہے۔ اور اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ خدا کو دریافت کرے اور پہچانے۔ اس لئے خدا کو جاننے کیلئے وحی درکار نہیں۔ بشر ہمیشہ سے خدا کی ضرورت باطنی طور پر محسوس کرتا آیا ہے۔ باطنی تحریک کا مادہ جو ہر انسان میں ہوتا ہے رفتہ رفتہ نشو و نما کر ایک پکا خدائی تصور بن جاتا ہے۔ یہ مادہ وحشیوں میں بھی ہوتا ہے اور مہذب انسانوں میں بھی۔ فرق اتنا ہے کہ اس کے ظہور کے مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ وحشی انسان خدا کو کبھی تو ایک بڑا پیپر سمجھتا ہے، کبھی ایک گرجتا ہوا دریا۔ کبھی ایک سر بفلک پہاڑ وغیرہ وغیرہ۔ مہذب انسانوں کے نزدیک خدا

سے قبل ان کا وجود ہی نہ تھا۔

اغلب ہے کہ عہد اسلامی کی صنفی انجمنوں کی بنا پہلی کی مسیحی انجمنوں پر رکھی گئی ہو۔ یہ قیاس قرین عقل ہے کہ پیشہ وروں کی مختلف انجمنیں کچھ نہ کچھ مذہبی رنگ لئے تھیں۔ مسیحی دنیا کے مختلف خطوں میں اب بھی بعض پرانے رسومات موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہر انجمن اپنے اپنے سرپرست ولی کی پرستش کرتی ہے۔ اسلامی خطوں میں ان رسومات نے تصوف کا مذہبی روپ اختیار کر لیا۔ اس تصوف میں طریقت فقر اکثر شامل رہتا تھا اور اس کا تعلق زیادہ تر مبتدیوں سے تھا جس طرح ایک درویش کیلئے ضروری تھا کہ اپنے پیران طریقت کو مانتا ہو اور مختلف موقعوں پر مناسب دعا یا عمل پڑھنا جانتا ہو، اسیطرح پیشہ وروں کو لازم تھا کہ مناسب وظیفے، اعمال اور دعائیں جانتے ہوں تاکہ خدا ان کا مددگار رہے اور ان کے کاموں میں برکت دے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلے پہلے یہ رسومات کسی ایک پیشہ میں شروع ہوئی ہوں اور اس کے بعد دوسرے پیشوں میں بھی اختیار کر لی گئی ہوں۔ یہ امر صحیح نظر آتا ہے کہ نائی کا پیشہ سب سے پرانا اور اصلی پیشہ تھا۔ بہت سے پرانے تمدنوں میں اس پیشہ کا مذہب اور سحر کے ساتھ تعلق رہا ہے۔ اب بھی بہت سے مقامات میں نائی کو سلمانی کہتے ہیں۔ نائیوں کے پیر حضرت سلمان فارسیؓ جو پیغمبر اسلام کے چہیتے غلام تھے سلسلۂ صوفیہ میں بھی بڑے پایہ کے بزرگ سمجھے جاتے ہیں۔ پیشوں اور تصوف کے درمیان بندھن قائم ہو جانے کی ایک وجہ شاید یہ بھی ہو۔

یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ طبقہ کاریگراں زیادہ پرانا ہے یا طبقۂ ملازمین۔ حسب ظاہر نائی، لوہار، سپاہی، بھکاری اور چند اور پیشہ ور پہلے وجود میں آئے۔ جب شہری اور دیہاتی زندگی کچھ ترقی کر چکی۔ تو خاکروب، بافندے، رنگریز وغیرہ ظہور میں آئے۔

لطف یہ ہے کہ چوری بھی ایک علٰحدہ پیشہ تسلیم کی گئی ہے۔ اسی طرح جلاد بھی ایک خاص پیشہ ور ہے۔ حال میں کاشتکار جا بجا مالک زمین ہی کیوں نہ ہو پیشہ ور سمجھا جانے لگا ہے۔ ایران میں ایک دلچسپ کہاوت ہے جس سے مختلف پیشوں کی قدر و منزلت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ کہاوت یہ ہے۔

برزگر مرد ہست و آہنگر پہل اوست
دلاک نیم مرد ہست و درزی زن اوست

(کسان مرد ہے لوہار اس کا پہلوان ہے۔ نائی آدھا مرد ہے اور درزی اس کی عورت ہے)

ہر جگہ عہد وسطیٰ کی بہت سی رسومات کے ساتھ ہی یہ عقیدے اور خیالات بھی کافور ہو رہے ہیں۔ بہت سے اسلامی خطوں میں تو یہ اب نام کو بھی نہیں رہے۔ اب بھی جہاں کہیں ہوں ان "مزدور پیشہ انجمنوں" کو قایم رکھنا بہت سودمند ہوگا۔ کئی اسلامی ممالک میں تو اس بارے میں تھوڑی بہت چھان بین ہو چکی ہے۔ لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ ایسی انجمنیں افغانستان میں بھی رہی ہیں یا نہیں۔ اگر بعض ذکی، وطن پرست طالب العلم کچھ وقت نکال کر اور زحمت اٹھا کر ایسی اطلاعات فراہم کریں جو بعد میں شایع ہو کر ہر ملک کے اہل ذوق کے کام آسکیں تو ان کی یہ کوشش ملل اسلامیہ کی اجتماعی تاریخ کے حق میں ایک بڑی خدمت متصور ہوگی۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے لازم ہوگا کہ بوڑھ

اور پُرانی وضع کے کاریگروں سے ملاجائے اور ان کی معلومات جمع کی جائیں۔ اگر یہ معلومات مناسب اور صحیح طور پر قلمبند کیجائیں تو بہت کار آمد ثابت ہوں گی۔

ہو سکتا ہے کہ ایسی یاد داشتیں اور رسالے ان طالب العلموں کو مل جائیں جنمیں کسی نہ کسی پیشہ کے متعلق خاص قاعدے، افسانے دعائیں وغیرہ لکھی ہوں۔ ایسے نسخوں کی خاص طور سے جو ایک صدی پہلے کی ہوں، بڑی پوچھ ہوگی۔ ان نسخوں کے لئے یورپ کا ہر بڑا کتب خانہ اچھی رقمیں دینے کو تیار ہو جائے گا۔ چاہے یہ نسخے کتنے ہی میلے کچیلے پوشیدہ اور اناڑیوں کے لکھے ہوئے ہوں۔

(ابوالقاسم نجاری)

(بقایا از ۱۰ صفحہ)

آنکھیں باندھ لیجئے اور چھری کو ذرا تیزی سے چلائیے۔ کہ میرا دم جلد اور آسانی سے نکلے۔

مشفق باپ نے پیارے بیٹے کی گردن پر چھری رکھی۔ آسمان پر شور اٹھا۔ جبرائیلؑ نے آواز دی۔ "اللہ اکبر" اسمٰعیلؑ جواب میں بولا "لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر" ابراہیمؑ نے بھی اللہ اکبر وللہ الحمد پڑھا۔ اِدھر حضرت ابراہیمؑ نے زور سے چھری اسمٰعیلؑ کے گردن پر پھیری اُدھر سے آواز آئی:۔

"بس اے ابراہیمؑ بس۔ تونے اپنا خواب سچا کر دکھایا"

حضرت ابراہیم سمجھے کہ اسمٰعیلؑ ذبح ہو چکا ہے۔ اٹھے اور ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ جب آنکھیں کھولیں تو کیا دیکھتے ہیں کہ اسمٰعیلؑ کی جگہہ بھیڑ کا بچہ ذبح ہو چکا ہے۔ خدا فرماتا ہے

"ہم نے ایک بڑی قربانی تیری قربانی کے بدلے دیدی ہے۔ آیندہ نسلوں میں ابراہیمؑ کا ذکر خیر باقی رہیگا	وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ۝ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ
ابراہیم پر سلامتی ہو ہم نیکوں کو اسطرح صلہ دیا کرتے ہیں۔ بیشک ابراہیم ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہے۔	سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ ۝ كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (قرآن)

خداوند کریم نے اپنے بندہ کو ہر آزمائش میں ڈالا لیکن وہ عظیم المرتبت بندۂ خدا ہر امتحان میں کامیاب اُترا۔ خدا راضی اور خوش ہوا۔ قربانی منظور ہو چکی۔ یہ عید الضحیٰ کی قربانی اُس عظیم الشانی قربانی کی یادگار ہے۔ اللہ کا اپنے بندوں سے خوش ہونا اور بندوں کا اس بنا پر خوشیاں منانا، اسی کا نام عید ہے۔ صِرف صاف صاف لباس اور کھانے پینے کا نام عید نہیں۔

(سمندر خان بدرشوی)

داستان نجات

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغ ستم نکلے
(غالبؔ)

ٹرین کی رفتار دھیمی پڑ گئی۔ مارک نے باہر نگاہ ڈالی دیکھا بڑا شہر ہے۔ ہر سمت بجلی کے لمپ جگمگ جگمگ کر رہے ہیں گھڑی دیکھی تو ساڑھے دس۔ برلن آ گیا۔

اپنا بیگ لئے گاڑی سے اترا۔ آگے آگے دو عورتیں جا رہی تھیں جو امریکن معلوم ہوتی تھیں۔ ایک بلند قامت عورت انہیں لینے آئی تھی۔ اس عورت نے کوٹ تو بھونڈا سا پہن رکھا تھا مگر تھی طرحدار۔ اُسنے پلٹ کر مارک کی طرف دیکھا۔ مارک نے دل میں کہا کہ یہ موہنی صورت، یہ صراحی دار گردن، یہ کالی کالی انکھڑیاں، تو پہلے بھی کہیں دیکھی ہیں۔ کھڑا سوچتا رہا۔ مگر یاد نہیں آتا تھا کہ اس حسینہ کو کہاں دیکھا ہے۔

باہر آیا۔ ٹیکسی بلائی۔

ڈرائیور:- کہاں؟

مارک:- سدا بہار ہوٹل۔

ہوٹل آ گیا۔ مارک اپنے کمرے میں بیٹھ کر لگا سگریٹ پینے۔ اندر کے جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ اس پر اس کا پتہ لکھا تھا۔ خط نہیں نکالا۔ ضرورت ہی کیا تھی! اتنی مرتبہ پڑھ چکا تھا کہ سارا مضمون ازبر ہو گیا تھا۔ رہ رہ کے مُہر کو

دیکھتا تھا مگر ڈاک خانہ کا نام پڑھا نہیں جاتا تھا گھنٹوں سوچا کیا، کچھ پلّے نہ پڑا۔ سخت کوفت ہو رہی تھی۔ پھر خط نکالا۔ اس کے مضمون سے بھی پتہ نہ چلتا تھا۔ کہ کہاں سے آیا ہے۔ خط کیا تھا، ایک پُرزے پر اس کی ماں نے پنسل سے لکھا تھا:۔

"پیارے .... تم ٹھیک کہتے تھے کہ مکان نہ بیچو۔ میری مت ماری گئی، بیچ ڈالا۔ رقم مِلگئی ہو تو اسے اپنے نام پارک بنک میں جمع کرا دینا۔ میں ایک چکر میں آگئی ہوں۔ چپکے بیٹھے رہو۔ ایسا نہ ہو کہیں کچھ کر بیٹھو۔ اور میری پریشانیاں اور بڑھ جائیں، دُعا کرو۔ شاید انجام بخیر ہو۔ ہاں پیاری سبینا کے علاج کیلئے ڈاکٹر مِلر ہی موزوں ہے"۔

اِس تحریر سے گھبراہٹ ٹپکتی تھی۔ دیر تک بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ دل میں بس ایک ہی خیال تھا اور وہ یہ کہ فرٹمینز سے ملنا چاہیئے۔ پتہ اسی کے ہاتھ لکھا ہوا تھا۔ اسی نے یہ چِٹھی ڈالی تھی۔ اسے معلوم ہوگا کہ میری ماں کہاں ہے۔ جیسے بھی ہو فرٹمینز کا پتہ چلانا چاہیئے۔

جب یہ چِٹھی مارک کو نیویارک میں ملی تو وہ بہت گھبرا گیا تھا۔ بعد میں اس نے سوچا کہ بے حوصلگی بیکار ہے۔ ہمّت ہی سے کام بن سکتا ہے۔ اس خط کا مضمون بہن سبینا کو نہیں بتایا، اس خیال سے کہ کہیں ہول نہ کھا جائے۔ ماں کے جاننے والوں سے ملا۔ انسے تعارفی چِٹھیاں لیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ ہیننگ برلن میں چوٹی کا وکیل ہے۔ ایک جرمن سے ملاقات ہوئی جو کبھی واشنگٹن کے جرمن سفارت خانہ میں کام کیا کرتا تھا۔ مگر بعد میں اس نے نوکری چھوڑ ایک مالدار امریکن بیوہ سے بیاہ کر لیا تھا۔ مارک نے اسے بتایا: جرمنی جا رہا ہوں۔

—— کب؟

—— پرسوں۔

باتوں باتوں میں وہ جرمن بھانپ گیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ تھوڑی دیر سوچ کر کہا: "میرا کارڈ لئے جاؤ شاید کبھی کام آئے"۔ کارڈ نکالا اور کچھ اُس پر لکھکر کہا: "یہ شخص لگا تو ہے ایک گھناؤنے کام پر مگر ہے بڑی پہنچتی آسامی بلکہ یہ سمجھ لو کہ آجکل وہاں کے چوٹی کے آدمیوں میں ہے"۔ مارک نے شکریہ ادا کیا اور کارڈ لے کر جیب میں ڈال لیا۔ گھر پہنچ کر پڑھا تو برلن کی خفیہ پولیس کے کمشنر سے اس کا بے تکلفانہ انداز میں تعارف کرایا گیا تھا۔

خیر۔ آدھی رات گئے آنکھ لگی۔ سویرے اٹھتے ہی ہیننگ کو ٹیلیفون کیا۔ ملازمہ بولی کہ مسٹر ہیننگ بیمار ہیں اور کسی سے نہیں ملسکتے۔

مارک: ان سے کہو امریکہ سے ایک آسامی آئی ہے

ملازمہ: کہیں کی آسامی ہو۔ وہ نہ مقدمہ لیں گے، نہ کسی سے ملیں گے۔

مارک نے مسٹر ہیننگ کے نام چِٹھی لکھی اور ہوٹل کے ہرکارے کے ہاتھ بھیجدی۔ مسٹر ہیننگ نے فوراً بلوا بھیجا

مارک کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا واقعی بیمار ہے۔
مارک، آپکی طبیعت ناساز ہے۔ میں ایک تکلیف دینے آیا ہوں۔ اور اس کی معافی چاہتا ہوں۔
ہیننگ: تشریف رکھئے۔
مارک: میری والدہ امریکہ سے یہاں لوٹیں تو انہوں نے اپنا مکان بیچ ڈالا۔ اور روپیہ امریکہ میں جمع کرادیا۔
ہیننگ: آپکی والدہ امریکن ہیں؟
مارک: نہیں، البتہ میں اور میری بہن امریکی رعایا ہیں۔
ہیننگ: اوہ! تو آپکی والدہ یہاں کی رعایا اور یہاں کے قوانین کی پابند ہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ ایک نہایت سنگین جرم ہے اور اگر پکڑی گئی تو اس پر مقدمہ چل جائیگا۔ اور سماعت بھی ہوگی ایسی عدالت میں جسکا فیصلہ قابل اپیل ہی نہیں۔
مارک: ضرور جانتی ہوں گی۔ آخر عورت ہی تو ہیں
ہیننگ، کچھ بھی ہو۔ یہاں اس جرم کی سزا تو موت ہے۔
مارک کے تو طوطے اڑ گئے۔
مارک (سنبھلکر): تو اب کیا ہو سکتا ہے۔ آپ ہی میری امداد کریں۔
ہیننگ: میں بیمار ہوں۔ اچھا ہوتا تو بھی کوئی امداد نہ کر سکتا۔ اگر میں ایسے مقدمے لینے لگوں تو بھلا زندہ رہ سکتا ہوں! میرا بھی گھر بار ہے۔ بال بچے ہیں آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ آپ پر قربان کر ڈالوں؟
مارک (اٹھکر)، مجھے افسوس ہے۔ میں نے آپکو ناحق تکلیف دی۔ مجھے امریکہ میں بتایا گیا تھا کہ آپ بڑے دل گردے کے آدمی ہیں۔
ہیننگ (سٹپٹاکر): اچھا آپ کی خاطر میں اتنی ہمت کر سکتا ہوں۔ کہ درخواست رحم لکھہ ڈالوں۔ لیکن سفارش بغیر کام نہیں بننے کا۔ جتنا بھی اثر ڈلوا سکو اتنا ہی آپکی والدہ کے کام آئیگا۔
مارک نے تعارفی خطوط دکھلائے۔ ہیننگ نے سب پڑھے۔ جب وہ کارڈ پڑھا جو کمشنر خفیہ پولیس کے نام تھا تو کچھ متأثر ہوا۔
ہیننگ: لے دے کے اگر کوئی کام آسکتا ہے تو یہ شخص ہے۔ اس کی بہت پہنچ ہے۔
مارک (ٹوپی اٹھاکر): تو میں اجازت چاہتا ہوں۔
ہیننگ: اچھا، اور درخواست رحم کا جو حشر ہوگا آپکو بتا دوں گا۔
مارک وہاں سے سیدھا کمشنر خفیہ پولیس کے دفتر کو روانہ ہوا۔ دل ہی دل میں کہتا تھا کہ یہ شخص (ہیننگ) سلجھا ہوا بھی ہے، سیانا بھی ہے لیکن ہمارے کس کام کا؟ کاش اسمیں دل گردہ ہوتا! اوروں سے کیا امید ہو سکتی ہے
دفتر پہنچا۔ کچھ انتظار کے بعد باریابی ہوئی۔ کمشنر جوان سال ہی تھا۔ مارک سے دو ایک برس بڑا ہوگا۔

کمشنر : مسٹر مارک پرلسینگ، بیٹھئے ۔ جس شخص نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے وہ میرا بہت پُرانا دوست ہے ۔ اچھا، یہ تو بتائیے کارل کا کیا حال ہے ۔

مارک : بہت اچھا ہے ۔ اس نے وہاں شادی کر لی ہے ۔

کمشنر : اوہ ! ان امریکی دلرباؤں کا بُرا ہو۔ اسے بھی ہم سے چھین لیا ! آپ تو مصوّر ہیں ؟

مارک : جی ہاں ۔

کمشنر کی میز پر کچھ کاغذ پڑے تھے معلوم ہوتا تھا ابھی ابھی کسی فائل سے نکالے گئے ہیں ۔

کمشنر : آپ کا تو خاندان ہی مصوّروں کا ہے ۔ آپ کے نانا ریچرڈ ریٹر کی یہاں بڑی دھاک تھی ۔ اور آپ کی والدہ بھی تو اپنے زمانہ میں نہایت ہونہار اداکاروں میں سے تھیں۔ میں نے خود تو اسے نہیں دیکھا البتہ ذکر بہت سنا ہے مجھے بھی تھیٹر دیکھنے کا بہت شوق رہا ہے ۔

کمشنر نے کاغذات پر نگاہ ڈالی اور پھر مارک سے یوں مخاطب ہوا : آپکی والدہ کے متعلق میرے پاس پوری رپورٹ موجود ہے ۔ خلاصہ یہ ہے ، کہ کچھ عرصہ وہ ایک شخص سے خط و کتابت کرتی رہیں جو ہمارا سخت ترین مخالف تھا ۔ کبھی وہ امریکی یونیورسٹیوں میں لکچر بھی دیا کرتا تھا جب یہاں لَوٹا تو خفیہ طور پر پمفلٹیں لکھنے اور باہر بھیجنے لگا ۔ بعض پمفلٹوں کی غرض یہ بتائی جاتی تھی کہ باہر کے سچّے سچّے حالات دکھائے جائیں ۔ بعض میں یہاں کے حالات لکھے ہوئے تھے ۔ آپ کی والدہ امریکہ میں اس شخص کی کارندہ تھیں۔ وہ اب چل بسا ہے ۔

مارک : پمفلٹ بھیجنے والے کو تو سزائے موت اور میری والدہ کیلئے کیا سزا تجویز ہوئی ؟

کمشنر : سچ پوچھئے تو مجھے خبر نہیں ۔

مارک : اور سب کچھ معلوم ہے ۔ سزا معلوم نہیں ! تعجب !

کمشنر : بات یہ ہے ۔ تفتیش کے بعد ہمارے محکمہ کو کچھ دلچسپی نہیں رہتی ۔

مارک : میں کیسے مانوں ؟ پمفلٹ لکھنے والے کی سزا کا تو آپ کو علم ہے ۔

کمشنر : یہ درست ہے ۔ مگر وہ شخص ہماری نگاہ میں بہت اہمیت رکھتا تھا ۔ آپ کی والدہ کی طرح وہ نرا آلۂ کار نہ تھا ۔

مارک : اگر میری والدہ کیلئے بھی سزائے موت تجویز ہوئی ہے ۔ تو آپ کو علم ہونا چاہئے ۔

کمشنر : ابھی نہیں کہاں وہ ۔ کہاں آپکی والدہ ۔ شاید آپکی والدہ کو قید با مشقت کی سزا دیگئی ہو ۔

مارک : تو آپ میری کیا امداد کر سکتے ہیں ۔

کمشنر : امداد ہو ہی کیا سکتی ہے ۔ ہمیں اپنا بھی تو ڈر ہے ۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں ۔ ہر آن یہی کھٹکا رہتا ہے کہ اب دھرے گئے تب دھرے گئے ۔

مارک : تو مجھے کوئی آس نہ رکھنا چاہئے ۔

کمشنر: چونکہ آپ کارل کے دوست ہیں۔ شاید اتنا آپ کو بتا سکوں کہ آپ کی والدہ کیلئے کیا سزا تجویز ہوئی ہے۔ اس سے زیادہ میرے بس کی بات نہیں۔

مارک: تو یہ معلوم کرنے کب آؤں۔

کمشنر: اگلے جمعہ کو۔

مارک: اتنی سی بات کیلئے ایک ہفتہ؟

کمشنر: جی ہاں۔ میں آپ سے مل کر بہت خوش ہوا۔

مارک دل میں یہ کہتا ہوا باہر آیا کہ یہ شخص مدد کر سکتا ہے۔ مگر ڈر کے مارے مدد کرنا نہیں چاہتا۔ اس سے جو توقع تھی وہ بھی جاتی رہی۔ ماں کو بچانے کیلئے اب کیا کیا جائے؟

(م۔ ی۔ د)

آجکل

پندرہ روزہ

پشتو رسالہ "نن پرون" کا اردو ایڈیشن

قیمت فی پرچہ دو آنے

چندہ سالانہ تین روپے

سال دوم	۴ فروری سنہ ۱۹۴۳ء	فہرست	۲۸ محرم الحرام سنہ ۱۳۶۲ھ	نمبر (۱۸)

خط وکتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے:۔

ایڈیٹر:۔ "آج کل" ۱۵ء راجپور روڈ دہلی

طفلی کے خواب

(مجازؔ)

طفلی میں آرزو تھی کسی دل میں ہم بھی ہوں
اِک روز سوز و ساز کی محفل میں ہم بھی ہوں

دل ہو اسیر گیسوئے عنبر سرشت میں
اُلجھے انھیں حسین سلاسِل میں ہم بھی ہوں

چھیڑا ہے ساز حضرت سعدیؒ نے جس جگہ
اُس بوستان کی شوخ عنادل میں ہم بھی ہوں

گائیں ترانے دوشِ ثریّا پہ رکھ کے سر
تاروں سے چھیڑ ہو، مہِ کامل میں ہم بھی ہوں

آزاد ہو کے کشمکشِ عِلم سے کبھی
آشفتگانِ عِشق کی منزل میں ہم بھی ہوں

دیوانہ وار ہم بھی پھریں کوہ و دشت میں
دل دادگانِ شعلۂ محمل میں ہم بھی ہوں

دل کو ہو شاہزادئ مقصد کی دھن لگی
حیرانِ سُراغِ جادۂ منزل میں ہم بھی ہوں

صحرا ہو، خارزار ہو، وادی ہو، آب ہو
اک دن انہیں مہیب منازل میں ہم بھی ہوں

دریائے حشر خیز کی موجوں کو چیر کر
کشتی سمیت دامنِ ساحل میں ہم بھی ہوں

اِک لشکرِ عظیم ہو مصروف کارزار
لشکر کے پیش پیش مقابل میں ہم بھی ہوں

چمکے ہمارے ہاتھ میں بھی تیغِ آب دار
ہنگام جنگ نرغۂ باطل میں ہم بھی ہوں

قدموں پہ جنکے تاج ہیں اقلیمِ دہر کے
ان چند کشتگانِ غمِ دل میں ہم بھی ہوں

تالیفُ یا ترجمہ

۲

(مولنا عبدالقادر خان)

ہر ایک قوم یا ملّت کیلئے جیسے اس کی مخصوص ادبیات کا ہونا ضروری ہے ویسے ہی اُسے اپنی مذہبی اور اخلاقی ضروریات کی تکمیل بھی خود ہی کرنا چاہیئے کیونکہ مذہب اور اخلاقیات کے اصولوں میں گو تبدیلی تو واقع نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی ماحول کے تغیّر و تبدل کے ساتھ ساتھ یہی اصول ایک نئے اور مؤثر طریقہ سے ملّت کے ذہن نشین کرنے چاہئیں ورنہ مشرق وسطیٰ کے دیگر ممالک کیطرح، جو دوسروں کی نقل کرتے کرتے اپنا بھی سب کچھ بھُلا بیٹھے، ہمارا بھی یہی حشر ہوگا اور اس کا اثر اور کہیں جو ہوگا سو ہوگا لیکن ملت افاغنہ میں یہی چیز دائمی افتراق اور تنازعات کا باعث ہوگی۔ افغانوں کی مادی ترقی صرف اُسی حالت میں محفوظ رہ سکتی ہے اور مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب پر مبنی اور اُسمیں ملّی عنعنات، روایات اور قومی جذبات کا خاص خیال رکھا گیا ہو۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ "افغان" کا تصوّر بغیر اسلام کے ہو ہی نہیں سکتا (یعنی جو افغان ہوگا وہ یقیناً مسلمان ہوگا) اور بغیر "پختو" یعنی مخصوص افغانی جذبات کے قومی افغان افغان ہی نہیں کہلایا

جا سکتا۔ چنانچہ اس طویل و عریض کرۂ ارض پر صرف افغان ہی
ایک ایسی قوم ہے جو ایک ہی صفت سے موصوف و موسوم ہے یعنی
صرف یہی قوم اپنی مخصوص افغانی صفات سے پہچانی جاتی ہے
پس ایسی حالت میں جبکہ دنیا کی باقی تمام قومیں کسی خاص علاقہ
کے نام سے موسوم ہوتی ہیں، ملت افاغنہ کی تربیت کوئی شکل
اختیار کرے اسمیں ان دو صفات کی رعایت رکھنا لازمی ہے
یعنی مذہبی اور "پختنو"، یا مخصوص افغانی احساسات۔ اب اگر
کسی نظام ترقی میں ان دونوں میں سے کسی ایک جزو کی تربیت
کیلئے موزوں جگہ نہ ہو تو یہ امید رکھنا کہ وہ نظام (چاہے علمی
ہو) سیاسی یا اقتصادی) کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچ جائیگا
سراسر نادانی ہے۔ نہ صرف یہی بلکہ اس صورت میں نئے خیالات
اور پرانے اخلاقیات کا آپسمیں ایسا سخت تصادم اور لا انتہا
کشمکش کا پیدا ہونا لازمی ہے جسکو دیکھ کر واسعی صاحب کا استفسار
یا دیگر فضلا اور ادباء کی تحقیق و تفتیش دھری کی دھری رہ جائیگی۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ترجمہ اور تالیف کے
درمیان نہ تو کوئی امر حائل و مانع ہے اور نہ ہی ان میں کوئی
خاص حدّ فاصل مقرر کیجا سکتی ہے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں
میں تقدم اور تاخّر کا ایک مستقل امتیاز رکھا جا سکے۔ ضرورت بہرحال
دونوں ہی کی ہے، کبھی ایک کو کام میں لانا پڑیگا اور کبھی دوسرے کو۔
البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان دونوں کے موضوعات کا تعین سوچ سمجھ کر
کرنا ہوگا اور جو کوئی بھی انمیں سے کسی ایک پر طبع آزمائی کرنا چاہے
اسکے لئے پہلی اور لازمی شرط یہ ہے کہ وہ اسکی اہلیت رکھتا ہو۔ چنانچہ
تالیف یا تصنیف کیلئے ایک ایسے متخصص کی ضرورت ہے جو نہ صرف اس مخصوص
شعبۂ علم کا ماہر ہو بلکہ اپنی ماحول کی احساسات، جذبات اور روایات سے بھی کما حقہٗ
واقفیت رکھتا ہو۔ اسی طرح ترجمہ کیلئے بھی ایسا شخص چاہئے جو
اپنی زبان کی ادب، لغت، محاورہ اور اصطلاح سب پر حاوی ہونیکے
علاوہ اس زبان میں بھی کافی دسترس رکھتا ہو جس سے وہ ترجمہ کرے۔
ایک مترجم کیلئے دونوں زبانوں میں مہارت رکھنے کی علاوہ یہ بھی
ضروری ہے کہ وہ زیر ترجمہ کتاب کی نفس مضمون سے بھی واقفیت رکھتا
ہو اور صرف واقفیت ہی نہیں بلکہ اس موضوع کے ساتھ اُسے دلچسپی بھی
ہو، کیونکہ ترجمہ کا اصلی مطلب محض لفظی ترجمہ نہیں بلکہ ترجمہ کا اصل الاصول
یہ ہونا چاہیئے کہ "ترجمہ محض ترجمہ نہ ہو اور پڑھنے والوں کو یہ معلوم نہ ہو
کہ یہ ترجمہ ہے"۔ چنانچہ یورپ کی مختلف ممالک میں تمام تراجم اسی
اصول کو مدنظر رکھ کر کئے جاتے ہیں، پس اگر ملت افاغنہ کے
علماء اور ادباء علمی میدان میں مترقیانہ دوڑ دوڑنا چاہتے ہیں
تو صرف اسی نصب العین کو سامنے رکھ کر وہ کچھ کر سکیں گے!

اب رہا یہ سوال کہ ترجمہ آسان اور سلیس الفاظ میں ہو
یا مشکل اور مغلق الفاظ میں؟ میرے خیال میں اس کی تشریح کی
کوئی خاص ضرورت ہی نہیں۔ ہر موضوع کیلئے ایک خاص اصطلاح
اور مخصوص طرز تحریر ہوا کرتی ہے اور مترجم کو چار و ناچار وہی
راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہاں زبان وہ استعمال کرنا چاہئے
جس سے ہر ایک بآسانی استفادہ کر سکے۔ اپنی زبان کی عام فہم
الفاظ اور اصطلاحات کو چھوڑ کر بلا ضرورت دوسری زبانوں کی
غیر مانوس الفاظ و محاورات کو عبارت میں ٹھونسنا بالکل ایسی ہی
غلطی ہے جیسے کہ اپنی زبان کے الفاظ کو مروڑ کر نئے نئے معانی
نکالنا اور نئے اصطلاحات یا تراکیب کے طور پر استعمال کرنا

تنگ نظری ہے۔ ذہنی غلامی یا دوسروں کے بل بوتہ پر اکڑنا شاید اسی کا نام ہے۔

ہاں البتہ ملّت افاغنہ کے ادباء، مفکرین اور علماء کو ایک اور مشکل درپیش ہے اور وہ یہ کہ قوم افغان منتشر حالت میں دور و دراز مقامات پر پھیلی ہوئی ہے اور ان کے لغت، محاورہ اور اصطلاح میں بہت زیادہ اختلاف ہے۔ پس ایسے حالات میں کہ ابھی تک نہ تو ایک معیاری ادبی زبان معین ہوسکی ہے اور نہ ہی رسم الخط کی مشکلات کا کوئی تشفی بخش حل معلوم ہوسکا ہے۔ ان کے تراجم اور تالیفات و تصنیفات کیونکر ملک کے کونے کونے تک پہنچ سکیں گی اور کس طرح انہیں عمومیت اور مقبولیت حاصل ہو سکے گی؟ یہ ایک اہم اور پیچیدہ سوال ہے۔ دیکھئے شاید ایک مشترکہ جذبہ تمام ملت کو ایک نقطہ پر جمع کرسکے۔ یا پھر سید جمال الدین افغانی کی طرح کوئی رہبر و رہنما مل جائے۔ اُس صورت میں جو لغت یا محاورہ حالات وقت کے مطابق رائج ہو وہی معیاری زبان سمجھی جائیگی۔ اور یا اگر کسی خاص خطّہ میں بکثرت لکھنے والے، ادیب اور شاعر پیدا ہوں اور ان کے تراجم، تالیفات اور تصنیفات اتنے عام اور مستند ہوجائیں کہ باقی سب لوگ انہی سے اخذ کرنے پر مجبور ہوں تو بھی یہ مشکل آسان ہوجائے گی۔ ورنہ بہ صورت موجودہ ملّت افاغنہ کے اس انتشار میں ہماری کوئی بھی تحریر چاہے ترجمہ ہو، تالیف ہو یا تصنیف، مقبول اور عام نہیں ہوسکتی۔

اس تمام بصیرت افروز بحث کا ماحصل یہ ہے کہ ہماری ملّت زمانۂ حال کے علوم وفنون سے استفادہ کرنے کی طرف مائل ہے اور ہمارے نوجوان یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ترجمہ اور تالیف دونوں میں سے کس کو ترجیح دیں۔ حکومت کو چاہیئے کہ اگر ابھی تک اس قسم کے کاموں کو سرانجام دینے کے لئے کوئی ادارہ موجود نہ ہو (میرے خیال میں یہ کام کابل کے "پختنو ٹولنہ" کا ہے) تو وہ فوراً ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھیں جس میں ملّی ضروریات کو سمجھنے والے ہر ایک فن کے چند ایک عالم مقرر ہوں۔ یہ لوگ موضوعات تعیّن کریں اور پھر ان کے لئے موزوں اور قابل کارکن تلاش کریں۔ اور یہ کام خواہ ترجمہ ہو یا تالیف و تصنیف، ایسے لوگوں کے حوالہ کریں جو اس فن میں متخصّص کا درجہ رکھتے ہوں۔ اس کے بعد ہر ایک اپنے اپنے کام پر مامور ہو اور جب اس ادارہ کے متخصّصین کی نگاہ میں یہ کتابیں ہر پہلو سے موزون ثابت ہوں تو شائع کی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنّف یا مؤلف کے کام میں مداخلت نہیں کیجا سکتی لیکن ادارہ مشورہ ضرور دے سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں، جیساکہ میں اس مضمون کے شروع میں عرض کرچکا ہوں، ہمیں دیگر ممالک کی مثالیں سامنے رکھ کر اُن سے استفادہ کرنا چاہیئے۔ اُن کے نقائص سے بچنا اور اُن کی مفید باتوں سے فیض اُٹھانا ہماری ضروریات اور آنے والی ترقی کیلئے کافی ثابت ہوگا۔

والسلام

(عبدالقادر)

رفتارِ زمانہ

روسی محاذ:

سرخ فوج والگا کے ساحل سے سٹالن گراڈ کی طرف دشمنوں کو ڈھکیلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اور دشمنوں کے اڈوں پر کاری ضربیں لگا رہی ہے۔ تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ سرخ فوجیں مغربی مضافات میں گھس پڑی ہیں اور کارخانے کے علاقہ میں بڑی حد تک بڑھ گئی ہیں باوجودیکہ اس علاقہ میں دشمنوں نے پہیم جوابی حملے بھی کئے جن میں بہت سے جرمن قیدی پکڑے گئے اور کافی مالِ غنیمت ہاتھ آیا۔

جرمن شمالی قفقاز میں پیچھے ہٹ رہے ہیں اور سٹاک ہالم کی ایک اطلاع کے بموجب خیال کیا جاتا ہے کہ دشمن نے نوورسسک اور اس خطّے کے علاوہ جو جزیرہ نما کرچے کے بالمقابل واقع ہے تمام قفقاز کو خالی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ایک بہت ہی اہم واقعہ یہ ہے کہ قفقاز اور کراکالمک کی فوجوں نے ملکر ایک مضبوط محاذ بنا لیا ہے اور دشمن کی فوجوں کو ڈھکیلتی ہوئی روستوف کی طرف بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔

وسطی محاذ میں دشمنوں نے ویلیکی لوکی کو دوبارہ فتح کرنے کی جان توڑ کوشش کی لیکن انہیں بہت ہی شدید نقصان اٹھانا پڑا۔

امریکہ کا بجٹ:

امریکہ کا نیا بجٹ ۱۰۰,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر کی کثیر رقم پر مشتمل ہے۔ پریزیڈنٹ روزویلٹ نے اپنے پیغام میں کانگریس کو یوں مخاطب کیا ہے "ہم ایک کلّی لڑائی لڑ رہے ہیں کیونکہ خود ہمارا وجود خطرہ میں ہے۔ اس کلّی لڑائی میں ہم سب سپاہی ہیں، خواہ ہم وردیوں میں ہوں یا شب خوابی کے لباس میں یا نیم آستینوں میں۔ جنگ کے کثیر اور بڑھتے ہوئے مصارف ہمارے اس عزم کا پتہ دیتے ہیں کہ ہم اپنی اور اتحادی فوجوں کو اُن تمام ہتھیاروں سے مسلح کر رہے ہیں جو فتح کیلئے ضروری ہیں۔" آگے چل کر انہوں نے یہ بھی کہا کہ "۱۹۴۳ء میں موجودہ ضروریات کے علاوہ فوجی خدمات اور جنگی پیداوار کے سلسلہ میں ۶۰ لاکھ کی اور ضرورت ہوگی۔" اُن کی پیشین گوئی کے مطابق ۱۹۴۴ء میں مصارف کا اوسط تقریباً ۸,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر ماہوار سے زائد ہوگا۔

ترکی:

ترکی اور اُس کے سچے دوستوں اور خصوصاً برطانیہ کے درمیان جو تجارت ہو رہی ہے اُس میں

۱۹۴۰ء سے مسلسل ترقی کے آثار نظر آتے ہیں۔
سنہ مذکور کے شروع میں اطالیہ کا نمبر ترکی سے تجارت
کرنے والے ملکوں میں سب سے پہلا تھا - امداد باہمی کے
عہدنامہ کے بعد بھی جو فرانس، برطانیہ اور ترکی کے
درمیان ہوا تھا، برطانیہ کا نمبر چوتھا تھا اور امریکہ
اور رومانیہ کے بعد آتا تھا - جنوری سے لیکر جون ۱۹۴۲ء
تک اتحادیوں نے جو سامان ترکی کو بھیجا ہے اس میں بہت
کافی اضافہ نظر آتا ہے - یعنی ڈیڑھ کروڑ پونڈ (علاوہ
جنگی سامان کے) جبکہ ۱۹۴۱ء کی اس سے زیادہ طویل مدت
میں صرف ۳۵ لاکھ پونڈ کا مال بھیجا گیا - یہ اضافہ استنبول
بغداد ریلوے کی تکمیل اور ترکی، شام اور عراق کی محکمہ
ریل کے سمجھوتہ کا نتیجہ ہے جس کی وجہ سے رسل و رسائل
کا سلسلہ قائم ہو گیا ہے۔

ہندوستان :

نامور ترکی جرنلسٹوں کی آمد کو ہندوستان بھر میں نہایت دلچسپی سے دیکھا جا رہا ہے۔
افغانان سرحد میں قدرتی طور پر خاص جوش پیدا ہو رہا ہے اسلئے کہ دو ہی سال ہوئے
انکو ایک ترکی فوجی مشن سے جو افغانستان کے راستہ سے ہندوستان آیا ملنے کا موقع
ملا تھا۔ کراچی پہنچکر صدر وفد نے بڑا اطمینان ظاہر کیا کہ انہیں ہندوستان جیسے قدیمی اور
شاندار روایات رکھنے والے ملک کو دیکھنے کا موقعہ ملا اور یہ بھی فرمایا کہ ممبران وفد
کی خواہش ہے کہ اس تھوڑی سے وقت میں جہانتک ممکن ہو اس عظیم الشان براعظم
کے جملہ باشندگان کے اوضاع اور احوال سے واقفیت حاصل کریں۔
یہ وفد ۱۶ جنوری کو ہوائی جہاز کے ذریعہ سے کراچی پہنچا اور گورنمنٹ ہند
کیطرف سے میجر مرزا عثمان علی بیگ صاحب۔ ایم۔ بی۔ ای (انڈین پولیٹیکل سروس) اور
سید علی جواد صاحب ڈپٹی پبلک ریلیشنز آفیسر نے انکا خیر مقدم کیا۔ ممبران وفد
ہندوستان کو ساری بڑے بڑے مقامات میں تشریف فرما ہونگے۔ تاکہ یہاں کی
پرامن زندگی اور جنگی تیاری کے تمام پہلوؤں کا خود اندازہ لگا سکیں۔ دہلی
میں نوابزادہ لیاقت علی خاں صاحب کی طرف سے ممبران وفد کو دعوت "لنچ" اور
روزنامہ "ڈان" کے ایڈیٹوریل سٹاف کی طرف سے دعوت چائے دیجائیگی۔

برطانیہ :

ایک برطانوی بیڑا ٹینک اور دیگر جنگی سامان کے ساتھ بخیر و خوبی
شمالی روس پہنچ گیا۔ اس بیڑے پر ناروے کے شمال میں جتنے بھی حملے ہوئے
انکا جنگی جہازوں نے کامیابی سے مقابلہ کیا۔ یہ برطانوی
بحری طاقت کی فوقیت کا ایک دوسرا بڑا مظاہرہ ہے
اور ساتھ ہی ساتھ برطانیہ کے اس عزم کا ثبوت ہے کہ
وہ بہادر روسیوں کو تمام خطرات کے باوجود مدد دینگے
جس کا انہوں نے وعدہ کیا ہے۔

افغانستان

۷ جنوری ۱۹۴۳ء کو بمقام کابل قانون اور سیاسیات
کے فارغ التحصیل طلباء کو سندات عطا کرنے کی رسم ادا کیگئی۔ یہ رسم
والا حضرت وزیر اعظم افغانستان نے ادا کی۔ موصوف کے علاوہ
وزیر تعلیم اور دیگر وزرا نے بھی اس رسم میں شرکت فرمائی۔ اس
موقعہ پر پرنسپل صاحب نے قانون اور سیاسیات کی اہمیت پر ایک
بصیرت افروز تقریر کی اور فرمایا کہ دارالعلوم میں ان نئے شعبوں
کی کامیابی کا سہرا تمامتر والا حضرت وزیر اعظم اور وزیر تعلیم
کے سر ہے۔ موصوف نے توقع ظاہر کی کہ فارغ التحصیل طلباء
اپنے علم اور لیاقت سے قوم اور ملک کی بہترین خدمات سرانجام
دیں گے۔

اگرچہ سیاسی لحاظ سی افغانستان سی صرف حکومتِ افغانستان کا زیر اثر علاقہ مراد ہے لیکن افغانستان کے معنوی پہلو پر ذرا غور کرنے سی معلوم ہوگا کہ نہ صرف جغرافیائی بلکہ نسلی اور لسانی اعتبار سی بھی تمام صوبہ سرحد اور ماورائے سرحد یعنی علاقہ غیر اور افغانستان صحیح معنوں میں افغانستان یعنی افغانوں کا مسکن ہیں۔ اِسلئے ضروری ہے کہ ہمارے قارئینِ کرام اس تمام علاقہ سے جن میں اُن کے بھائی رہتے ہیں اچھی طرح واقف ہوں۔ لیکن ہندوستان کے لوگ تو سرحد پار کے متعلق بہت ہی کم علم رکھتے ہیں اہل سرحد میں بھی ہزاروں ایسے ہیں جو فرانس اور جرمنی کی سرحد پر رہنے والوں سی تو خوب باخبر ہیں لیکن پڑوس میں اپنے ہم زبان اور ہم قوم بھائیوں کی بابت بہت کم جانتے ہیں۔ چنانچہ ہم آج کی صحبت میں سرحد پار کے ایک قبیلے کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قبیلہ ضلع ہزارہ کے شمال میں تحصیل مانسہرہ کے سرحد پر درہ ٹکری میں آباد ہے۔ اِس قبیلے کا نام دیشی (دیشئے) ہے اور اُنکے علاقہ کو قبیلہ کے نام سی دیشان بھی کہتے ہیں۔ بلحاظ قدرتی مناظر آب وہوا، اور زرخیزی کے اگر اس قبیلہ کو تمام علاقہ غیر کا دل کہیں تو بیجا نہ ہوگا۔

دیشی قبیلہ قوم صواتی کی شاخ ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ افغان قوم جو اب صواتی کہلاتی ہے درانیوں کے عہد میں صوات، مالاکنڈ اور ضلع مردان سی چلکر دریائے سندھ کے پار درانیوں اور دوسری قوموں کو مغلوب کرتی شمالی ہزارہ اور تمام ملحقہ علاقہ غیر پر قابض ہوگئی۔ اس قوم نے مفتوحہ علاقہ کو یوں تقسیم کیا کہ ہر قبیلہ کو میدانی اور پہاڑی دونوں قسم کی زمین ملی۔ اسلئے ہر قبیلہ کو تحصیل مانسہرہ کے میدانوں اور علاقہ غیر کے دّروں یعنی دونوں جگہوں میں بسنا پڑا۔ انگریزی عملداری کے بعد علاقہ غیر کے صواتیوں نے سرکاری علاقہ کے صواتیوں کے ساتھ تبادلۂ اراضی کیا۔

لیکن پھر بھی بعض قبیلوں کی جائدادیں دونوں جگہ اب تک موجود ہیں۔ اس قسم کی تقسیم سی قوم میں وحدت اور اتفاق قائم رکھنا مقصود تھا۔ تاکہ علاوہ اور فوائد کے بیرونی حملوں کے وقت مشترکہ مفاد کی خاطر سب ملکر دشمن کا مقابلہ کریں۔ اب یہ رابطہ اور اتحاد باقی نہیں رہا۔ اس لئے سرکاری علاقے کے صواتیوں پر قوم جدون کی طرح غیر پشتون قوموں کا اثر ہوتا جا رہا ہے۔ اُن کی تقسیم اراضی اس قدر جامع اور معقول تھی کہ حکومت انگریزی نے مجبوراً اُسی تقسیم پر مہر تصدیق کردی۔ کیونکہ عملۂ بندوبست اس سی بہتر اور موزون تقسیم پیش نہ کرسکا۔

اب تو کیا علاقہ غیر اور کیا سرکاری سب جگہ مستقل حق ملکیت تسلیم ہو چکا ہے۔ علاقہ سرکار میں ضابطۂ مال کی

رُو سے اور علاقہ غیر میں رواج، جرگہ اور شریعت کی بنا پر۔
لیکن دیشی قوم جسکا ذکر مقصود ہی اب تک تقسیم اراضی و مکانات
کے اُن پرانے نظریوں پر قائم ہے جو کئی سو سال پہلے افغان قوم
کے بزرگوں نے قائم کئے تھے۔ یہ قوم اس تقسیم کو اپنے بزرگوں کی
طرح ویسا ہی مفید اور موزوں سمجھتی ہے۔ یہ نادر تقسیم اراضی
اُنکے تمام بود و باش اور تمدن پر اثر انداز ہے۔ اسلئے عادات،
اطوار، رواج و مراسم میں بھی یہ قبیلہ اپنی مثال آپ ہی۔ اُنکے
نزدیک زمین اور مکان قبیلے کی مشترکہ ملکیت ہی۔ سب کو برابر
حق پہنچتا ہے کہ اُس سی فائدہ اُٹھائے۔ اِس غرض کیلئے وہ ہر
بارہ سال کے بعد زمینوں کا بندوبست کرتے ہیں۔ یہ سرکاری
بندوبست کی طرح زمین کی نئے سرے سی پیمایش اور زمین کی
حیثیت لگان معلوم نہیں کرتے بلکہ تمام علاقہ کو تمام افراد قبیلہ
میں از سر نو تقسیم کرتے ہیں۔ اسلئے اِس بندوبست کو وہ ویش
یعنی تقسیم کہتے ہیں۔ اس قبیلہ کی افراد اکثر ہندوستان سی باہر
جزائر شرق الہند اور امریکہ میں آپکو کاروبار کرتے نظر آئیں گے۔
لیکن ہر بارہ سال کے بعد اُن کا وطن آنا ضروری ہے تاکہ تقسیم
میں حصہ لے سکیں۔ حُبِّ وطن کا اِس سی اندازہ کیجئے کہ یہ لوگ لاکھوں
روپئیوں کا کاروبار چھوڑ کر سفر کی تکالیف کی پروانہ کرکے خاکِ وطن
میں حصہ حاصل کرنے کیلئے دوڑے چلے آتے ہیں۔

اِس تقسیم کا اہتمام قبیلہ کے چند بزرگ سردار، علماء دین
کی امداد سی کرتے ہیں۔ چند منشی بھی مقرر ہیں۔ جنکے پاس گذشتہ
تقسیم کا ریکارڈ تمام افراد کا شمار، پیدایش اور اموات کا حساب
رہتا ہے۔ قوم سی باہر شادی کرنے والی عورتوں اور باہر سی
قوم میں آنے والی عورتوں کا ریکارڈ بھی اُن کے پاس رہتا ہے۔
اس قوم کی عورت کا حصہ دوسری قوم میں بیاہے جانے پر تلف
ہو جاتا ہے اور باہر سی آنے والی عورت کا حصہ مقرر ہو جاتا ہے
اِسلئے بہت کم عورتیں باہر جاتی ہیں اور یوں اُنکی نسل خراب نہیں
ہونے پاتی۔ اس کے علاوہ اُن افراد کا حصہ بھی اُنکے خاندان
میں رہتا ہے جو قومی لڑائی میں شہید ہوئے ہوں۔ ایسے حصے کو
شیخ مَلّی موٹئے کہتے ہیں یعنی شیخ ملی کا حصہ (یاد رہے کہ
شیخ مَلّی افغان قوم کا سردار اور اس تقسیم کا بانی ہے) موٹئے
سے مراد حصہ ہے (بعض صواتی قبیلوں میں لکڑہ اور صوات میں
پاؤ کہتے ہیں) اس موٹئے یا حصہ میں ہر قسم کی زمین شامل
ہوتی ہے۔ خاندان میں جتنے افراد ہوں اتنے حصے مقرر ہوتے
ہیں۔ علماء دین کو جو حصے ملتے ہیں وہ اس کے علاوہ ہیں۔ اُنہیں
اپنے حصہ کے علاوہ مذہبی خدمات کے عوض میں بھی کچھ حصے
دئے جاتے ہیں جسکو سیرئے کہتے ہیں

تقسیم کا عجیب و غریب طریقہ بھی سُن لیجئے۔ تمام قبیلہ بلالحاظ
جنس و عمر، ایک مشہور درخت کے نیچے مقررہ تاریخ پر جمع ہو جاتا ہے
قبیلہ کے سردار، علماء دین اور منشی بھی اُس درخت کے نیچے آکر
بیٹھ جاتے ہیں۔ قبیلے کی سب خاندانوں کے نام اور حصوں کی قرعے
ایک معصوم بچے کی جھولی میں ڈالدئے جاتے ہیں تاکہ وہ قرعے
نکال نکال کر تمام قبیلے کی قسمت کا فیصلہ کرے۔ یہ نظارہ دیکھنے
سے تعلق رکھتا ہے۔ ہر شخص کی نظر شجر مقسوم پر لگی ہوتی ہے۔
چہرے مشوش اور دل بیتاب ہوتے ہیں کہ قسمت کا فیصلہ سن کر
زندگی از سر نو شروع کریں۔ جنکو حسب منشاء جگہ ملجاتی ہی اُنکی

خوشی کا کیا کہنا، فوراً گانا بجانا۔ ڈھول نفیری اور ناچنا شروع کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ کم نصیب خوش نصیبوں کی خوشی میں برابر کے شریک اور خوش نصیب کم نصیبوں کے ساتھ پوری پوری ہمدردی اور غمگساری کرتے ہیں۔ جذباتی نمایش سے قطع نظر وہ سب اپنی قسمت پر شاکر نظر آتے ہیں اور اس تقسیم کو فطری سمجھ کر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد سب اپنے اپنے مال مویشی اور گھر بار کے سامان کے ساتھ نقل مکانی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انسان کے دل میں مہذب دنیا کی کالج اور یونیورسٹیوں کی الاٹمنٹ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ لیکن کہاں وہ فطری اور معصومانہ شان اور کہاں رعایتوں اور سفارشوں کی بنیاد پر کمروں کا ملنا۔ مصلحت کی آڑ میں ہزاروں بہانے۔ ان باتوں کو اس قدرتی فضا میں بسنے والے بھلا کیا جانیں۔

اس قسم کی تقسیم ابتداء میں تمام صواتی قوم میں رائج تھی۔ ریاست صوات۔ مالاکنڈ میں مدتوں یہ تقسیم جاری رہی۔ لیکن وہ خان گردی جسکی وجہ سے یہ تقسیم بدنام ہو چکی تھی دیشی قوم میں نام کو نہیں۔ خان کے نام سے تو انہیں چڑھ ہے۔ اگرچہ گرد و نواح کا تمام علاقہ اس خان گردی سے متاثر ہے لیکن یہ اشتراکیت ہی کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں اور کسی قیمت پر بھی اسے چھوڑنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ تین چار سال پہلے علاقہ غیر کے ایک جابر خان نے ان کو عزیز سمجھ کر ان کے علاقہ پر حملہ بول دیا۔ شروع شروع میں تو اسکو کامیابی ہوئی اور چند سنگرے یعنی قلعے بھی اُسنے لے لئے

لیکن دیشی قوم میں وہ ہیجان پیدا ہوا کہ خدا کی پناہ۔ دُنیا میں جہاں بھی کوئی دیشی فرد تھا اپنی بندوق سنبھالے وہاں پہنچا یا پھر مالی امداد بھیجی۔ وہاں کے دیشی لوگوں نے تو جان و مال اور اولاد سب کچھ وطن کیلئے قربان کر دیا۔ آخر وطن کو دشمن کے چنگل سے چھڑا کر دم لیا۔ اس قوم کی تاریخ میں کبھی یہ نہیں ہوا کہ انہوں نے خود جارحانہ قدم اٹھایا ہو۔ ہاں البتہ وطن کی مدافعت کو وہ جزو ایمان سمجھتے ہیں۔

نقاد کیلئے اس تقسیم میں قبح کا ایک پہلو ضرور نکلتا ہے کہ اس قسم کی تقسیم سے نہ تو باشندے دل لگا کر مکان تعمیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی زمین ترقی کر سکتی ہے۔ زمین سے خوراک پیدا کرنے کے مسئلہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا کیونکہ چپہ چپہ زمین سے خوراک حاصل کیجاتی ہے۔ بہت سے بیکار نوجوان وطن سے باہر کمانے کیلئے چلے جاتے ہیں۔ مکان ضرور کچے رہتے ہیں لیکن وہ ان تمام باتوں کو سمجھتے ہوئے اس نظام پر اس لئے فدا ہیں کہ اس میں فوائد بہ نسبت عیوب کے زیادہ پائے جاتے ہیں۔

دیشی باشندے حقیقت میں ایک دوسرے کے عزیز ہیں۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ آپ کے ہاں کس کی حکومت ہے؟ تو وہ جواب دیں گے "کہ یہاں عزیز بستے ہیں اور ہم ایک دوسرے کے عزیز ہیں" لفظ عزیز کا مقابلہ کامریڈ یعنی رفیق سے کیجئے جو زمانہ حال کی اختراع ہے۔ افغان قوم کے لفظ عزیز سے افغانوں کے قدیم تمدن کا اندازہ کیجئے۔ کتنا پیارا تمدن ہوگا جسکی جھلک دیشی قوم میں اب بھی موجود ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے یہ عزیزوں کی قوم ہے۔ خانگی معاملات اور تنازعات کا فیصلہ مختلف خیلوں کے معمّر سرداروں اور علماء دین کے ہاتھ ہوتا ہے کسی کو اُنکے فیصلہ سے انکار کی مجال نہیں۔ جرمانہ کی رقم قومی کاموں میں خرچ ہوتی ہے۔ مستغیث کو بعد تحقیقات معاوضہ دیکر راضی کیا جاتا ہے۔ جرائم بہت کم ہیں اور ایسی فضا میں بھلا جرائم ترقی ہی کب کر سکتے ہیں۔

قدرتی مناظر کے لحاظ سے اس خطہ کو علاقہ غیر کا کشمیر کہنا بیجا نہیں۔ حقیقت میں یہ کشمیر ہی کا حصہ ہے لیکن اِس کے گھنے گھنے سیاہ جنگلات، سبز پہاڑ، ہرے ہرے کھیتوں کے زینے، وادیوں میں چاول کے کھیت اور سب سے نیچے خاموش اور گھومتی گھامتی ندیاں عجیب دلکش نظارے پیدا کرتی ہیں۔ منتشر سادہ اور کچے مکان اُس مخملی پہاڑوں میں نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے ہیں۔ الغرض یہ خوبصورت نظاروں کا گھر ہے۔ نشیب میں چاول، ڈھلوانوں پر مکی اور ان کے علاوہ گیہوں اور جو بھی بویا جاتا ہے۔ مویشی بکثرت ہیں۔ گھی باہر جاتا ہے۔ لکڑی کے کونڈے، چمچے، گلاس، کمان اور ہل کا سامان بنتا ہے۔ اعلےٰ صنعتی لکڑی اِن کو میسّر ہے لیکن لکڑی کا باریک آرائشی کام نہیں ہوتا۔ انہیں سادہ ضروریات زندگی سے زیادہ تعلق ہے۔

باشندے تمام کاشتکار ہیں۔ بیکار نوجوان بیرونِ ہند مختلف ممالک میں نوکری اور دیگر کاروبار کرتے ہیں۔ قد و قامت، صحت اور شکل و صورت میں وہ تمام علاقہ غیر میں سب سے بڑھ کر ہیں۔ صنفِ نازک کی خوبصورتی میں کشمیر بھی اِس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ صحت، جفاکشی اور بہادری اگر یکجا دیکھنا ہو تو دیشی عورت کو سب سے ممتاز پاؤ گے۔ گھر کے تمام کاروبار کے علاوہ مویشی پالنا، جنگل سے لکڑی کاٹنا اور گاہے گاہے ہل بھی جوتنا دیشی عورت کا کام ہے۔ مرد زیادہ تر ہل جوتتے اور فصل کے متعلق موٹا موٹا کام کرتے ہیں۔ باقی وقت بندوق لئے حجروں میں گذارتے ہیں۔ جنگ کے وقت مورچوں میں روٹی، پانی کارتوس وغیرہ پہنچانا عورت کا کام ہے۔ دیگر قبائل کی قابل قدر روایات کی طرح یہ قوم بھی جنگ کے دوران میں عورت پر کسی قسم کا وار کرنا ناجائز اور افغانی غیرت کے منافی سمجھتی ہے۔ اس لئے جنگ کے وقت بھی عورتیں تمام کاروبار حسب معمول کرتی رہتی ہیں۔ لیکن اس قوم کی امتیازی بات یہ ہے کہ عورت کو اس کے ہاں بمقابلہ دوسرے قبائل کے بہت بڑا درجہ حاصل ہے یعنی ملک کی تقسیم میں اس کا حصہ مرد کے برابر ہے۔ دیشی عورت گھر کی صحیح معنوں میں مالکہ ہوتی ہے اور مرد اس کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔

جیسا اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ اِس قبیلہ کی بعض خوبیاں تقریباً ہر افغانی قبیلہ میں موجود ہیں۔ بلکہ یہ مخصوص باتیں بھی جو اس قبیلہ میں پائی جاتی ہیں ایک دن تمام افغانوں کی مشترکہ ملکیّت تھیں۔ لیکن جبکہ تمام افغان اپنی خصوصیّات کھو رہے ہیں، اس قبیلہ کا اُن تمام شاندار روایات کو قائم رکھنا بہت زیادہ قابل ستائش ہے۔

(عبدالرؤف)

مراسلہ

پشتو رسم الخط

محمد نواز خان خٹک ۔ شیدو۔

مظلوم صاحب ایک جگہ فرماتے ہیں "پرانی غلط روش کو نہ چھوڑنا اور جدید بہتر خیالات کو نہ قبول کرنا سراسر نادانی ہے" اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں "دریا کے پایاب حصہ کو چھوڑ کر ادھا دھند دریا میں کود پڑنا بے وقوفی ہے" میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ موصوف کا ان الفاظ سے کیا مطلب ہے۔

ان فقروں سے مجھے حبیب چچا کی ایک بات یاد آئی۔ حبیب چچا میرے ایک دوست کے ہاں نوکر تھے۔ ایک دن مالک نے ان سے کہا کہ ذرا باہر تو دیکھنا مینہ برس رہا ہے یا نہیں۔ حبیب چچا نے جواب دیا کہ "آپ اِسی بارش کو ہہ بھی سکتے ہیں اور نہیں بھی" مالک نے پوچھا "یہ کس طرح؟" جواب دیا "برسنے کو تو کچھ ترشح ہو رہا ہے لیکن اتنی مدت کے بعد اور اس قدر کم مقدار میں مینہ برسنا نہ برسنے کے برابر ہے۔ کیونکہ نہ تو اس میں فصل بوئی جا سکتی ہے اور نہ زمین ہی گیلی ہو سکتی ہے۔ پس ایسی حالت میں بارش ہے بھی اور نہیں بھی" اسی طرح جب مظلوم صاحب فرماتے ہیں کہ مولانا صاحب پشتو زبان میں انقلاب بپا کرنا اور میٹھے پانی کے چشمے کی سطح سے کوڑا کرکٹ ایک طرف کرنا چاہتے ہیں، تو شروع شروع میں موصوف انکی خوب مخالفت کرتے ہیں لیکن مضمون کے آخر میں انکی حمایت پر کمر باندھی نظر آتے ہیں۔ یہ سب کچھ پڑھکر غالب مرحوم کا شعر یاد آتا ہے ؎

آگہی دام شنیدن جسقدر چاہے بچھائے
مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ "تحریر" کا

موصوف مولانا صاحب اور میاں صاحب کی رائے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ انقلاب کا حامی ہونے پر بھی پروفیسر صاحب سے جھگڑتے ہیں مولانا صاحب کے خیالات سے اختلاف کے باوجود ہمدردی اور دیگر ادباء کی تعریف و توصیف کرتے ہیں اور اس پر طرّہ یہ کہ آخر میں اپنی ذاتی رائے پیش کرنے کی جرأت تک نہیں کرتے۔ ہاں البتہ پشتو زبان کی اصلاح کیلئے کانفرنس کا انعقاد ضروری سمجھتے ہیں۔ انکی نزدیک اہل افغانستان پشتو زبان کو خراب کر رہے ہیں۔ موصوف اپنی آپ کو افغانستان کے مقابلے میں بے بس نہیں سمجھتے لیکن پھر بھی حکومت افغانستان سے اپیل کرتے ہیں کہ زبان کی اصلاح کے متعلق کوئی اقدام کرنا اُسی کو زیبا ہے۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان۔ وہی گول مول اور بے تکی باتیں۔ لیکن اِس بے تکی میں بھی بعض اوقات نشانہ ٹھیک بیٹھ جاتا ہے۔ جیسے سعدی علیہ الرحمۃ

نے فرمایا ہے۔ ؎

گاہ باشد کہ کودکِ ناداں　　بہ غلط بر ہدف زند تیرے

گاہ باشد کہ از مدبر کار　　بر نیاید درست تدبیرے

کپلنگ نے ایک بار کہا تھا "مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب" آپ کے تتبع میں مظلوم صاحب فرماتے ہیں "اپنی چیز اپنی اور پرائی پرائی ہوتی ہے" نازک خیالی ملاحظہ ہو۔ سبحان اللہ۔ بہ تو "دندان تو جملہ در دہان اند" والا معاملہ ہے۔ یوں تو موصوف کا مضمون زبان کی سلاست اور ترتیب کے لحاظ سے قابل تعریف ہے لیکن اس کا مطلب شاید موصوف خود بھی نہیں سمجھتے۔ اردو شاعر نے اسی موقع کیلئے کہا ہے :-

ٹوٹی دریا کی کلائی　　زلف الجھی بام میں

مورچہ مخمل میں دیکھا　　آدمی بادام میں

شعر اور بندش کے لحاظ سے تو شعر خوب ہے لیکن اسکا مطلب کون سمجھے ؟

آخر میں یہ عرض ہے کہ مولٰنا صاحب، پروفیسر صاحب، اور فضل حق شیدا، ایک دوسرے کے ہم خیال ہیں اور باقی ادباء دوسرے خیال کے ہیں۔ موخر الذکر عربی رسم الخط اور رائج پشتو کو معیاری قرار دیتے ہیں۔ وہ اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ پشتو رسم الخط کے بانی نے بہت کاوش سے کام لیا تھا۔ وہ پرانے رسم الخط کو درست سمجھ کر اس میں کسی قسم کی تبدیلی مناسب نہیں سمجھتے۔ البتہ بعض قندہاری رسم الخط پسند کرتے ہیں اور بعض میانہ روی سے کام لیتے ہیں۔ سید انوار الحق صاحب اور خلیق صاحب کے درمیان معمولی ابہام و تفہیم سی سمجھوتا ہو سکتا ہے۔ بہر حال یہ دوسرا فریق قریب قریب ہم خیال ہے۔ اب مناسب یہ ہے کہ ان ساری تجاویز کو جواب تک پیش کی گئی ہیں پرکھا جائے اور ان کے دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے۔

زیر بحث مسائل صرف یہ تین ہیں۔ اردو نستعلیق۔ لاطینی رسم الخط اور موجودہ رسم الخط۔ حروف تہجی کی کمی یا زیادتی کو اک علٰحدہ مسئلہ سمجھنا چاہیئے۔ میں تو اپنے آپ کو قدامت پسندوں کے گروہ میں شمار کرتا ہوں۔ ان جدید خیالات کا ہرگز حامی نہیں جو مولانا صاحب، پروفیسر صاحب اور شیدا صاحب نے ظاہر کئے ہیں۔ البتہ خلیق صاحب اور سید انوار الحق صاحب کی تجاویز کو ضرور قابل غور سمجھتا ہوں۔

۱۰ ر اکتوبر ۱۹۴۲ء کے "نن پردن" کے صفحہ ۱۲ پر مظلوم صاحب فرماتے ہیں "اگر مجھے موقعہ دیا گیا اور کیوں نہ دیا جائیگا" میں نہیں سمجھتا کہ "کیوں نہ دیا جائے گا" صرف قلم کی شوخی ہے یا کسی قانونی دفعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اگر قانون کی طرف اشارہ ہو تو مجھے خاموش رہنا چاہیئے اور اگر یہ اُن کی ادبی شوخی کا اظہار ہے تو پھر میں بھی کیوں نہ کہوں کہ میرا یہ تنقیدی مضمون ضرور شائع ہوگا اور کیوں نہ شائع ہو۔

آپ کا کیا خیال ہے ؟

محمد نواز خٹک شیدو۔

سویٹ جرمن جنگ

از سردار جعفری

یہ بہت طویل نظم ہے۔ یہاں صرف چند ٹکڑے چھاپے جا رہے ہیں۔

رات کے سینۂ تاریک پہ مبہم سے خطوط
چند رنگین نقوش
پھیل جانے کا بکھر جانے کا ارماں لئے،
اور مغرب کی طرف تاروں کی ڈھلتی ہوئی چھاؤں
آسمان عشرتِ نوروز کا سامان لئے،
زیرِ دامانِ اُفق نورِ سحر کی لہریں
تلملاتی ہوئی، بہتی ہوئی، بل کھاتی ہوئی،
اور اندھیرے کا وہ دھنستا ہوا ساحل یعنی
شب کی کھوئی ہوئی عظمت کا مزار
تند موجوں کے تھپیڑوں کا شکار
یورشِ مہرِ جہاں تاب سے گھبرایا ہوا۔
یوں ہی فاشست اندھیری کو بھی پرخاش سی ہے
سویت روس کے رنگین شفق زاروں سے۔

یوں تو دنیا میں تھا پہلے بھی تمدن کا نشاں
اور تہذیب کے بُت خانے تھے
علم اور فضل کے میخانے تھے
مَست ہیلن کی جوانی کی شراب
حُسن اور عشق کی دیوی کا شباب
روم کے قصر بھی تھے مصر کے اہرام بھی تھے
ہند و یونان کے اصنام بھی تھے،
یہ تو سب کچھ تھا مگر ایک محبت ہی نہ تھی
دل میں انسان کے انسان کی قیمت ہی نہ تھی،
زندگانی کا محل سر بہ فلک تھا لیکن
اس کی اینٹوں میں تھا انساں کے لہو کا گارہ،
اس کے دروازوں میں تلواروں کی محرابیں تھیں،
اس کی دیواروں کے سائے کے تلے
نظر آتے تھے وہ سڑتے ہوئے گلتے ہوئے جسم
شمع کی طرح پگھلتے ہوئے جسم
گرم تھا جن کی حرارت سے شبستانِ نشاط،
اس حسین قصر کے ایوانوں میں
صرف ضو پاش تھی انسان کے ستم کی قندیل۔

ظلم کی فوج ستم کے لشکر،

آتش و زہر کے طوفان، تباہی کے بھنور،
آندھیاں وحشت و تاراجی و ویرانی کی،
سینکڑوں بھوت ہزاروں جنّات،
لاکھوں بدذات کروڑوں شیطان
حرص اور آز کے گھوڑوں پہ سوار
اہلِ یورپ کا لہو پی کے نشے میں مدہوش
خون کی پیاس بجھانے کے لئے
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلے آتے ہیں۔

سُن کے دشمن کے قدم کی آہٹ
آ گیا تیل کے چشموں میں اُبال،
اور ہر خوشۂ گندم نے گہرباری کی
کروٹیں آہن و فولاد نے لیں معدن میں
کارخانوں میں مشینوں کے دھڑکنے لگے دل
اور توپوں کے گرجنے کی صدا آنے لگی،
بڑھ گیا اور بھی البرز کی چوٹی کا وقار
ہر جواں مرد نے انگڑائی لی،
گردنیں تن گئیں رہواروں کی
گونج اُٹھے دشت و جبل تیغوں کی جھنکاروں سے،
پرفشاں جنگ کے طیارے ہوئے
آسماں ہل گیا تھرّائی زمیں،
نام پر لینن و استالن کے
مرد و زن، پیر و جوان، طفلکِ گلفام اُٹھے
ازبک و کوسک و تاتار اُٹھے
اور پھر روس کے ہر گوشے سے
بہہ چلا جنگ کا سیلابِ عظیم

روس کی عظمت و قوت کے نشاں ہیں دونوں
ماسکو اور ستالین گراد،
ثبت ہے خاک کے ہر ذرّے پر
سُرخ فوجوں کا جلال،
اپنی بکھری ہوئی طاقت کو سمیٹے ہوئے اُٹھا تھا جو دیو
نوجواں روس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خجل،
اپنی ہی موت سے خود دست و گریباں ہے آج،
زخم کھائی ہوئی جنگل کے درندے کی طرح
اپنی کمزوری پہ جھنجلایا ہوا
جسم کو اس کے کچل ڈالے گا
اس کے ہتھیاروں کا بوجھ
اب نہ اعضا میں سکت ہے نہ رگوں میں ہے لہو
دست و پا شل ہوئے جاتے ہیں مگر پھر بھی غرور
آگے بڑھنے پہ کئے دیتا ہے مجبور اسے،
کھینچ کر موت لئے جاتی ہے
سرو قفقاز کے میدانوں میں۔

فلسفۂ وحی

(۴)
ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور

تصورات کی جوڑ توڑ سے جو نتائج وضع کئے جائیں ان کے مقابلہ میں ویسے ہی اور منطقی تصورات پیش کئے جا سکتے ہیں جن سے انکی تردید یا ابطال ممکن ہو۔ یہاں تک کہ وہ شخص جو ان نتائج پر حصر کرتا ہو آسانی سے اپنے پہلے مدار فکر سے ہٹ سکتا ہے اور سراسر مختلف نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ برعکس اسکے انبیاء کے عقائد میں تزلزل یا تبدیلی ممکن نہیں۔ راہِ صداقت میں وہ ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیں گے۔ بلکہ جان تک دے ڈالیں گے۔ مگر وہ حق پر قائم رہنے اور اپنا مقدس مشن پورا کرنے میں ذرا تساہل نہیں کریں گے اور نہ مخالفت ہی سے دبیں گے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے وجود کو بلا واسطہ محسوس کرتے ہیں۔ انکی مثال کسی حد تک اس عاشق کی سی ہے جو اپنے معشوق کا جمال دیکھتے ہی محو حیرت ہو جاتا ہے اور اس کے دیدار سے بیحد لطف اٹھاتا ہے۔ واردات عشق کو جھٹلانے کیلئے جتنی چاہیں منطقی دلائل دیں، سب بے سود۔ عاشق اپنے معشوق کے دھن میں لگا ہی رہے گا۔ معشوق کو بدنما ثابت کرنے کیلئے آپ کتنی ہی بحث تجسس کریں عاشق نہ مانیگا۔ اس لئے کہ اس کا تجربہ ذاتی ہے اور اوروں کے تجربوں کا دارومدار محض تصورات پر ہے۔ اسکی منشاء کے خلاف آپ کچھ کہتے رہیں وہ یہی جواب دیگا: "خدارا! میرے معشوق کو میری آنکھوں سے دیکھو اور اس کے پیکر کا اندازہ میرے معیارِ حسن سے لگاؤ۔" اسے پورا پورا یقین ہے کہ اور لوگ اس کے معشوق کے جسم کے حسین اور نازک خطوط کے حُسن کو نہیں پا سکے۔ انہوں نے اس کے حقیقی جمال کی دھندلی سی جھلک بھی نہیں دیکھی۔ درحقیقت وہ حسن شناسی کے اہل ہی نہیں۔ اسی بنا پر وہ اس بات پر زور دیگا کہ لوگ اس کے معشوق کو اس کی آنکھوں سے دیکھیں اور اس کے معیار سے جانچیں۔ واضح رہے کہ اس کا تجربہ بھی علم کی حیثیت نہیں رکھتا۔ ورنہ دوسرے بھی اس سے واقف ہو سکتے ہیں اور اس میں اور بھی شریک ہو سکتے ہیں اور اس طرح سے اپنی ملکیت قرار دے سکتے ہیں۔ برعکس اس کے اس تجربہ کی رُو سے عاشق اور معشوق کے درمیان بلا واسطہ اتصال قائم ہو جاتا ہے اور عاشق کی شخصیت معشوق کے وجود میں مُدغم ہو جاتی ہے۔

نبی کا تجربہ بھی اسی تجربہ کی مانند ہے۔ اسلئے کہ جو نسبت نبی کو خدا سے ہے وہ بھی مستقیم اور بلا واسطہ ہوتی ہے۔ اس نسبت کو زیادہ سے زیادہ ربط و اتصال کہہ سکتے ہیں

نہ کہ علم۔ عاشق کی مانند نبی کو بھی اپنے تجربہ کی بناء پر حقیقتِ خدا کا پورا یقین ہے۔ اس کی خداشناسی اٹل واقعہ پر مبنی ہے یعنی یہ کہ خدا کی ذات سے اسے واقعی ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسے مدرکات کی تمثیلی قیاس کے ذریعہ سے سمجھا جا سکتا ہے۔ برعکس اس کے ان لوگوں کے نزدیک جو اس تجربہ سے محروم ہیں خدا کا نظریہ محض خیالی ہے۔ اور وہ بھی کھوکھلا، مبہم، غیر معین اور منفی۔

انبیا ہی کو ایسے رابطہ کی توفیق ہے۔ ہم جیسے معمولی انسان اس کے اہل نہیں۔ میرے دعوے کی تصدیق اس آیت قرآنی سے ہوتی ہے:

فَلَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖٓ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ

(سورۂ جن)

(خدا اپنے راز سوائے اس شخص کے جسکو وہ اپنا رسول چنتا ہے اور کسی پر ظاہر نہیں کرتا)

یہ رابطہ خدا کی ایک خاص رحمت ہے جو صرف انبیا کے حصہ میں آئی ہے۔ کم از کم اس لحاظ سے وہ فوق الحواس یعنی روحانی ہستیاں ہیں۔ ہم میں اور انبیاء میں جنس کا فرق ہے نہ درجے کا۔ مگر یہ بات کیونکر مانی جائے؟ خود پیغمبر بار بار کہتا ہے کہ وہ ہماری طرح ایک انسان ہے اور ہم بھی اسے انسان ہی سمجھتے ہیں تو اس امتیاز کی وجہ کیا ہے؟ اس سوال کا ہمارے پاس یہ جواب ہے کہ یہ قرار دینے میں کوئی تضاد لازم نہیں آتا کہ نبی اور ہر حیثیت سے تو اور انسان کی مانند ہے مگر اس معاملہ میں اسے ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ اسے فوق الحس کہہ لیجئے یعنی وہ حس جو عام انسانی تجربوں سے بالاتر حقائق کا تجربہ کر سکے باری تعالیٰ پیغمبر اسلام علیہ السلام سے فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ

(سورۂ کہف)

(اے محمدؐ! ان سے کہدو کہ میں تمہاری طرح ایک انسان ہوں (فرق صرف اتنا ہے کہ) مجھ پر وحی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے)

یہی امتیاز بعینہ عام انسانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ بعض لوگ رنگندھے ہوتے ہیں۔ بعضوں کو راگ کی پرکھ نہیں۔ بعضوں کو شعر و شاعری سے کوئی مس نہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی فن لطیف سے حظ ہی نہیں اٹھا سکتے۔ ان لوگوں کے بالمقابل وہ لوگ ہیں جو راگ، شعر اور فنونِ لطیفہ سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ یہ امتیاز نوعیت کا ہے نہ کہ محض درجہ کا۔ اسلئے کہ جو صفت ایک طبقہ میں موجود ہے وہ دوسرے طبقہ میں مفقود ہے۔ درجہ کے امتیاز سے مراد یہ ہے کہ کوئی چیز کسی جگہ تھوڑی ہے تو کہیں زیادہ ہے اور تفاوت ہے تو صرف مقدار میں ہے۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں کہ کسی ایک صفت میں نوعی فرق کی بناء پر کسی رنگندھے اور ایسے ہی دوسرے افراد کو زمرۂ انسانیت سے خارج کر دیں۔ یہ لوگ بھی اپنی معذوریوں کے باوجود اور انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ یہ مثالیں انبیاء کے معاملہ میں بھی صادق آتی ہیں۔ نبی کا یہ وصف اور انسانوں میں موجود نہیں ہے اور اس اعتبار سے اس میں اور دوسرے انسانوں میں ایک نوعی امتیاز ہے تا ہم اس کے اور ہمارے اصلی اجزاء میں کوئی فرق نہیں۔

اس ایک امتیاز کا انبیاء کو پورا اِحساس ہے جہاں اور انسان خدا سے قطعاً ناواقف ہیں انبیاء کو اپنے وقوف پر کامل بھروسہ ہے ۔ اور لوگوں کو حقیقتِ خداوندی کے بارے میں نہ خفیف سی خفیف علم ہے نہ خفیف سی خفیف بصیرت ۔ بلکہ اس علم اور درک کی صلاحیت اُن میں اصلاً ہے ہی نہیں ۔ برعکس اس کے مذکورہ بالا عاشق کی طرح انبیاء بھی اپنے قلب کی گہرائیوں میں حقیقت باری پر کامل یقین رکھتے ہیں ۔ اسلئے اتنا قوی یقین ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی روحانی واردات کا بایدوشاید اظہار نہیں کر سکتے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عاشق کی طرح یہی تاکید کرتے ہیں کہ ذات باری پر بلا حجت ایمان یا بہ الفاظ دیگر ایمان بالغیب رکھو ۔

(باقی آیندہ)

(بقایا از صفحہ ۲۸)

مبالغہ کر رہی ہے ۔ بہر حال مجھے چوکنا رہنا چاہیئے ۔ جیل میں بیں کر ہی کیا سکتا ہوں ؟

ڈاکٹر ؛ اوہو ! آپ تو زیادہ بہتر ہو گئے ہیں ۔ یہ چھاتا چھوٹا ہے (مارک کے ہاتھ پکڑ کر) کیا ہی اچھا ہو اگر ہم ذرا پی پلا لیں ! بیبر کی دوکان پاس ہی ہے آئیے چلیں ۔

مارک : بھئی خوب سوجھی ۔

دونو دوکان کے اندر چلے گئے ۔

م ۔ ی ۔ د

(بقایا از صفحہ ۲۰)

اچھی ہو جائے گی اور ہم دنیا کی دیگر اقوام کے حالات سے باخبر ہو جائیں گے تو افغانی اتحاد کیلئے راستہ خود بخود صاف ہو جائے گا ۔

آخر میں میں بہ حیثیت ایک افغان کے مولانا صاحب اور دیگر افغان بھائیوں کا ممنون ہوں جنہوں اس مضمون کی اشاعت میں مدد فرمائی ہے ۔ خداوند کریم سے دست بدعا ہوں کہ دردمند اور بہی خواہ افغانوں کی یہ آرزو جلد از جلد پوری ہو ۔

(غلام حسن صافی)

رباعی

ہاں مرگ و حیات کے سمجھتا ہوں میں راز
آغاز ز انجام ہے تو انجام آغاز
دیتا ہے زمانہ جب اجل کی دھمکی
دل سے آتی ہے قہقہوں کی آواز

(جوش)
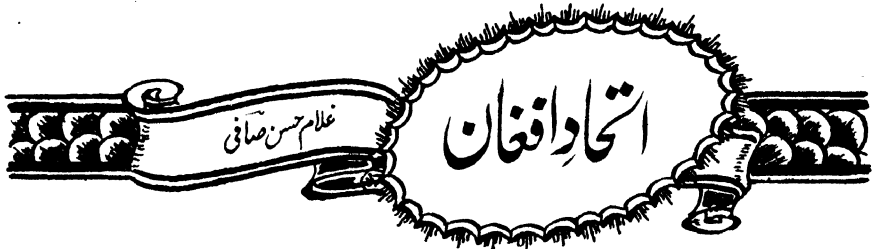
ہمیں مسرت ہے کہ ہمارے عزیز بھائی غلام حسن صافی نے باوجود عدیم الفرصتی کے ہمیں اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔ موصوف ایک مستند ادیب اور صاحب الرائے انسان ہیں۔ ہم آپکے خیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ 'انجمن افغان کابل' کے دیگر ادبا بھی آپکی طرح اس قومی خدمت میں ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ (ادارہ)

میں ایک افغان ہوں اور تجارت کے سلسلہ میں اکثر ہندوستان جایا کرتا ہوں۔ اس دوران میں جس کسی ہوٹل میں میرا قیام ہوتا ہے مالک ہوٹل اس خیال سے کہ میں افغان ہوں 'نن پرون' میرے سامنے لاکر رکھدیتا ہے۔ میں بھی اسے بڑے ذوق شوق سے پڑھتا ہوں کیونکہ تو یہ میری اپنی زبان میں شائع ہوتا ہے اور دوسرے اسمیں افغان قوم اور پشتو زبان کے متعلق دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔

اس دفعہ سفر میں 'نن پرون' میں اتحاد افغان کے عنوان سے ایک مضمون میری نظر سے گذرا۔ یہ بیحد دلچسپ تھا۔ اس کے ایک جملے نے کہ "افغان اور اتحاد ایک دوسرے کی ضد ہیں"، مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی افغان یہ تصور ہی نہیں کر سکتا کہ تمام افغان قوم کسی دن ایک سلسلہ میں منسلک ہو سکے گی۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہمارے بزرگوں نے بھی اتفاق اور اتحاد کا کوئی حل نہیں سوچا۔ گویا دوسرے الفاظ میں ہمیں ایسے رہنما نہیں ملے جو ان احساسات کے مالک ہوں۔ یہاں تک کہ ہمارے افغان بادشاہوں نے بھی ہم سے صرف فتوحات کا کام لیا اور ہم پر حکمرانی کی۔ انہیں ہمارے مستقبل کی کوئی پروا نہ تھی۔ ان کے جانشینوں کی تربیت بھی افغانی روایات کے مطابق نہ تھی۔ وہ افغانی روایات اور اخلاق و آداب سے بے خبر بلکہ پشتو زبان سے بھی ناآشنا رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ افغانوں کا کوئی مرکز قائم نہ ہوسکا اور منتشر حالت میں ایک دوسرے سے بیخبر اور کس مپرسی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج اس قوم میں ایسے مفکرین کی بہت کمی ہے جو قوم کو ایک مرکز پر لاسکیں۔ ہماری اس ناسمجھی سے فائدہ اٹھاکر ہمارے حریفوں نے ہم میں ایسے خیالات پیدا کر دئے کہ آج ہمارا شیرازہ بکھرا پڑا ہے دوسری قومیں اپنے فائدہ کیلئے ہمیں استعمال کرتی ہیں۔ بزرگوں کے قابل قدر کارنامے ہمارے دلوں سے مٹ رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ کاکڑ، قندہاری یا دوسرے قبیلے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں تو کانوں کو یہ بات کچھ مانوس نہیں معلوم ہوتی بلکہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب قبیلے ایک ہی خون اور نسل کے نہیں ہیں۔

میرے دل میں اسی قسم کے بہت سے خیالات آتے ہیں جنہیں میں ادا نہیں کرسکتا۔ صرف اتنا ضرور عرض کروں گا کہ افغان آخر انسان ہیں۔ مانا کہ وہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت کی کمی کی وجہ سے متحد نہیں ہوسکے لیکن اُن میں ایک ہونے کی استعداد تو ضرور موجود ہے۔ صرف ایسے بزرگوں اور رہنماؤں کی ضرورت ہے جو راہ دکھانے کے اہل ہوں اور ایسے نوجوان درکار ہیں جو افغانی علاقوں میں سفر کرکے اُنکے جغرافیائی، اخلاقی، اجتماعی اور اقتصادی حالات کا بغور مطالعہ کریں اور دیگر افغانوں تک اپنی معلومات پہنچائیں۔

آجکل دنیا میں تلاش و تجسس کا مادہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ لوگوں نے دنیا کو ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک چھان مارا ہے۔ لیکن ہم نے ابھی تک اپنے بھائیوں کو جو مختلف مقامات میں پڑے ہوئے ہیں، جاننے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی کہ وہ کس طرح اور کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمیں آیندہ نسل سے قوی اُمید ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اقدام کریگی۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی اندیشہ ہے کہ یہ نسل بھی جنگل کے خودرو پھولوں کی طرح چند روزہ جوبن دکھا کر وہیں خاک میں نہ مل جائے۔ میرے خیال میں افغان زبانی جمع خرچ ترک کرکے قربانی اور ایثار سے کام لیں۔

دنیا کی اقوام میں ہماری قوم کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کبھی اس نے بھی اپنے شاندار کارناموں سے دنیا کو حیرت میں ڈالدیا تھا۔ اسے بھی زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن آج ہم پستیوں میں پڑے ہوئے ہیں اور اس وقت تک پڑے رہیں گے جبتک کہ ہم تعلیم اور اتحاد کی برکتوں کو نہ سمجھیں گے اور انفرادی زندگی کی خرابیوں اور اجتماعی زندگی کے فوائد کو اچھی طرح ذہن نشین نہ کریں گے۔

پس ضروری ہے کہ ہم آیندہ نسل کی تعلیم و تربیت کی کوشش کریں۔ میرے خیال میں قوم کو شروع ہی میں یہ طے کرلینا چاہیئے کہ قومی تعلیم کس قسم کی ہو۔ کیونکہ تعلیم کا مسئلہ حکومت کی تشکیل سے زیادہ اہم ہے۔ ایسی تعلیم بیکار ہے جس سے افغانی اخلاق کو صدمہ پہنچے۔ یعنی تعلیم کی غرض محض یہ رہ جائے کہ مرد اپنا لباس چھوڑ کر کوٹ پتلون نکٹائی پہننا شروع کردیں اور عورتیں ساری اور گون کی فکر میں پڑی رہیں۔ اسطرح تو افغانی سادگی اور حیا جاتی رہیگی۔ ایسی تعلیم افغانوں کی تباہی کا باعث ہے اصل بات یہ ہے کہ جبتک کسی قوم کے ملی اخلاق، آداب اور روایات قائم ہیں اُسے کوئی نہیں مٹا سکتا۔ ہاں اگر یہ مٹ گئے تو قوم بھی تباہ ہوگئی۔ ایسی قوم سے جو آبائی اخلاق و آداب چھوڑ کر صرف فیشن پر مرمٹے وہ قوم ہزار درجہ بہتر ہے جو پہاڑوں میں رہنے کے باوجود افغانی احساسات و جذبات اپنے سینہ میں رکھتی ہو۔ کیونکہ ایک کوہستانی افغان سے کم انکم یہ امید تو کیجا سکتی ہے کہ وہ خاندانی شرافت کی لاج ضرور رکھے گا۔

الغرض میرا مطلب یہ ہے کہ افغانوں کو چاہیئے کہ افغانی روح کو تازہ رکھیں۔ اپنی قوم کی بقا کی فکر کریں اور اپنی اصلاح کے لئے کسی اور پر بھروسہ نہ کریں۔ جب ہماری تعلیمی حالت

(باقی بر صفحہ ۱۸)

سوویٹ یونین کا پورا نام "یونین آف سوشلسٹ سوویٹ ری پبلکس" (اجتماعی شوروی جماہیر کا اتحاد) ہے۔ اس کا رقبہ تقریباً ۸۱،۶۰،۰۰۰ مربع میل اور اسکی آبادی ۱۸،۴۳،۷۳،۰۰۰ ہے۔

۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو سوویٹ یونین کا نیا آئین مکمل اور نافذ ہوا۔ اس آئین کی رُو سے سوویٹ یونین گیارہ جمہوریتوں یعنی روس، یوکرین، بیلوروس، ازبکستان، ترکمانیہ، تاجکستان، قزاقستان، قرقزیہ، آذربائیجان، گرجستان اور ارمنستان پر مشتمل ہے۔ ۱۹۴۰ء میں لیتھوآنیا، لیٹویا اور ایستھونیا کی جمہوریتیں بھی مسلک اشتراکیت قبول کرکے سوویٹ یونین میں شامل ہو گئیں لیکن اب جرمنوں کے قبضہ میں آ گئی ہیں۔ ان گیارہ جمہوریتوں پوری پوری خود مختاری حاصل ہے اور تمام اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی امور میں مساوی حقوق کی حامل ہیں۔

مسلم جمہوریتیں:۔

مسلمان سوویٹ یونین کے ہر خطّہ میں آباد ہیں مگر ازبکستان، ترکمانیہ، تاجکستان، قزاقستان، قرقزیہ اور آذربائیجان میں ان کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ اسی لحاظ سے ان جمہوریتوں کو اسلامی جمہوریتوں کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ آذربائیجان قفقاز میں ہے۔ ازبکستان، ترکمانیہ، تاجکستان، قزاقستان اور قرقزیہ مرکزی ایشیا میں پاس پاس واقع ہیں۔ قرقزیہ کوہستان پامیر سے ملحق اور ہندوستان سے نزدیک تر ہے۔

ان بڑی جمہوریتوں کے علاوہ سوویٹ یونین کے اندر اور بہت سی چھوٹی چھوٹی خود مختار جمہوریتیں بھی ہیں جنمیں سے تاتاریہ، داغستان، باشقریہ، یوکرین وغیرہ میں مسلمان بکثرت آباد ہیں۔

سوویٹ یونین کے قیام کے بعد ان جمہوریتوں میں بہت سی ترقیاں ہوئیں جنمیں اقتصادی ترقی خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ مرکزی ایشیا کی زمین روئی کی کاشت کیلئے نہایت موزون ثابت ہوئی ہے۔ عہدِ زار میں پچاس فیصدی روئی ممالک خارجہ سے لائی جاتی تھی۔ اب مرکزی ایشیا کی جمہوریتوں میں روئی اس کثرت سے پیدا ہوتی ہے کہ سوویٹ یونین ممالک خارجہ سے قطعًا بے نیاز ہے۔ روئی مرکزی ایشیا

کا "سفید سونا"، کہی جانے لگی ہے۔

قزاقستان :-

اس جمہوریت کا رقبہ ۱۰،۶۰،۰۰۰ مربع میل اور آبادی ۶۷،۹۶،۶۰۰ ہے۔ یہ جمہوریت رقبہ میں جرمنی سے چھہ گنی ہے سوویٹ یونین میں بلحاظ رقبہ دوسرے درجہ پر اور بلحاظ آبادی تیسرے درجہ پر ہے۔ اس کا دارالخلافہ آلما آتا کہلاتا ہے جسکی آبادی ۲،۳۰،۵۹۸ ہے۔ انقلاب روس سے پہلے قزاقستان ایک بے آب و علف اور دشوار گذار دشت تھا۔ سڑکوں کا نام و نشان نہ تھا۔ اب بہت سی سڑکیں، ریلیں اور نہریں موجود ہیں۔ صرف ریلوے لائینوں کی لمبائی ۱۶۰۰ میل ہے۔ ترکمن۔ سائبیری ریلوے آلما آتا سے ہو کے جاتی ہے۔ آلما آتا فضائی اسٹیشن بھی ہے۔ قزاقستان میں دھاتیں بکثرت پیدا ہونے لگی ہیں۔ سوویٹ یونین کا ساٹھ فیصدی تانبا اور سیسہ اور پچاس فیصدی جست قزاقستان میں پیدا ہوتا ہے۔ ایمبا کے مقام پر تیل کے چشمے پائے گئے ہیں جو اب وسعت اور نکاس کے اعتبار سے باکو کے چشموں سے دوسرے درجہ پر ہیں۔ کاراگنڈا کی کوئلہ کی نئی کانیں نہ صرف قزاقستان کی اپنی ضروریات کیلئے بلکہ یورال کے کارخانوں کیلئے بھی نہایت کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ قزاقستان میں ایک ربڑ کا پودہ بکثرت پیدا ہوتا ہے جسے کوک سگنز کہتے ہیں۔ اب ربڑ کی پیداوار اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ سوویٹ یونین میں اس کی درآمد کم ہوتی جاتی ہے۔ روئی کی کاشت بمقابلہ ازبکستان اور ترکمانیہ کم ہے۔ روئی کے علاوہ ابریشم بہت پیدا ہوتا ہے قزاق گھوڑے یونین بھر میں مشہور ہیں۔

ازبکستان :-

اس جمہوریت کی آبادی ۵۴،۱۷،۸۰۰ ہے۔ اس کا رقبہ برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ کے برابر ہے۔ اس کا دارالخلافہ تاشقند ہے۔ جسکی آبادی ۵،۸۵،۰۰۰ ہے۔ یہ جمہوریت بلحاظ صنعت و حرفت اور مسلم جمہوریتوں سے بہت بڑھی ہوئی ہے۔ تانبے کی پیداوار کے لحاظ سے یہ جمہوریت سوویٹ یونین میں تیسرے درجہ پر ہے۔ سب سے بڑی تانبے کی کان تاشقند سے پچاس میل کے فاصلے پر المالک میں واقع ہے تاشقند کے نزدیک نئی کوئلہ کی کانیں پائی گئی ہیں۔ یہ کانیں نہ صرف ازبکستان کیلئے جہاں کوئلہ کی خاص طور پر قلت رہی ہے، اہمیت رکھتی ہیں بلکہ سارے سوویٹ یونین میں وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ چاول جو سوویٹ یونین میں استعمال ہوتا ہے زیادہ تر ازبکستان میں پیدا ہوتا ہے۔ سمرقند، بخارا، قوقند اور وادی فرغانہ اسی جمہوریت میں واقع ہیں۔ قوقند اور خجند (حال لینن آباد) میں ابریشم کے کارخانے ہیں جہاں سرخ فوج کیلئے پیراشوٹ بنائے جاتے ہیں۔ تاشقند میں کپڑا بننے کا ایک عظیم الشان کارخانہ ہے جسمیں ۲،۲۴۶ بننے کی مشینیں اور ۱۱۲،۰۰۰ تکلے ہیں۔ اس کارخانہ کی توسیع ہو رہی ہے اور تکمیل پر مشینوں کی تعداد ۶،۹۵۲ اور تکلوں کی ۲،۱۱،۰۰۰ ہو جائے گی۔ تاشقند میں کئی بجلی گھر اور زراعتی مشینیں اور اوزار بنانے کے کئی کارخانے

ہیں۔ مرکزی ایشیا کا تعلیمی مرکز بھی تاشقند ہی ہے۔ اسلئے کہ سنٹرل ایشیاٹک یونیورسٹی (دارالعلوم ایشیائے مرکزی) یہیں واقع ہے۔

ترکمانیہ:-

اس جمہوریت کا رقبہ ۴۴۳،۶۰۰ مربع کیلومیٹر اور آبادی ۱۲،۶۷،۹۰۰ ہے۔ عشق آباد دارالخلافہ ہے جسکی آبادی ۱،۲۵،۲۸۰ ہے۔ اس جمہوریت کا دوتہائی حصہ ریگستان قاراقرم پر مشتمل ہے۔ اسمیں سے دو دریا یعنی جیحون اور آترک گذرتے ہیں۔ اس جمہوریت میں صرف ایک ریلوے گذرتی ہے اور وہ "ٹرانس کیسپین ریلوے" ہے۔ گذشتہ دس برس میں صحرائے قاراقرم میں موٹر کیلئے کئی سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ سوویٹ یونین میں ترکمانیہ روئی کی کاشت کا اہم ترین مرکز ہے۔ حال ہی میں گندھک اور پوٹاس کی کئی بڑی کانیں نکلی ہیں۔ یہاں کے سرخ "فیل پا" قالین نہایت مشہور ہیں۔

قرقزیہ:-

اس جمہوریت کا رقبہ ۱،۹۶،۷۰۰ مربع کیلو میٹر ہے اور آبادی ۱۳،۰۲،۱۰۰۔ فرنزے جسے پہلے پشپک کہتے تھے اس کا دارالخلافہ ہے۔ سوویٹ یونین کی پارہ اور شنگرف کی سب سے بڑی کانیں قرقزیہ ہی میں واقع ہیں۔ ریشم کی پیداوار خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اوش کے مقام پر ایک بڑا ریشم کا کارخانہ ہے جہاں سرخ فوج کیلئے پیراشوٹ بنائے جاتے ہیں۔ حال ہی میں چقندر کی کاشت بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ چونکہ یوکرین کی صنعت شکرسازی زوال پذیر ہے اسلئے یہ صنعت قرقزیہ میں بہت ترقی کر رہی ہے۔ تیز رو دریاؤں سے جو تاجکستان سے قرقزیہ آتے ہیں برقی قوت حاصل کی جارہی ہے۔

تاجکستان:-

اس جمہوریت کا رقبہ ۱،۴۳،۹۰۰ مربع کیلومیٹر ہے اور آبادی ۱۳،۳۲،۷۰۰۔ سٹیلن آباد اسکا دارالخلافہ ہے۔ اس جمہوریت کی اہم ترین پیداوار روئی ہے۔ یہاں بسمتھ، سونا اور پلاٹینم کی نئی کانیں پائی گئی ہیں۔ ریشم بھی کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔

آذربائیجان:-

اس جمہوریت کا رقبہ ۸۶،۰۰۰ مربع کیلومیٹر اور آبادی ۲۸،۹۱،۰۰۰ ہے۔ اس کا دارالخلافہ باکو (بادکوبہ) ہے جہاں کے لاتعداد تیل کے چشموں پر سٹہلر (سٹالن) کا زور دار آز تیز کر رہا ہے۔

مذہبی آزادی

جب انقلاب روس اپنی ابتدائی بحرانی منزلیں طے کر رہا تھا تو بولشویکوں کی طرف سے مذہب کی شدید مخالفت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ بولشویکی مسلک کا ایک خاص مادہ یہ قرار دیا گیا تھا کہ مذہب لوگوں کیلئے بمنزلہ افیون کے ہے۔ مگر رفتہ رفتہ انقلاب کے ارباب حل وعقد نے اپنا رویہ بدلنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ آئین سوویٹ یونین کی دفعہ ۱۲۴ کی رو سے تمام باشندوں کو اپنے مذہبی فرائض

ادا کرنے کی آزادی دی گئی۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ سویٹ یونین یا سویٹ جمہوریتوں کی حکومتیں کسی مذہب کی نہ حامی ہیں نہ مخالف۔ ہر فرد آزاد ہے اب کوئی مذہب اختیار کرے یا نہ کرے۔ کوئی پابندی نہیں البتہ اگر کوئی کسی مذہب کا معتقد ہو تو اس کی پیروی اس طرح سے کرے کہ آئین سویٹ یونین کے بنیادی اصول یعنی اشتراکیت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ مسلمان مسجدوں میں نماز پڑھ سکتے ہیں اور مسجدوں کا مناسب انتظام کر سکتے ہیں۔ مذہبی درس و تدریس گھروں میں ہو سکتی ہے چنانچہ اس وقت سویٹ یونین میں ۱۳۱۲ مساجد۔ ۸۰۵۲ ملاّ، ۲۸۲ شیخ، ۵۲۸ "ایشان" وغیرہ موجود ہیں۔ جمہوریت باشقریہ کا دارالخلافہ اوفا سویٹ یونین کے مسلمانوں کا دینی مرکز ہے جہاں مفتی عبدالرحمٰن رسولیوف سکونت پذیر ہیں اور آپ سویٹ یونین کے اسلامی مراکز کی مرکزی کونسل کے صدر ہیں۔

تعلیمی حالت

جب سے سویٹ حکومت قائم ہوئی ہے تعلیم عامہ کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ اور مسلم جمہوریتوں میں بھی عام ناخواندگی کم ہوتی جا رہی ہے۔ ۱۹۲۶ء میں جمہوریت ترکمانیہ میں تقریبًا ۱۶ فیصدی مرد اور آٹھ فیصدی عورتیں خواندہ تھیں۔ دس سال کے اندر یعنی ۱۹۳۶ء میں وہاں ۷۳ فیصدی مرد اور ۶۰ فیصدی عورتیں خواندہ ہو گئے۔ مرکزی ایشیا کی ان پانچ مسلم جمہوریتوں میں ۷۴۰۷ لائبریریاں ۸۴۴۲ انجمنیں اور ۵۳ عجائب گھر ہیں۔

۱۹۳۹ء میں جمہوریت آذربائیجان میں ۲۰۵۰۰، جمہوریت ترکمانیہ میں ۴۰۰۰ - اور جمہوریت قزاقستان میں ۲۸،۰۰۰ اشخاص اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ مسلم جمہوریتوں میں اعلیٰ تعلیم کیلئے کالج قائم ہو چکے ہیں۔ آلما آتا (دارالخلافہ قزاقستان) میں سات کالج ہیں۔ باکو میں آٹھ کالج ہیں اور ان کے علاوہ ایک گورنمنٹ موسیقی اکیڈمی ہے۔ تاشقند میں علاوہ سنٹرل ایشیاٹک یونیورسٹی کے تیرہ کالج اور انسٹی ٹیوٹ ہیں۔ سویٹ یونین کی سائنس اکیڈمی کی شاخیں تمام مسلم جمہوریتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ جنہیں مسلم سائنسدان چلا رہے ہیں

سویٹ یونین کی تمام زبانوں کا درجہ برابر ہے۔ قومی جمہوریتوں میں دو زبانیں اختیار کی گئی ہیں ایک روسی دوسری اس جمہوریت کی اکثریت کی زبان۔ جنوری ۱۹۴۱ء میں ان طلباء کی تعداد ۹۰۰، ۹۲۱، ۱۶ تھی جو مختلف مدارس میں ترکی، تاتاری، ازبکی اور ترکمنی زبانوں میں تعلیم پاتے تھے۔ اس تعداد میں وہ مسلمان طلباء شامل نہیں جو دوسری زبانوں میں تعلیم پاتے تھے۔

م۔ ی۔ د

داستانِ نجات

دیکھئے انجام کیا ہو ہستئ موہوم کا
پڑ گیا ہے اختلاف اس خواب کی تعبیر میں

(دیگانہ)

ایک دن شام کے وقت نرس پرہیزی کھانا لائی تو ایمی نے پوچھا: آج کیا دن ہے؟

نرس: جمعہ

ایمی: اور پھانسی کیلئے کونسا دن مقرر ہوا ہے؟

نرس: بُدھ۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ بدھ تک آپ چلنے پھرنے لگ جائیں گی۔

ایمی رات بھر بیکل رہی اور یہی سوچا کی کہ ابھی چار دن ہیں۔

سینچر کی صبح کو خیال آیا کہ اب مجھے اٹھنا چاہیئے۔ آہستہ آہستہ ٹانگیں لٹکائیں، پاؤں فرش پر رکھے اور کھڑی ہو گئی فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ فوراً بیٹھ گئی۔ انّا ہا فمین نے پوچھا: کیسی ہو بہن؟ ایمی میں بات کرنے کی طاقت کہاں سر پکڑے بیٹھی رہی۔ نقاہت گھٹی تو پھر اٹھنا چاہا۔ مگر اس مرتبہ اٹھتے ہی لڑکھڑاتی ہوئی انّا کی چارپائی پر جا بیٹھی۔

انّا: اگر نرس تمہیں یہاں دیکھ لے تو سخت اودھم مچائیگی اسے ناراض کرنا اچھا نہیں۔

ایمی اٹھی اور گرتی پڑتی اپنی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اتنی طاقت نہ رہی کہ رضائی اوڑھ لے۔

اتنے میں ڈاکٹر اور نرس آگئے۔ نرس دیکھتے ہی بھانپ گئی کہ دال میں کالا ہے۔ رضائی ایمی پر ڈالکر کہنے لگی: چاہتی ہو نمونیہ ہوجائے؟

ایمی (ہنسکر): نہیں۔ میں تو چاہتی تھی ذرا چل پھر لوں۔

نرس: کس کی اجازت سے؟

ایمی: میں تو محض مشق کر رہی تھی۔

نرس نے ایمی کے منہ پر زور سے تھپٹر مارا۔ ڈاکٹر سے نہ رہا گیا۔ بگڑ کر نرس سے کہا: تم یہاں سے چلی جاؤ۔ میں خود مریضہ کو دیکھ لوں گا۔

نرس چلی گئی تو ڈاکٹر نے آہستہ سے ایمی سے کہا: آپ کو ایسی حرکت کرنا نہیں چاہئے تھی۔ اسمیں آپکو کچھ فائدہ نہیں بلکہ میری عدم موجودگی میں آپکو مفت میں اذیت ہوگی۔ آپ حوصلہ سے کام لیں تو میں آپ کی مشکل آسان کر سکتا ہوں۔

ایمی کی آنکھیں کھل گئیں۔ ڈاکٹر کی ہمدردی سے بہت متاثر ہوئی۔ قیدیوں سے تو بات تک کرنا منع تھا۔ ڈاکٹر نے اس کا کھلم کھلا ساتھ دیا۔ افسران بالادست کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے شاید نرس ہی اطلاع دیدے کہ ڈاکٹر قیدیوں کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے۔

ایمی: آپ جاتے کیوں نہیں؟ کہیں آپ اپنے سر کوئی آفت نہ لے لیں۔

ڈاکٹر: میں آپ کو مدت دراز سے جانتا ہوں اور آپ کو یہاں دیکھکر مجھے سخت قلق ہوا تھا۔ جب آپ بیمار ہوئیں تو میں نے اپنے چچا کو جو ایک بلند پایہ افسر ہیں اس بات پر رضامند کیا کہ آپ کا اپریشن مجھے کرنے دے۔ بچپن سے آپ کو جانتا ہوں اور آپ کی تصویر میرے پاس رہی ہے۔ آپ جانتی ہیں بعض لڑکے تخیل پرست ہوتے ہیں۔

ایمی: جانتی ہوں۔ میرا اپنا بیٹا ہی ہے۔

ڈاکٹر: شاید آپ اپنے بیٹے کے نام کوئی پیغام بھیجنا چاہیں۔ میں اس خدمت کیلئے حاضر ہوں۔

ایمی یہ سنتے ہی ہکا بکا رہ گئی مگر ذرا سنبھل کر پوچھا: یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟

ڈاکٹر: میں کہہ رہا ہوں کہ شاید آپ اپنے بیٹے کو نام کوئی رقعہ بھیجنا چاہتی ہوں۔

ایمی: لیکن اس کی تو یہاں سخت ممانعت ہے

ڈاکٹر: ہو۔ مگر آپ چاہیں تو میں آپ کا رقعہ پہنچا دوں گا لیکن جمعہ کے بعد۔

ایمی: مناسب

ڈاکٹر نے پنسل اور خط لکھنے کا پیڈ وغیرہ دئے۔ اور اسے ذرا سہارا دیکر بٹھادیا اور خود کھڑکی کے پاس چلا گیا۔ ایمی نے رقعہ لکھ کر تہ کیا اس پر مارک کا نام لکھدیا اور ڈاکٹر کے حوالے کیا۔ ڈاکٹر چلا۔ دروازہ سے مڑکر دیکھا کہ ایمی اپنا منہ ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی ہے اور اس کی انگلیوں میں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ایمی سے کچھ کہنا چاہتا تھا مگر بن کہے چلا گیا۔

دوا میں اور دعا میں اثر تو اب معلوم
بس اک امیدِ اثر ضبطِ ناگوار میں ہے
(یگانہ)

مارک ہوٹل واپس آیا۔ رات گذاری۔ سنیچر کی صبح کو ہوٹل کی ملازمہ قہوہ لائی تو مارک نے اس سے پوچھا کہ کوئی سستا ہوٹل بھی ہے؟ ملازمہ نے ایک چھوٹے سے ہوٹل کا پتہ دیا ناشتہ کے بعد مارک جانے لگا تو اسے خیال آیا کہ شاید ہیننگ کو اسکی ضرورت ہو۔ فوراً اپنا پتہ لکھکر ہوٹل کے دربان کو دیدیا۔

نئے ہوٹل میں ایک کمرہ پسند کیا۔ خلاف معمول تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ بستر پر لیٹ گیا اور نیم خوابی کی حالت میں دن بھر پڑا رہا۔

اتوار کی صبح کو یاد آیا کہ سنیچر کی شام کو روبی کے یہاں چائے پینے کا وعدہ کیا تھا لیکن نہ جا سکا۔ خیر نہ گیا تو کیا ہوا روبی نے بھی تو رسمی طور پر دعوت دی تھی اور ہو سکتا ہے کہ وہ اس سے ملنا بھی نہ چاہتی ہو۔ باہر آیا ٹہلتے ٹہلتے ایک گرجا کے پاس جا نکلا۔ بھیڑ بھاڑ میں روبی اور اس کے بورڈنگ ہاؤس کی لڑکیوں پر آنکھ جا پڑی۔ بہت چاہا انہیں نہ دکھ پائے مگر روبی کی آنکھ سے آنکھ مل ہی گئی۔ مارک کو دیکھتے ہی روبی گھبرا گئی۔ لڑکیاں بھی بھانپ گئیں۔ پھر روبی مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ مارک نے سلام کیا۔

روبی: کل آپ کا انتظار کیا کی! مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ آپ مل تو گئے۔ مجھے ڈر تھا کہیں دشمنوں کی طبیعت علیل نہ ہو گئی ہو۔

روبی کے لب و لہجہ سے اس قدر مہر و شفقت ٹپکتی تھی کہ مارک سخت شرمندہ ہوا اور روبی سے معافی مانگ کر کہا: میں چاہتا ہوں آپ میرے ساتھ چائے پئیں تب مجھے یقین آئیگا کہ آپ نے مجھے واقعی معاف کر دیا ہے۔

روبی (جھجک کر): اچھا تو آج شام کو پانچ بجے کارلٹن ریسٹوراں میں۔

اتنے میں لڑکیاں پاس آن پہنچی۔ روبی نے مارک کا سب سے تعارف کرایا۔ لڑکیاں ایک امریکی نوجوان سے ملکر بہت خوش ہوئیں کچھ دیر سب آپس میں باتیں کرتے ٹہلتے رہے۔ یکایک روبی بولی: مجھے کچھ لوگوں سے ملنا ہے میں جاتی ہوں۔

مارک: اچھا مگر آج شام پانچ بجے یاد رہے۔

روبی (مسکرا کر) ضرور۔

مارک ٹھیک پانچ بجے کارلٹن پہنچگیا۔ اور اس نے بہترین میز چن لی۔ روبی دیر سے آئی۔ دونو بیٹھ گئے۔ چائے آئی اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔ روبی اپنے حالات بتاتی رہی۔ باتوں باتوں میں اسنے کہا کہ اس کے پاس بس ایک مکان رہ گیا ہے جو برلین کے نزدیک ایک پہاڑی آبادی میں واقع ہے۔ مارک پوری توجہ سے ساری باتیں سنتا رہا۔ یہ تو پایا جاتا تھا کہ برلین میں اسکا کوئی چاہنے والا ہے مگر یہ ظاہر نہ ہو پایا کہ وہ ہے کون۔ اسی سوچ میں تھا کہ روبی نے اس سے کہا: آپ کہاں ہیں۔

مارک: میں سب کچھ سُن رہا ہوں۔

ریسٹوراں سے چلنے لگے تو دروازہ کے پاس ایک نوجوان

جو ایک بھونڈا سا کوٹ پہنے تھا روبی کو دیکھتے ہی اٹھا اور تعظیماً جھکا۔ مارک کے دل میں آیا کہیں یہی روبی کا چاہنے والا نہ ہو۔ لیکن روبی نے چنداں اعتناء نہیں کی۔

روبی: اوہو! مینہ برس رہا ہے۔ بہت بُرا ہوا۔

مارک: ابھی ٹیکسی لاتا ہوں اور آپکو گھر پہنچا آؤنگا۔

روبی: نہیں نہیں۔ میں اکیلی گھر جانا چاہتی ہوں۔

مارک: یہ کیوں؟

روبی نے کوئی جواب نہ دیا۔

مارک: تو پھر آپ آئی ہی کیوں تھیں؟

روبی نے شفقت بھری نگاہ سے دیکھا اور کہا: میں چاہتی تھی آپکے کام آسکوں۔ کیونکہ آپکے یہاں آنے کی علت مجھے معلوم ہے۔ خرابی یہ ہے کہ اوروں کو بھی اس کا علم ہے اور اسمیں آپ کیلئے خطرہ ہے۔ میں جانتی ہوں یہ معاملہ کتنا المناک بلکہ وحشتناک ہے۔ لیکن آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔ آپکو چاہیئے وطن لوٹ جائیں ورنہ کہیں آپ خود کسی ہولناک آفت میں نہ گھِر جائیں۔ وعدہ کیجئے کہ آپ واپس چلے جائیں گے۔

مارک یہ سب باتیں چپکا سنتا رہا۔ کچھ کہنا چاہتا ہی تھا کہ روبی کے دو اور جاننے والے آگئے۔ روبی نے مارک کا انسے بھی تعارف کرایا۔

روبی: مجھے آپ اپنے ساتھ لیجا سکتے ہیں؟ ورنہ مجھے چھوڑنے کیلئے مارک کو بہت دور جانا پڑے گا۔ وہ دونو بول اٹھے "ضرور! ضرور!"

مارک رخصت ہونے کو تھا کہ ایک اور رکاوٹ پیدا ہوگئی وہی نوجوان جو راستے میں اٹھ کھڑا ہوا تھا آدھمکا۔

روبی: اخّاہ ڈاکٹر ڈٹن۔ آپسے ملکر بہت خوشی ہوئی۔ ایک مدّت سے آپکو نہیں دیکھا۔ خیریت تو رہی؟ کسی دن میرے ہاں آکر چائے پیجئے۔

پہلے دو ملاقاتیوں میں سے ایک نے روبی سے کہا: ہماری موٹر آپکی منتظر ہے۔ گو میں چاہتا تو نہیں کہ ان شیدائیوں کو آپکی صحبت سے محروم کر ڈالوں۔

مارک رخصت ہوا۔ باہر مینہ کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔ اپنا کالر الٹکر چلنے ہی کو تھا کہ کسی نے اس کا بازو پکڑکر کہا: معاف کیجئے گا۔ میرا چھاتا حاضر ہے۔ دیکھا تو وہی ڈاکٹر تھا

مارک: شکریہ! آپ کدھر جارہے ہیں؟

ڈاکٹر: جدھر آپ۔

مارک: عین نوازش ہے آپ کی۔

دونو اکٹھے روانہ ہوئے۔ راستے میں ڈاکٹر نے کہا: یہ بہاری مینہ بہت برا ہوتا ہے۔ کپڑے بھیگ جاتے ہیں تو خشک ہونے میں نہیں آتے۔ اسمیں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ آدمی کو سخت زکام ہوجاتا ہے جو بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے۔

مارک نے جواب دیا: بیشک آپ صحیح فرمارہے ہیں۔

راستہ میں یکایک خیال آیا کہ روبی کو میری بابت یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوگیا۔ کس نے یہ باتیں بتائی ہونگی؟ ہبننگ نے؟ کمشنر نے؟ کیا یہ لوگ اس بارہ میں آپسمیں بات چیت کرتے رہتے ہیں؟ روبی نے مجھ سے کہا کہ میرا یہاں ٹھیرنا خطرہ سے خالی نہیں۔ اس کا مطلب کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ

(باقی بر صفحہ ۱۸)

قیمت فی پرچہ دو آنے

آجکل

پندرہ روزہ

چندہ سالانہ تین روپے

پشتو رسالہ "من پرون" کا اردو ایڈیشن

سال (۲) | ۲۰ر فروری سنہ ۱۹۴۳ء | فہرست | ۱۴ر صفر المظفر سنہ ۱۳۶۲ھ | نمبر (۱۹)

نمبر شمار	مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
(۱)	"کسی نے کی ہیں ایسی دہر میں قربانیاں اب تک"	لالہ بالکشن داس صاحب باغ. اکبرآبادی	(۲)
(۲)	ترکی اور موجودہ جنگ	ادارہ	(۳)
(۳)	رفتار زمانہ	ادارہ	(۵)
(۴)	فلسفۂ وحی	ڈاکٹر احسان اللہ خاں پروفیسر فلسفہ اسلامیہ کالج پشاور	(۷)
(۵)	"دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار" (نظم)	میرزا یگانہ چنگیزی لکھنوی	(۱۰)
(۶)	پشتو رسم الخط	خان مشتاق علی خاں	(۱۱)
(۷)	سویٹ یونین کے مسلمان (۲)	ادارہ	(۱۶)
(۸)	ائین سٹائن کا نظریۂ اضافیت	محمد اسحاق خانصاحب ای. اے. سی	(۲۰)
(۹)	دوراہا .... (نظم)	گوپال متل	(۲۳)
(۱۰)	داستانِ نجات	ادارہ	(۲۴)

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے.

ایڈیٹر "آج کل" نمبر ۱۵ راجپور روڈ دہلی

بنے ہیں راہِ حق میں مٹنے والوں کے نشاں ابتک
کوئی دیکھے تو خاکِ کربلا ہے خونچکاں اب تک

جگر سے اُٹھ رہا ہے یاد میں شہ کی دھواں ابتک
لہو برسا رہی ہے میری چشم خونفشاں ابتک

شہیدانِ وفا کے پائے جاتے ہیں نشاں ابتک
لئے پھرتی ہیں اُن کی خاک سر پر آندھیاں ابتک

بہتر آدمی اور وہ نرالی شان کا لشکر
مری آنکھوں میں پھرتا ہے حسینی کارواں ابتک

زمانہ ہوگیا، اس حادثہ کو مدتیں گذریں ....
حسینؑ ابن علیؑ کی داستاں ہے داستاں ابتک

لئے تھے خواب میں ہونٹوں نے بوسے پائے سرور کے
زباں ہونٹوں کے بوسے لے رہی ہے مہرباں ابتک

سُنی ہے سننے والوں نے شہیدوں کے مزاروں پر
ہوا میں گونجتی پھرتی ہے آوازِ اذاں ابتک

مٹا ہے کوئی بھی شبیرؑ کی مانند مذہب پر
کسی نے کی ہیں ایسی دہر میں قربانیاں ابتک

کبھی ہندوستاں کو یاد فرمایا تھا سرور نے
ادب سے یاد کرتا ہے انھیں ہندوستاں ابتک

گئے تھے کربلا سے جو پہن کر حضرتِ عابدؑ
سبق آزادیوں کا دیتی ہیں وہ بیڑیاں ابتک

ہوئی مدت کہ شمع قبر کے آنسو نہیں تھمتے
غمِ شبیرؑ میں اُس وقت سے ہے نوحہ خواں ابتک

ہوئیں وقتِ شہادت جو خدا اور شاہ میں باتیں
کوئی سمجھا نہیں اے **باغ** وہ رازِ نہاں ابتک

ترکی اور موجودہ جنگ

آجکل ترکی کے چند نامور صحافیوں اور ادیبوں کا ایک وفد ہندوستان کی سیاحت کر رہا ہے اور ہمیں بیحد مسرت ہے، کہ ہمارے یہ محترم مہمان جہاں جہاں بھی تشریف لے گئے ہیں ان کا نہایت تپاک سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔ ابھی ابھی وہ صوبہ سرحد سے لوٹے ہیں اور یہ کہنا غیر ضروری ہوگا کہ اہالیٔ سرحد نے جو مہماں نوازی میں شہرۂ آفاق ہیں ان معزز مہمانوں کی تواضع اور عزت افزائی میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی ہوگی۔

اس موقع پر ان حضرات کی تشریف آوری کا یہ مقصد ہے کہ وہ ہندوستان کے حالات کا خود مشاہدہ کریں اور اندازہ لگائیں کہ ہندوستان اتحادیوں کی کتنی امداد کر رہا ہے اور اہالیٔ ہند اپنے وطن کے بچاؤ کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ ہندوستان کے بارے میں جو بے تکی افواہیں دشمن اُڑا رہا ہے ان میں کہاں تک صداقت ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر یہ وفد ہندوستان کی تمام سیاسی پارٹیوں کے ساتھ تبادلۂ خیالات کرے گا اور صحافیوں کے علاوہ عامۃ الناس کے خیالات بھی معلوم کرے گا۔ ایک بڑی غرض یہ بھی ہے کہ ترکی اور ہندوستان کے باہمی دوستانہ تعلقات اور بھی استوار ہو جائیں۔

ممبران وفد ترکی کے ممتاز اصحاب الرائے ہیں اور ان میں اکثریت ایسوں کی ہے جو ترکی کی مجلس شوریٰ اور وزارت خارجہ کے رُکن رہ چکے ہیں۔ یہ حضرات سب کے سب بین الاقوامی سیاسیات کے ماہر ہیں، اور ان کے مضامین اور خیالات نہ صرف ترکی ہی میں بلکہ دنیا کے تمام سربرآوردہ جرائد کے نزدیک نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی اس نازک مرحلہ پر ان حضرات کی تشریف آوری خاص طور پر طمانیت بخش ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر اس موقع پر موجودہ جنگ کے متعلق ترکی جمہوریت کی روش کا مختصر سا ذکر کیا جائے۔ اہل یورپ کچھ عرصہ سے ترکی کو چنداں اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے اور گذشتہ جنگ عظیم کے بعد تو یہ نظر آتا تھا کہ ترکی چند روز کا مہمان ہے۔ قدرت کو اس

قوم کا قایم و دایم رکھنا منظور تھا چنانچہ اس قوم کو بچانے اور اس کی
حالت سدھارنے کے لئے ایسی عظیم الشان ہستی کو مامور کیا جس نے
دنوں ہی میں ملت ترک کے قالب میں نئی جان ڈالدی مصطفےٰ کمال پاشا
(جو بعد میں "ترکوں کا باپ" کہلایا) ہی کی بےنظیر کوششوں کا نتیجہ تھا کہ
۱۹۲۳ء میں ترکی جمہوریت وجود میں آئی اور وہ قوم کی متفقہ رائے
سے اسکے صدر منتخب ہوئے۔ اور بعد میں بھی جب تک زندہ رہے صدر
منتخب ہوتے رہے۔ اس فرد فرید نے ترکوں میں قومیت کا وہ بے پناہ
جذبہ اور عشق پیدا کیا کہ چند ہی سال میں ترکی کی کایا پلٹ گئی۔ یہاں تک کہ
وہ تمام یورپین طاقتیں جو ترکی طرف سے بے اعتنائی برتتی تھیں اب اسکی
دوستی کی خواہاں ہوگئیں۔ کمال آتا ترک مرحوم نے اپنی قوم کی احیاء
اور ترقی کیلئے وہ اصول قائم کئے جن پر عمل پیرا ہو کر ترکی میں کامل نظام
قایم ہوگیا اور رفتہ رفتہ وہ عروج حاصل ہوا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں
ملتی۔ آج بھی اسی کی روح کار فرما ہے۔ اور ملت ترک اسی کے پیدا
کئے ہوئے جذبے میں سرشار ہے۔ گذشتہ بیس برس میں ملت ترک نے
کمال اتاترک مرحوم، غازی عصمت انونو موجودہ صدر جمہوریت اور دیگر
عالی مرتبت رہنماؤں کی قیادت میں ایسی سیاسی، اقتصادی، معاشرتی
اور صنعتی ترقی کی ہے کہ ساری دنیا متحیر ہو رہی ہے۔ تین سال سے جنگ
کے شعلے ترکی کی طرف لپک رہے ہیں لیکن واہ رے ترکی جو ابتک محفوظ
ہے یہی وجہ ہے کہ ترکی تدبر آجکل ضرب المثل ہو رہا ہے۔

موجودہ جنگ کے چھڑتے ہی ترکی نے اپنی غیر جانبداری کا اعلان
کر دیا مگر ساتھ ہی فوجی تیاریاں بھی شروع کر دیں۔ اسے یہ خوف تھا کہ
کسی وقت اسے بھی میدان جنگ میں نہ کودنا پڑے۔ تین برس بیت
گئے۔ دنیا کیا سے کیا ہوگئی۔ مگر ترکی ہے کہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہے۔
ترکی مدبرین نے بارہا صاف اور غیر مبہم الفاظ میں اپنی غیر جانبداری
کا اعلان کیا ہے مگر وہ یہ بھی کہتے رہے ہیں کہ اگر کسی فریق نے ان کی
آزادی کے چھیننے کی کوشش کی تو اسکے بچاؤ کیلئے جان لڑا دینگے۔ جرمنی
نے لاکھ جتن کئے۔ چاپلوسی کی، ڈرایا، دھمکایا مگر ترکی ٹس سے مس نہ ہوا۔
ترک اپنے دوستوں اور ہمسایوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ یورپ کی دیگر
حکومتوں کا انجام ان کے پیش نظر رہا ہے۔ ہٹلر جیسے جابر اور خود غرض
ڈکٹیٹر سے وہ بھلا کب امید رکھ سکتے تھے کہ جرمنی کی دوستی میں ترکی کی
آزادی برقرار رہ سکے گی؟ چنانچہ انھوں نے کھلے بندوں کہدیا کہ وہ
جرمنی کے بھرّوں میں نہ آئیں گے۔

ترکی بیشک غیر جانبدار ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں
ہوسکتا کہ ترکی اور برطانیہ کے تعلقات مدتوں سے دوستانہ چلے آرہے ہیں
اور اس جنگ کے دوران میں اور بھی گہرے ہوگئے ہیں۔ جنگ کے چھڑتے ہی
یعنی اکتوبر ۱۹۳۹ء میں ترکی، برطانیہ اور فرانس کے درمیان ایک دوستانہ
معاہدہ ہوا تھا۔ سقوط فرانس کے بعد نظر آرہا تھا کہ برطانیہ زیست اور موت
کی آخری کشمکش میں گرفتار ہے۔ تاہم ترکی اپنے عہد پر قائم رہا۔ جرمنی نے اس
نازک موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی مگر بیسود۔ چنانچہ اس جرمنی
نے اپنا ایک خاص وزیر مختار انگورہ بھیجا تاکہ ترکی کو اپنے معاہدہ سے
منحرف کرے۔ ان دنوں ترکی کے مشہور روزنامہ "وطن" نے ان الفاظ میں
جرمنی کو جواب دیا "برطانیہ اور ترکی کی دوستی کوئی اتفاقیہ بات نہیں بلکہ
ایک اٹل تاریخی ضرورت ہے۔ اسلئے یہ دوستی تغیر ناپذیر ہے"۔ ۵؍ اگست ۱۹۴۲ء
کو ترکی وزیر اعظم سراج اوغلو نے اپنے ایک اعلان میں فرمایا: "برطانیہ اور
ترکی کی دوستی ہمارے سیاسی نظام کے اساسی لوازمات میں سے ہے"۔ ایک ماہ
بعد یعنی ستمبر ۱۹۴۲ء میں ترکی کے مشہور روزنامہ "اولوس" کے مدیر نے برطانیہ

(صفحہ ۱۹)

رفتار زمانہ

شمالی افریقہ

پچھلے دو ہفتوں میں واقعات کی رفتار تیز رہی ہے۔ برطانوی آٹھویں فوج نے طرابلس پر قبضہ کر لیا اور اب وہ ٹیونیسیا میں بڑھ رہی ہے۔ ایری ٹیریا۔ لیبیا۔ اور ٹریپولیٹینیا میں اطالوی سلطنت کا اب نام و نشان بھی نہیں رہا۔ بچی کھچی اطالوی قوتے ٹیونیسیا میں پسپا ہو رہی ہیں۔ مسولینی اسی ٹیونیسیا کا اپنے آپ کو حقدار سمجھتا تھا۔ اطالویوں کو ٹیونیسیا لینے کی بڑی آرزو تھی۔ اب وہ بحالت مجبوری وہاں جا رہے ہیں۔

مسٹر چرچل، پریذیڈنٹ روز ویلٹ اور برطانوی اور امریکی کمانڈروں کے درمیان کیسا بلینکا میں گفت و شنید ہو چکی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں یہ غالباً سب سے بڑی جنگی مشاورت ہے۔ یہ قرار پایا ہے کہ محوری طاقتوں پر ایک عظیم الشان دھاوا کر دیا جائے۔ اور اس غرض سے ایک اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ کیونکہ گو افریقہ اور روس میں اب ان کا وہ زور نہیں رہا۔ تاہم وہ اتنی قوی ضرور ہیں کہ ان کو مغلوب کرنے کے لئے سوچ بچار اور جرأت درکار ہے۔ ٹریپولیٹینیا میں فوجی نظام قایم ہو گیا ہے اور سخت احکام جاری کر دئے گئے ہیں کہ مدرسوں میں فسطائیت اور نازیت کی کوئی تعلیم نہ دیجائے۔

روس

محوری قوتے جو سٹالن گراڈ پر قبضہ کرنے کی ناکام کوشش کرتی رہیں اُنکی تعداد ڈھائی لاکھ تھی۔ اس عظیم الشان فوج میں سے تھوڑی سی بچ رہی ہے۔ باقی کا صفایا کر دیا گیا ہے۔ جنرل پالس اور گیارہ دیگر جرنیلوں نے ہتھیار ڈالدئے اس جنرل پالس کو ہٹلر نے چند ہی گھنٹے پیشتر فیلڈ مارشل بنایا تھا۔ گذشتہ چند دنوں میں جرمن اسیروں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے، اور جرمنوں نے ایسی شکست کھائی ہے کہ جس کی نظیر تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی۔ شہر سٹالن گراڈ میں اب پورا امن و امان ہو رہا ہے۔ دریائے والگا بھی جو حمل و نقل کے اعتبار سے روس کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے، اب محفوظ ہو گیا ہے۔ ہٹلری قوتے جو جنوبی قفقاز کی طرف بڑھ رہی تھیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ باکو کے تیل کے بڑے چشموں پر قبضہ جما لیں۔ اس حد تک تو وہ ضرور کامیاب ہو گئی تھیں کہ میکوپ کے تیل کے چھوٹے چھوٹے چشمے ان کے ہاتھ آگئے۔ مگر ان چشموں سے وہ کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ اب میکوپ پھر روسیوں کے ہاتھ آ گیا ہے۔ اور انھوں نے تیل کے استخراج کی تدابیر عمل میں لانا شروع کر دی

ہیں۔ سٹالن گراڈ والی جرمن فوجوں کی طرح قفقاز کی جرمن فوجوں کو بھی گھر جانے کا خطرہ ہے۔

جرمنی

ہٹلری اقتدار کا دسواں سال، ۳۰ر جنوری کو پورا ہوا لوگوں کو پوری توقع تھی کہ اس موقعہ پر ہٹلر تقریر کرے گا۔ مگر کسی وجہ سے اس نے خود بولنا پسند نہیں کیا۔ اور اسکی جگہ اس کے پٹھو گورنگ اور گوبلز ریڈیو پر بولے۔ یہ دونوں حسب معمول بڑھ بڑھ کے ڈینگے مارتے رہے۔ تاہم اس مرتبہ انھیں یہ ماننا پڑا کہ روسی ان کی توقعات سے کہیں زیادہ طاقتور نکلے۔ کچھ اوپر ایک سال ہوا انھوں ہی نے یہ پیشین گوئی کی تھی کہ روسیوں کو چند ہی دنوں میں شکست فاش ہوا چاہتی ہے۔ ان کی تقریروں کا جو اثر ہوسکتا تھا وہ ایک حد تک اس وجہ سے بھی زائل ہوگیا کہ وہ تقریر کیا ہی چاہتے تھے کہ برطانوی طیارے برلین پر پل پڑے۔

جاپان

جاپان میں ابھی کس بل باقی ہے اور اسے قطعی طور پر نیچا دکھانے کے لئے متحدین کو اپنا پورا زور لگانا پڑے گا لیکن جاپان کو بہت سی اُمیدیں تھیں جو بر نہ آئیں۔ اسے بڑی اُمید تھی کہ ادھر وہ لڑائی میں کودا اور اُدھر روس جیت ہوا۔ ۱۹۴۱ء میں جرمنوں کی ماسکو اور لینن گراڈ میں ناکامی سے جاپان ضرور رُک جاتا۔ مگر وہ پوری تیاری کرچکا تھا اور لڑائی میں شامل ہونے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ دیگر مایوسیاں یہ تھیں کہ اس کی قوائے فضائی برطانوی اور امریکی طیاروں کا مقابلہ نہ کرسکی۔ اور اس کے بیشمار سمندری جہاز ڈبو دئے گئے۔

افغانستان

عالیجناب خالد الزہاوی پاشا وزیر مختار سلطنتِ عراق متعینہ افغانستان کابل میں تشریف فرما ہوئے۔ اور والا حضرت وزیر خارجہ افغانستان اور سفارتخانۂ عراق کے سٹاف نے کوٹھی بگرامی میں آپ کا استقبال کیا۔

افغانستان کے نامی ادیب آقائے احمد علیخاں کہزاد عنقریب ایک ماہوار علمی اور تاریخی رسالہ "آریانہ" کے نام سے نکال رہے ہیں۔

آٹھ افغانی طلبا فن نمک سازی سیکھنے کیلئے ہندوستان آئے ہیں

ادارہ

ہوگئے رسوا انھیں، کہا مانو
بات بڑھ جائے گی بہت یوں تو
چپ کے سُن لو الگ جو سُنتے ہو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا، گلا نہ ہوا

مرزا

اتنے بید رد بھی ذرا نہ بنو
کہ غرض کچھ بُرے بھلے سے ہو
ہے یہ آپس کی بات سوچو تو
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو
اک تماشہ ہوا، گلا نہ ہوا

قادری

فلسفۂ وحی

نمبر ۵

ڈاکٹر احسان اللہ خاں پروفیسر فلسفہ اسلامیہ کالج پشاور

چونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ خدا اور انبیار کے درمیان ارتباط ممکن ہے۔ لہٰذا اب یہ ماننے میں چنداں دشواری نہیں کہ ان کے پاس خدا کے پیام بھی آتے ہوں گے۔ یہ بات بالکل قرین عقل ہے کہ جہاں خدا اور انبیار کے درمیان ارتباط قائم ہو وہاں اسی رابطہ کے توسط سے خدائی پیام بھی کسی نہ کسی شکل میں انبیار کے پاس پہنچتے رہے ہوں گے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ایسے روحانی پیام آسکتے ہیں تو سمجھ لیجئے کہ مسئلہ وحی تقریباً سارے کا سارا حل ہوگیا۔

ایسے پیاموں کے دو مدارج ہیں۔ اوّل وحی، دوم الہام۔ جس شخص کے پاس وحی آتی ہو وہ اس کے ورود پر پورا یقین رکھتا ہے۔ اور بالکل مطمئن ہے کہ وہ جو کچھ محسوس کرتا ہے۔ کوئی فریب نظر یا خواب پریشاں نہیں۔ وہ خدا کے وجود کو محسوس کرتا ہے۔ اور اس کیفیت ارتباط میں اس کی تجربی اور حسّی ہستی بالکل محو ہو جاتی ہے اور اس پر کامل روحانی اہتزاز اور محویت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

الہام میں یہ صورت پیدا نہیں ہوتی۔ ان دونوں کیفیتوں میں کئی فرق ہیں۔ اوّلاً الہام وحی کی ایک رقیق اور کمزور صورت ہے۔ تاہم جو فرق ان میں ہے وہ نوعی نہیں بلکہ محض درجہ کا ہے۔ جس شخص کو الہام ہوتا ہے اس پر پورا وجد طاری نہیں ہوتا اور وہ اپنے مادّی وجود کو اپنے نفس فوق الحس سے کامل طور پر جدا نہیں کرسکتا۔ اس کے علاوہ وہ اس شخص کی طرح جس پر وحی نازل ہوتی ہے پورے طور پر مطمئن نہیں ہوتا اور صاف طور پر تعین نہیں کرسکتا کہ جو کچھ وہ درک کرتا ہے آیا وہ کسی فوق تجربی حقیقت کا ادراک ہے یا نرا وہم اور فریب نظر ہے۔ ثانیاً، وحی اور لوگوں کے لئے بھی اتنی ہی معقولیت اور استنادیت کے ساتھ قابل پابندی ہے جتنی انبیار کے لئے ہے۔ برعکس اس کے الہام صرف ملہم کے لئے قابل پابندی ہے۔ اور عام اطلاق نہیں رکھتا۔ ثالثاً وحی صرف انبیار پر نازل ہوتی ہے۔ لیکن الہام انبیار کے علاوہ اولیار، صوفیا وغیرہ کو بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی ان لوگوں کو بھی جنھوں نے مسلسل تقویٰ، اور پرہیزگاری کے توسط سے اپنے اخلاقی احساسات کو محفوظ یا اپنی بہیمیت کو اپنے اخلاقی انضباط اور ارادے کے تابع کرلیا ہے۔

وحی کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اوّل، وحی متلو۔ دوم، وحی

غیر متلوّ ہے۔ وحی متلوّ وہ ہے جو خدا کی اپنی آواز اور اس کے اپنے الفاظ میں صاف صاف اور ڈھلی ڈھلائی اُترے۔ اور نبی اس بات کا پابند ہو کہ اسے اسی ہیئت میں اپنے حواریوں تک پہنچا دے۔ وحی غیر متلوّ وہ وحی ہے جس کے عام مفہوم یا خلاصہ کو نبی اپنے الفاظ میں تبلائے۔ بہت سے حضرات وحی متلوّ کو اس لحاظ سے کہ وہ خدا کے اپنے الفاظ میں ہوتی ہے ایک عجیب وغریب بات سمجھتے ہوں گے۔ مگر میرے نزدیک اس کے امکان میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اگر آپ یہ مان لیں کہ خدا اور بشر میں ارتباط ہو سکتا ہے تو آپ کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خدا بشر تک اپنا پیام پہنچا سکتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ سمجھ سکنا کچھ دشوار نہیں کہ خدا کا پیام اس کے اپنے الفاظ میں ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہم مسلمان ہونے کی حیثیت سے یہ یقین رکھ سکتے ہیں کہ قرآن کریم نبی پر خدا کے اپنے الفاظ میں نازل ہوا، اور اسی طرح سے انجیل اور زبور کا نزول ہوا۔

وحی کے مدارج جن کا ابھی ذکر ہوا ہے، یورپ کے کے مفکّرین کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ ان کے پاس ان تمام مطالب کے لئے صرف ایک اصطلاح ہے اور وہ وحی ہے۔ اور وحی کا مفہوم بھی ان کے نزدیک وہ نہیں ہے جو اسلام اور اسلامی فلسفہ اور تصوّف نے بتایا ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا اور انسان میں اتنا بیّن فرق ہوتے ہوئے انسان کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ خدا کو ڈھونڈے۔ اور اس سے کوئی پیام یا ہدایت حاصل کرے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ ضرورت اس کی خلقت میں موجود ہے۔ یہ وہی باطنی تحریک ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں اور جسے ہم نے عارضی طور پر مسترد کر دیا تھا۔ اس باطنی تحریک کی ضرورت وہاں نہیں بلکہ یہاں محسوس ہوتی ہے۔ یہی باطنی تحریک کا مادّہ جو ہماری معیاری فطرت کا ایک گہرا مقتضیٰ ہے۔ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم خدا کی تلاش جاری رکھیں، اور جب کبھی اس کی جانب سے کوئی پیام یا ہدایت صادر ہو تو اسے قبول کریں۔ ساری مافوق الطبیعاتی تحقیقات کی تہ میں بھی باطنی تحریک ہی ہے۔ لہذا خدا کی تلاش ہماری فطرت کے ہرگز منافی نہیں۔ اگر ہوتی تو قرون ماضی کے فیلسوف مافوق الطبیعاتی اصول اور نظام کے وضع کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن تھا کہ ہم ایک ایسی بات کو قبول کرتے جو ہماری فطرت کے منافی ہو، اور باہر سے ہم پر مڑھی گئی ہو۔ فی الحقیقت، یہ باطنی تحریک ان بنیادی بشری احساسات سے ہے جو ہمارے نفس اور روح کی ترکیب کے لئے ناگزیر ہیں۔ یہ مانتے ہوئے کہ یہ مادہ ہمارے اساسی احساسات کا جزو لاینفک ہے۔ میں اپنے اسی عقیدہ پر قائم ہوں کہ یہ باطنی تحریک بذات خود اور بنا وحی کے ایک کورانہ آرزو ہے جو بَر نہیں آسکتی۔ فی الواقع وحی اور باطنی تحریک مل کر انبیا کو اس بات پر آمادہ کرتی رہی ہیں کہ جب خدا اپنا پیام بھیجنا چاہے تو وہ اسے قبول کریں۔

اب تک تو انبیا کا خدائی پیاموں کو قبول کرنا زیر بحث تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم نبی کے پیام کو کیوں قبول کرتے ہیں؟ اس کی تہ میں بھی وہی باطنی تحریک ہے جو خدا کی تلاش پر مجبور

کرتی ہے۔ ہمیں خدا کی شدید آرزو ہے۔ اس کو جاننے کے لئے ہم بیتاب ہیں۔ وہی ہمارا لنگر ہے، وہی ہمارا سہارا ہے۔ اس پر ایمان ہو تو زندگی کی ساری صعوبتیں قابل برداشت ہو جاتی ہیں۔ ایسی صورت میں جب کبھی کسی متبرک ہستی کے توسط سے اس کا پیام آئے تو ہم قدرتی طور پر اسے لبیک کہنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ وہ متبرک شخص واقعی نبی ہی ہے۔ اور اس کا دعویٰ محض ایک خیالی ترنگ نہیں ہے؟ نبوّت کا معیار کیا ہے؟ کسی ایک شخص کو اوروں کے مقابلہ میں میں نبی کیوں سمجھتا ہوں؟ یہ دعویٰ اتنا بلند ہے اور اتنی عظمت و افتخار کا حامل ہے کہ ہر کس و ناکس نبی کہلانے کے لئے تیار ہو سکتا ہے؟ پس ایسے شخص میں اور نبی میں کیونکر تمیز ہو سکتی ہے؟ (باقی آئندہ)

پشتو رسم الخط کے بارے میں ہز ہائینس مہتر صاحب چترال کی گرانقدر رائے

اس سے پہلے زیر بحث پشتو رسم الخط کے متعلق متعدد ادبا اور مبصرین کی آرا آپ کی نظر سے گذر چکی ہیں۔ اس سلسلہ میں ہز ہائی نس مہتر صاحب چترال کی زرین رائے جو موصوف نے حال ہی میں مولانا عبدالقادر خاں صاحب کو ایک خط میں ظاہر فرمائی ہے خاص طور سے قابل قدر ہے۔ موصوف فرماتے ہیں۔ (ادارہ)

"اس لحاظ سے میں سخت مجرم ہوں کہ آپ کی دلپذیر مطبوعات میں پوری پوری دلچسپی نہ لے سکا۔ لیکن آپ ایک مسن اور مفلوج آدمی سے توقع ہی کیا رکھ سکتے ہیں۔

البتہ پشتو رسم الخط کے بارے میں جو بحث جاری ہے اسے بغور پڑھتا رہا ہوں۔ میرے دوست خان محمد اسلم خاں (مردان) اور وادیٔ پشاور کے دیگر حضرات نے اپنے مضامین میں جانبداری سے کام لیا ہے۔ میری دانست میں اس بات کی ضرورت ہے کہ وادیٔ پشاور کے رہنے والے اپنی قوم کے استحکام کی خاطر اپنے مخصوص اختلافات کو ترک کر کے وہ تلفظات اختیار کریں جو ساری پشتون قوم میں متداول ہیں، کیونکہ وادیٔ پشاور کے رہنے والوں کی تعداد کم ہے اور ان کے تلفظات ساری پشتون قوم پر نافذ نہیں کئے جا سکتے۔

نقش باطل ہو چلا خوابِ پریشانِ بہار
دیدۂ حیراں میں کھنچ کر آگئی جانِ بہار

ہوشیار اے چشمِ نرگس اے نگہبانِ بہار
ہے زوالِ رنگ و بو دست و گریبانِ بہار

آگ برسائے فلک یا آبِ حیوانِ بہار
زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے پشیمانِ بہار

چشمِ پُرخوں نے مجسم کر دیا موہوم کو
ورنہ بے تعبیر تھا خوابِ پریشانِ بہار

چاندنی کی سیر کرتے ہم سے آنکھیں مانگ کر
ہیں کدھر پروانۂ شمعِ شبستانِ بہار

اپنا ہاتھ اپنا گریباں اپنا سودا اپنا سر
استعارہ کر چکے پابندِ فرمانِ بہار

پیرہن کیا گھر بھی خوش وقتی کے مارے تنگ ہے
آشیاں ہے اپنے حق میں طرفہ زندانِ بہار

حاشیے کیا کیا چڑھاتے ہیں قفس میں زندہ دل
مُردہ دل کہتے ہیں بے معنی ہے فرمانِ بہار

کیوں قفس بر دوش پھرتے ہیں اسیرانِ ہوس
ننگِ یارانِ چمن ناخواندہ مہمانِ بہار

اے خزاں پروردہ دل فکرِ چمن سے باز آ
اپنے اوپر رحم کر اے دشمنِ جانِ بہار

قافلے کا قافلہ مارا ہوائے دہر نے
رہ گئے سوتے کے سوتے سب حسینانِ بہار

خار و گُل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے
دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار

دیکھنا یہ ہے کہ آخر تک ٹھہرتا کون ہے
بوٹا بوٹا بن گیا ہے مردِ میدانِ بہار

رنگ و بوئے عارضی سے دل بہلنے کا نہیں
فکرِ فردا ہے نظر میں خارِ دامانِ بہار

اپنے اپنے رنگ میں اور اپنے اپنے حال میں
کوئی حیرانِ خزاں کوئی پشیمانِ بہار

دیکھ لیتا ہوں چمن کو دور سے بیگانہ وار
یاسؔ مجھ سے کیوں کھٹکتا ہے نگہبانِ بہار

افغانی دنیا کے گوشہ گوشہ سے افغان ادبا رنے پشتو رسم الخط کی بحث میں جس جوش اور خلوص سے حصہ لیا ہے اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔ افغانوں نے اپنی مادری زبان میں دلچسپی لے کر دنیا پر یہ روشن کردیا ہے کہ اُن میں ملی جذبہ کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اب انھوں نے یہ ٹھان لیا ہے کہ جس طرح بھی ہو افغان سب ایک مرکز پر جمع ہوکر رہیں گے۔ اس لئے تمام افغان خواہ وہ ہندوستان یا ہندوستان سے باہر انگلستان، آسٹریلیا، امریکہ یا افریقہ یا جہاں کہیں بھی آباد ہیں سب کے سب وحدت ملی کے جذبہ سے سرشار نظر آتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افغانوں میں اُن کے آباؤ اجداد کا غیور خون ایک بار پھر دوڑنے لگا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہمارے افغان بھائی جو وطن سے دور مختلف جگہوں میں کئی پشتوں سے آباد ہو چکے ہیں۔ اور بدقسمتی سے اپنے آبا و اجداد کی دیگر مخصوص اور قابل فخر روایات کے علاوہ اپنی مادری زبان بھی بھلا بیٹھے ہیں۔ وہ بھی یہ چاہتے ہیں کہ افغانوں کے ان منتشر اجزار کو یکجا کر کے پھر سے ایک ہی لڑی میں پرو دیا جائے۔ اس جذبہ سے متاثر ہوکر وہ نہ صرف پشتو رسم الخط میں ہمارے ساتھ برابر کے شریک نظر آ رہے ہیں۔ بلکہ اس بات پر بھی مُصر ہیں کہ زبان کی اصلاح میں اُن کی ضروریات اور مشوروں کو خاص اہمیت دی جائے۔ ہم معزز قارئین کرام کو خلوص سے مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بہت جلد اُن کا یہ جائز مطالبہ منظور فرمائیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ آبائی وطن میں بھی اپنے حصّہ کا مطالبہ کر بیٹھیں۔ اور جو جگہ پہلے ہی سے افغانوں کی کثرت آبادی سے خود اُن کے گذر کے لئے ناکافی ہے۔ ان کے آنے سے اور بھی تنگ ہو جائے۔ اور بعد میں ہیں بیحد پریشان ہونا پڑے۔

کیا ان پردیسی بھائیوں کا ہم پر یہ کچھ کم احسان ہے کہ انھوں نے صرف ہماری آسودگی کی خاطر اپنے محبوب وطن کو خیرباد کہا۔ وطن سے دور جاکر گوناگوں مصائب اور آلام اٹھائے۔ انتہائی ناسازگار جغرافیائی اور سیاسی حالات میں بھی اپنی انفرادیت کو نہ چھوڑا۔ اور آج خدا کے فضل و کرم سے متعدد جگہوں میں قیمتی جائدادوں اور ریاستوں کے مالک بنے ہوئے ہیں۔

منجملہ ان پردیسی بھائیوں کے خان مشتاق علی خان بھی ہیں جو موضع جھجکر اس ضلع رہتک کے نامی رئیس ہیں۔
ان کے قرب و جوار میں اور بھی کئی افغان ریاستیں موجود ہیں۔ مثلاً کنجپورہ، مالیر کوٹلہ، دوجانہ اور جھجھر وغیرہ۔ خانصاحب
ہمارے افغان بھائی ہیں اور کئی پشتوں سے آپ کا خاندان یہاں آباد ہے۔ لیکن قابلِ فخر بات یہ ہے کہ باوجود اسقدر
عرصہ گذر جانے کے اپنے افغان بھائی بشیر حسین خاں انکم ٹیکس افیسر ساکن کنجپورہ کی طرح ان کا خاندان بھی اُن تمام افغانی
روایات اور مخصوص صفات کا مالک ہے جن پر اُن کے آباؤاجداد کو ناز تھا۔ موصوف ایک نامور ادیب اور صاحب قلم
ہیں۔ مدتوں معزز معاصر "زمیندار" لاہور کے ادارہ میں سب ایڈیٹر کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔

موصوف نے نن پرون کے اس اشاعت میں رسم الخط کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ ادارہ
نن پرون اس کرم فرمائی کا ممنون ہے۔ اور موصوف کو یقین دلاتا ہے کہ خواہ انھیں اور کہیں حصہ نہ ملے، کم از کم
نن پرون کے کالموں میں اُن کے لئے حصّہ ضرور محفوظ رہے گا۔ جس سے وہ بڑے شوق سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

(ادارہ)

پشتو رسم الخط کے موضوع پر سب سے پہلے "اتحاد افغان" میں دو مضمون میری نظر سے گذرے۔ جن میں ایک سردار محمد یعقوب خاں کے قلم سے تھا۔ اور دوسرا سید انوار الحق صاحب کے قلم سے۔ یہ دونوں مضمون در اصل اُس بحث کے سلسلہ میں تھے جو "نن پرون" میں مولانا عبد القادر خان صاحب کے ایک مضمون سے شروع ہوئی۔ خوش قسمتی سے کچھ عرصہ بعد اخبار "نن پرون" کے چند گذشتہ پرچے میرے ہاتھ لگے جن میں مولانا عبد القادر خانصاحب کا وہ مضمون بھی تھا جس پر اس دلچسپ اور کارآمد بحث وتمحیص کی بنیاد رکھی گئی۔ علاوہ ازیں "نن پرون" کے ان پرچوں میں بعد کے وہ مضامین بھی ملے جو مولانا کے جواب میں علی الترتیب پروفیسر محمد علی خانصاحب، سید رسول رسا صاحب اور سید انوار الحق صاحب نے سپرد قلم کئے۔ ممکن ہے اس سلسلہ میں اور مضامین بھی شایع ہوئے ہوں۔ لیکن میری نظر سے صرف یہی گذرے ہیں۔ اور انھیں پر میں اپنے موجودہ مضمون کی اساس قائم کرتا ہوں۔

مولانا عبد القادر خانصاحب نے پشتو رسم الخط کے مسئلہ سے اس بحث کی ابتدا کی ہے۔ مگر بعد میں آپ نے ایک مقالہ پشتو زبان کے معیار انتخاب پر بھی سپرد قلم کیا ہے۔ اور اس پر بھی بعض اصحاب نے اظہار خیال کیا ہے۔ لیکن مجھے سردست صرف پشتو رسم الخط پر گفتگو مدّ نظر ہے۔

کسی جماعت کے درجۂ قومیت حاصل کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اُس میں زیادہ سے زیادہ وحدتِ فکر و عمل قائم کیجائے اور تعمیر قومیت کے یہ نہایت ابتدائی لوازم ہیں۔ انھیں میں وحدت لسان اور رسم الخط بھی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ

کہ وہ عربی ہو، فارسی ہو، پشتو ہو۔ کچھ بھی ہو۔ مگر ایک ہو
اگر اس وقت زبان کا سوال درپیش ہوتا، تو میں
پشتو پر فارسی کو اس لئے ترجیح دیتا۔ کہ (۱) اس میں ایک
شان بین الاقوامیت ہے (۲) افغانوں کا بیشتر حصہ زبان فارسی
سے واقف ہے (۳) صدیوں یہ حکومتِ افغانستان وہندوستان
کی دفتری زبان رہی ہے (۴) ہمسایہ ملک ایران کی کاروباری
زبان یہی ہے (۵) دوسرے ہمسایہ ممالک میں بھی یہ زبان
مروّج ہے (۶) ہندوستان میں اس زبان کے جاننے والے
بکثرت ہیں (۷) اس زبان میں علوم وفنون کا ذخیرہ موجود ہے
(۸) یہ قواعد وضوابط میں بندھی ہوئی زبان ہے (۹) ایک
مبتدی کے لئے اس کا سیکھنا آسان ہے (۱۰) ممالک مغربی
میں اس زبان کے عالم فاضل موجود ہیں (۱۱) اس زبان کی
درس وتدریس کا یورپین یونیورسٹیوں میں اہتمام ہے (۱۲)
اس زبان کے اختیار کرنے پر افغانوں کا سلسلۂ تعلقات
بہت وسیع ہو سکتا ہے۔

مگر اب یہ مسئلہ خارج از بحث ہے کہ پشتوں قوم کی
زبان فارسی ہو یا پشتو، کیونکہ حکومت افغانستان پشتو کے
حق میں اپنا فیصلہ دے چکی ہے۔ اور اس کی ترویج پر ستعدی
سے تلی ہوئی ہے۔ اسلئے اب اگر ایک حکومت کے مقابلہ پر کوئی
دوسرا فریق فارسی کی حمایت کرے تو نہ صرف اُس کی کامیابی
محال ہے بلکہ پشتون قوم کے دوراستے اختیار کرنے سے جو
مضر نتائج پیدا ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔ لہذا یہ مسئلہ تو طے شدہ
سمجھنا چاہئے کہ افغان کی قومی زبان پشتو رہے گی۔ یہ دوسری

بات ہے کہ وہ کس قسم کی پشتو ہو۔ اور اُس میں زبان و محاورہ
اور تلفظ ومعنی کی یگانگت رہ سکتی ہے یا نہیں۔ سردست زیر بحث
مسئلہ یہ ہے کہ پشتو کے لئے رسم الخط کونسا اختیار کیا جائے؟

مضمون نگار حضرات کی اکثریت اس بات پر تُلی ہوئی
ہے کہ موجودہ رسم الخط میں سر مو فرق نہ آئے۔ بلکہ بعض اصحاب
کے نزدیک تو حروف تہجی میں کمی بیشی کرنا بھی بدعت ہے۔ مگر
ان میں سے دو معزز و مقتدر بزرگ تبدیلی کے خواہشمند بھی ہیں
یعنی مولانا عبدالقادر خان صاحب اور پروفیسر محمد علی خانصاحب
اگرچہ ان میں سے ایک صاحب اردو رسم الخط کو ترجیح دیتے ہیں
اور دوسرے صاحب لاطینی رسم الخط کو۔ مگر جب اس اصول
کو تسلیم کر لیا جائے کہ تبدیلی کی ضرورت ہے تو پھر اسکی زیادہ
اہمیت باقی نہیں رہتی کہ تبدیلی کس صورت میں ہو۔

جس کسی ایسی قوم کی اصلاح وترقی کا سوال درپیش ہو
جو ابھی ارتقائی منزل سے بہت دور ہے تو اُس کے رسم و
رواج اور اوضاع واطوار میں بھی اہم تبدیلی لازم ہے۔ کیونکہ
جب تک کوئی بڑی ترمیم اور اہم مقصد سامنے نہیں ہوتا کسی
قوم میں ایک صحیح جذبۂ عمل اور حقیقی حرکت وحرارت پیدا نہیں
ہو سکتی۔ پس اگر افغان قوم میں ایک انقلابی روح بیدار کرنی
ہے تو اُسے یہ سمجھنے پر آمادہ کرنا چاہئیے کہ جس لباس میں جس
رواج میں اور جس ماحول میں وہ عروج وارتقار سے محروم رہی
ہے، بشرطِ ضرورت اُسے ترک کر دینے کے لئے ہر وقت تیار ہے

جب کوئی درماندہ قوم ایک انقلابی دائرہ میں قدم
رکھنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے تو عروج وارتقار کی منزل

اُس سے دور نہیں رہ سکتی۔ اور وہ بہت جلد دنیا کی بڑی
قوموں سے پہلو مار سکتی ہے۔ پس نہایت خوشی کا مقام ہے کہ
مولانا عبدالقادر خان صاحب اور پروفیسر محمد علی خانصاحب
جیسے موقع شناس بزرگانِ ملّت نے ایک اہم تبدیلی پر آمادگی
ظاہر کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کیا۔ اور مذہب، رواج، اور
قدامت کی وہ آڑ نہ لی جو مفلوج و محکوم قوموں کے لئے مخصوص
ہوچکی ہے۔

جب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ افغان کی قومی زبان پشتو
ہوگی تو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ افغان وہ قوم ہے جو کہیں فارسی
بولتی ہے۔ کہیں پشتو اور کہیں کوئی اور زبان۔ ایسی حالت میں
یہ اور بھی ضروری ہوجاتا ہے کہ پشتو زبان اور اس کے رسم الخط
میں ایسی تبدیلی کی جائے کہ دنیا کے ہر حصہ میں پشتون قوم اس
زبان کو اور اس کے رسم الخط کو کم سے کم دقت کے ساتھ قبول
کرلے۔ اس صورت میں پہلا قدم یہی اُٹھانا پڑے گا کہ اس زبان
کا رسم الخط تبدیل کردیا جائے۔ اس کے بعد دوسری دشواریاں
یا تو خود بخود حل ہوجائیں گی۔ یا ارباب فکر و بصیرت کسی مناسب
موقع پر اس کا حل تلاش کرلیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ رسم الخط کی تبدیلی کس صورت
میں ہو؟ اس کے لئے ہمیں ان دو راستوں میں سے ایک اختیار
کرنا پڑے گا جو مولانا عبدالقادر خاں صاحب اور پروفیسر محمد علی خاں
نے تجویز کیا ہے۔ اصولی طور پر میرے نزدیک دونوں برابر ہیں
کیونکہ ایک صورت انقلاب دونوں میں موجود ہے۔ مگر بایں ہمہ
رسم الخط مجوّزہ مولانا عبدالقادر خاں صاحب کو میں اس لئے
ترجیح دوں گا کہ اگر اُردو رسم الخط اختیار کرلیا جائے تو ہندوستان
کے پچاس لاکھ اُردو داں افغان بھی بآسانی اس دائرہ میں
آسکتے ہیں جنھیں اپنے رسم الخط میں پشتو زبان کا سیکھنا بہت
دشوار نہ ہوگا۔ پس اگر افغان کو ایک قوم بنا کر اسے ایک رشتۂ
اتحاد میں پرونا ہے تو ہر فریق کو کچھ نہ کچھ قربانی کرنی پڑے گی،
یعنی آزاد قبائل کو فارسی (اُردو) رسم الخط سیکھنا پڑے گا۔ جو
اُن کے لئے ایک آسان کام ہے۔ اور اُردو داں ہندی
افغانوں کو ایسی پشتو سیکھنی پڑے گی جو انھیں کے طرز تحریر
میں ہو۔ یعنی انھیں مقابلۃً زیادہ محنت و مشقت درکار ہوگی۔
لیکن پھر بھی رسم الخط کی یگانگت کے باعث بہت زیادہ مشکل
پیش نہ آئے گی۔ رہے افغانستان کے افغان۔ تو اُن کے لئے
کوئی تبدیلی بھی زیادہ دشوار نہ ہوگی۔ کیونکہ وہاں اس وقت
تک فارسی اور پشتو دونوں زبانیں اور دونوں رسم الخط رائج ہیں
لیکن اگر پشتو بخط عربی بدستور قائم رکھی گئی تو ہندوستان
کے پچاس ساٹھ لاکھ افغان محض رواجاً اور عرفاً افغان
رہ جائیں گے۔ اور اندیشہ ہے کہ مستقبل کی تاریکی میں وہ اپنا
نام بھی گنوا دیں گے۔ اس لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ
تعمیرِ ملّتِ افغانیہ کی کسی تجویز میں ہندی افغانوں کی تعداد کثیر
کو ہرگز فراموش نہ کیا جائے جس نے اپنی زبان کھو دینے
کے باوجود اپنی اصالت و عصبیت کو کسی نہ کسی طرح اب تک
برقرار رکھا ہے۔ پس بوجوہات مذکورالصدر میں پشتو رسم الخط
میں مولانا عبدالقادر خاں صاحب کی ترمیم کو نہایت ضروری
خیال کرتا ہوں، اور ان وجوہات کے علاوہ اُن دلائل سے

شمالی افریقہ میں اتحادیوں کی شاندار کامیابی

مشرق وسطے کی اتحادی افواج کے نئے کمانڈر انچیف
جنرل سرانچ الیگزینڈر بالقابہ

فتح طرابلس
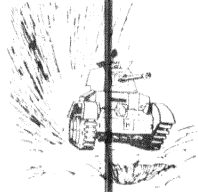
طرابلس فتح ہو ہی گیا - اس فتح کا سہرا جرنیل الیگزینڈر اور جرنیل منٹگمری کے سر رہا - محوری قوے بہت تیزی کے ساتھ ٹیونیسیا کی طرف پسپا ہو رہی ہیں اور اتحادی قوے ان کا تعاقب کر رہی ہیں اور اتحادی طیارے بڑھ بڑھ کر دشمن پر بمباری کر رہے ہیں - محوری سپاہ سمندر کے راستے سے بھی جا رہی ہیں - قرائن سے معلوم ہوتا ہے - کہ رومل نے ٹریپولیٹینیا چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے - اور وہ چاہتا ہے کہ اس کی قوے ٹیونیسیا کی محوری قوے سے جا ملیں -

جنرل منٹگمری کی قوے نے اس تھوڑے سے عرصے میں بارہ سو میل سے زیادہ فاصلہ طے کر لیا ہے - اب ٹیونسیا کے ایک جزوی حصے کے سوا شمالی افریقہ اتحادیوں کے قبضہ میں آ گیا ہے -

شہر طرابلس کا ایک منظر - محوریوں کا یہ اہم مرکز حال ہی میں اتحادیوں نے فتح کیا ہے -

آٹھویں فوج کے نئے جنرل آفیسر کمانڈنگ لفٹنٹ
جنرل برنارڈ منٹگمری

امید ہے - کہ جنرل منٹگمری اور جنرل آئزنہاور کی قوے عنقریب براعظم افریقہ سے محوریوں کا نام ونشان مٹا دیں گیں -
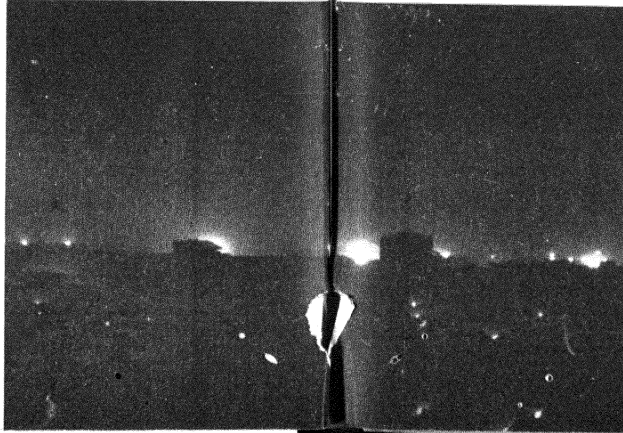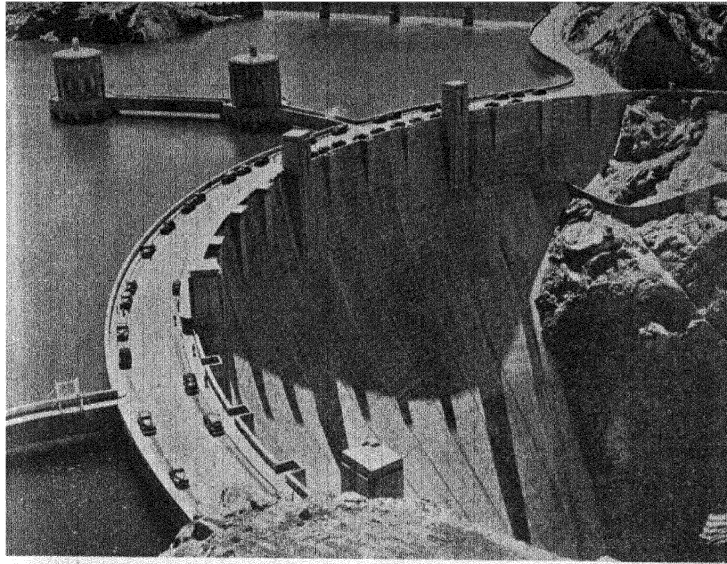
"بولڈر ڈیم"

دنیا کا بلند ترین بند جو دریائے کولوریڈو (امریکہ) پر بنایا گیا ہے اور جہاں سے زراعت اور جنگی کارخانوں کے لئے بجلی مہیا ہوتی ہے۔

یہ انجینئری کا وہ شاہکار ہے جسے ہنری قیصر نے مقررہ میعاد سے ۱۸ ماہ پیشتر مکمل کر دیا تھا۔
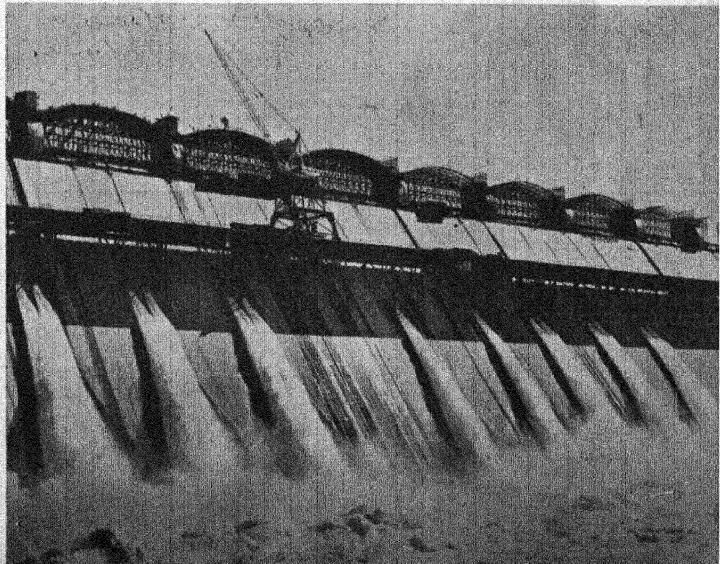
"گرینڈ کولی ڈیم"

دریائے کولمبیا کا ۲۳۵ فٹ اونچا بند۔ پانی کے گرنے کی آواز یہاں سے پندرہ میل تک سنائی دیتی ہے۔ اس بند سے ۲۴،۷۵،۰۰۰ ہارس پاور برق صنعتی کارخانوں کے لئے مہیا ہوتی ہے۔

یہ بند بھی ہنری قیصر کا ایک شاہکار ہے۔

بھی متفق ہوں۔ جو مولانا نے فارسی (اُردو) رسم الخط اختیار کرنے کے لئے دی ہیں۔

اُردو رسم الخط قبول کر لینے پر پروفیسر محمد علی خانصاحب کی تجویز خود بخود ساقط ہو جاتی ہے۔ اگرچہ میں اُن کے خلوصِ نیت اور جذبۂ ارتقار کی تہ دل سے قدر کرتا ہوں۔ اور یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اُن کی تجویز کے مطابق لاطینی رسم الخط اختیار کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے۔ لیکن ہمارے لئے لاطینی طرز تحریر اختیار کرنا مقابلتہً دشوار ہوگا۔ اور یہ دشواری ہر خطّہ کے افغانوں کو برابر محسوس ہوگی۔ نیز ترکوں کا اور افغانوں کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ عثمانی ترک عملاً یورپ کے ہو چکے۔ اور اُن کا تمام کاروبار ممالک یورپ سے وابستہ ہے۔ مزید برآں عربی کی بجائے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے میں اُن کے جائز اختلافی جذبات کو بھی دخل ہے مگر ہمارا معاملہ دوسرا ہے۔ ہمارے گردوپیش ایشیائی قومیں ہیں جن کی زبان اور رسم الخط سب ایشیائی ہیں۔ اس لئے ترکوں نے جو کچھ کیا اُن کے لئے وہی درست تھا۔ اور اپنے لئے جو کچھ ہم کریں گے وہ ٹھیک ہوگا۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ استنبولی، اور اناطولی ترکوں نے جو رسم الخط اختیار کیا ہے وہ دنیا کے باقیماندہ ترکوں پر اثر انداز نہیں ہے۔ کیونکہ باقی ترکی دنیا کی جغرافیائی اور سیاسی حدود بالکل مختلف ہیں۔ جن میں عملاً کوئی ربط قائم نہیں ہے۔ مگر افغان قوم کے حالات وضروریات اس سے مختلف ہیں۔ اور اُسے بتدریج ایک ہی مرکز پر لانا مدّنظر ہے۔ اس لئے ہر فریق کو تھوڑی بہت قربانی دینی ہوگی۔ اور اپنی اپنی جگہ سے سرکنا پڑے گا۔ کسی کو رسم الخط تبدیل کرنا ہوگا۔ کسی کو زبان بدلنی ہوگی اور کسی کو رسم ورواج ترک کرنا پڑے گا۔ اسی کا نام انقلاب ہے۔ اور یہ انقلاب ہی قوم کے عروج وارتقار کا ضامن ہو سکتا ہے

یہ ایک امرِ حقیقت ہے کہ ترک قوم کی موجودہ ترقی میں لاطینی رسم الخط اور مغربی لباس کو بڑا دخل ہے۔ اگر یہ ظاہری تبدیلی یک قلم ظہور میں نہ لائی جاتی تو ہر مرحلہ پر دقیانوسی خیالات قومی ترقی کی راہ میں حائل ہوتے۔ اور ترکی قوم کی زندگی میں ایسا عظیم الشان انقلاب برپا نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اس تبدیلی کے بعد ترک قوم کی رفتارِ عمل خود بخود تجویز ہو گئی۔ اور اُس نے ہر نئی چیز کو اپنے فائدہ کے لئے ایسی آسانی سے قبول کر لیا۔ گویا وہ اس سے کبھی کی مانوس تھی۔ پس اگر افغان قوم زندہ قوموں کے دائرہ میں قدم رکھنا چاہتی ہے تو اُسے بھی تغیّر وتبدل کے لئے تیار ہونا چاہئے۔ اور اسوقت جو خفیف سی تبدیلی مولانا عبدالقادر خانصاحب نے پیش کی ہے اُسے اپنے دورِ انقلاب کی بنیاد قرار دینا چاہئے جس کا پہلا اور بڑا فائدہ تو یہی ہوگا کہ پشتو بولنے اور سمجھنے والوں کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوگا

اس مسئلہ کے اور بھی کئی اہم پہلو ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک کے لئے علیحدہ بحث درکار ہے۔ جسکی اس مضمون میں ہرگز گنجائش نہیں۔ لیکن بشرطِ ضرورت میں ان سب پر یا ان میں سے بعض پر اظہارِ خیال کے لئے تیار ہوں۔ سردست میں اس امید پر اس مضمون کو ختم کرتا ہوں کہ حضرتِ مولانا اور جناب پروفیسر صاحب اپنے معمولی سے اختلاف کو رفع کر کے آئندہ اس سلسلہ میں ہم آہنگی ویکجہتی سے ملّت افغانیہ کی رہنمائی کرینگے۔ اور مجھے یقین ہے کہ وحدتِ زبان و رسم الخط کے بعد ملت افغانیہ کو بفضلِ خدا وحدتِ فکر وعمل کی سعادت بھی بہت جلد نصیب ہو جائے گی۔

عورتوں کی حالت

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ لکھی پڑھی مسلمان عورتوں کی تعداد بہت بڑھ رہی ہے۔ یہ ترقی اس لئے ہے کہ سوویٹ یونین میں تعلیم اجباری ہے۔ سیاسی، اقتصادی، اور معاشرتی امور میں سوویٹ کی دیگر عورتوں کی طرح مسلمان عورتوں کو بھی پورے حقوق حاصل ہیں۔ رسالہ "کاروان" (انگریزی) دہلی کے سالانہ نمبر (جنوری ۱۹۴۳) میں مسٹر ولادیمیر شابئیف، مدیر سوویٹ یونین نیوز دہلی نے "سوویٹ مرکزی ایشیا" کے عنوان سے ایک بصیرت افروز مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ سوویٹ یونین کی مرکزی کونسل کے منتخب شدہ ممبران میں اس وقت چھ ازبک عورتیں ہیں، جن میں سے تین کے نام یہ ہیں، سماغنہ جو توہ فضائی میں پائیلاٹ ہے۔ طاہروفہ، جو فن تعمیر کی ماہرہ ہے۔ اور قاسموفہ جو جمہوری عدالتوں میں جج کی حیثیت رکھتی ہے۔ کارخانوں، دفتروں اور اشتراکی فارموں میں صرف ازبک عورتوں کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ ہے۔ پردہ بہت کم ہوتا جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ شہری عورتوں میں تو رہا ہی نہیں۔ البتہ دیہات میں کم و بیش ہے۔ عورتوں کی تعداد اور صحت عام طور پر روبہ ترقی ہے۔

مسلمانان سوویٹ یونین اور موجودہ جنگ

سوویٹ یونین نے وہ تمام امتیازات جو انقلاب سے پہلے مسلمانوں اور دیگر اقوام کے مقابلہ میں روسی النسل باشندوں کو حاصل تھے منسوخ کر دئے۔ انقلاب کے دوران میں جو قیود مذہبی آزادی پر لگائی گئی تھیں ۱۹۳۶ء کے مرممہ آئین کی رو سے وہ سب ہٹا دی گئیں۔ حکومت مسلم جمہوریتوں کی اقتصادی نشوونما میں خاص دلچسپی لیتی رہی ہے۔ اس ہمہ گیر انصاف اور ہمدردی کا یہ اثر ہوا ہے کہ سوویٹ یونین کے مسلمان اس جنگ کو حقیقی معنوں میں اپنی جنگ سمجھنے لگ گئے۔ اور اپنی آزادیوں کو سیلاب فسطائیت سے بچانے کے لئے اور اقوام کی طرح جان توڑ کوشش کر رہے ہیں۔

محترم معاصر "انقلاب" لاہور کی اشاعت مورخہ ۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء میں ایک شذرہ "روسی فوج میں مسلمان" کے عنوان سے درج ہوا تھا۔ جو یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

"سوویٹ یونین کے حیرت انگیز دفاع
میں مشرقی روس کی مسلمان قومیں نہایت بڑھ
بڑھ کر حصّہ لے رہی ہیں۔ آذربائیجان، ترکمانیہ،
ازبکستان، قازاقستان، قرقیز، تاتاریہ، باشقریہ
داغستان اور دوسری مشرقی جمہوریتوں
کے مسلمان سپاہی میدان جنگ کے ہر حصّے میں
داد شجاعت دے رہے ہیں۔ اور بعض نے
اپنی بہادری کے باعث سوویٹ کے بلند ترین
فوجی اعزاز بھی حاصل کئے ہیں۔ روس کا سب
سے بڑا فوجی اعزاز "سوویٹ یونین کا ہیرو"
ہے جو اب تک آذربائیجان کے دو، ترکمانیہ
کے ایک اور تاتاریہ کے ایک مسلمان کو حاصل
ہو چکا ہے۔

روس کے ترک و تاتاری مسلمان اپنی
عدیم المثال شجاعت کے لئے مشہور ہیں۔ لیکن
زار روس کی حکومت کے ماتحت انھیں بلند ترین
فوجی اعزاز نہیں مل سکتے تھے۔ وہ صرف
عیسائیوں کے لئے وقف رکھے گئے تھے لیکن
سوویٹ یونین اس قسم کے مذہبی امتیازات
سے بالا ہے۔ اور اب مسلمان سپاہیوں کی
بہادری کی قدر افزائی کما حقہ کیجاتی ہے۔"

سال گذشتہ مشہور فرانسیسی مصنف موسیو ژان رلشار
بلوش نے سوویٹ یونین کے شیخ الاسلام مفتی حاجی عبدالرحمن
رسولیوف سے اوفا (دارالخلافہ جمہوریت باشقریہ) میں
ملاقات کی۔ اس ملاقات کی مفصل کیفیت اخبار "سوویٹ
وار نیوز" میں شائع ہوئی تھی۔ چند مختصر اقتباسات یہاں درج
کئے جاتے ہیں جن سے سوویٹ یونین کے مسلمان علماء کا رویہ
واضح ہوتا ہے۔

مفتی صاحب نے گفتگو کے دوران میں فرمایا "حکومت
سوویٹ نے ہم مسلمانوں پر ایک ایسا عظیم احسان کیا ہے جسکو
ہم ہرگز نہ بھولیں گے۔ وہ یہ کہ ہمیں مذہبی آزادی اور مدنی و
سیاسی مساوات حاصل ہو گئی ہے۔ انقلاب سے پہلے یہ بات
کہاں؟ کسی مسلمان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ماسکو
کے قصر کریملین میں کسی کانفرنس میں شرکت کا اسے موقع دیا جا سکتا ہے
اب باشقر، تاتار، ازبک، ترکمان وغیرہ روسیوں اور دیگر
اقوام کے نمایندوں کے ساتھ برابر کی حیثیت سے قصر کریملین
میں سوویٹ یونین کی بڑی سے بڑی کانگریسوں اور اسمبلیوں
میں شریک ہوتے ہیں یہ وجہ ہے کہ ہم سوویٹ یونین کو اپنا
محبوب وطن سمجھتے ہیں۔ باشقریہ، کریمیہ، ترکمانیہ، قرقزیہ اور
قازاقستان کے مسلمان اپنی عزیز جانیں تک قربان کر رہے ہیں
کیونکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ جرمن فسطائیت حکومت زار
سے ہزار گنی بری ہے۔ جرمن قوم سمجھتی ہے کہ وہ ایک
فائق قوم ہے اور سارے جہان پر حکومت کرنا چاہتی
ہے۔ اس کی فتح میں کروڑوں آزاد مسلمانوں کی غلامی
مضمر ہے۔"

آپ نے موسیو بلوش کو بہت سے رسالے، پمفلٹس وغیرہ

دکھائے جو لاکھوں کی تعداد میں ازبکی، ترکمنی، تاجکی اور فارسی زبانوں میں چھپ کر تقسیم ہو چکے ہیں۔ ان میں آیات اور احادیث کی رو سے بتایا گیا ہے، کہ حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ آپ نے ترکمنی زبان میں چھپی ہوئی ایک زبردست اپیل بھی دکھائی جو سویٹ یونین کے اسلامی مراکز کی مرکزی کونسل کی طرف سے تمام مسلمانان عالم کے نام شائع ہوئی تھی۔

ایک روسی نامہ نگار نیکولائی ورتا نے تاجکستان کے مسلم لیڈر "ایشان" محمود زائر ملک سے ملاقات کی۔ آپ نے نامہ نگار موصوف کو مسلمانوں کے نام ایک زبردست اپیل دکھائی یہ اپیل ازبکستان، ترکمانیہ اور تاجکستان کے چھ مسلم لیڈروں کی طرف سے شائع ہوئی تھی جس میں "ایشان" صاحب کے علاوہ امام محمود اوف گلھانی، ایشان حیدر قلی اوغلی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس اپیل میں نازیوں کے وحشیانہ مظالم کی تفصیل دیتے ہوئے لکھا تھا "کیا اب بھی کوئی شک ہو سکتا ہے کہ ہٹلریت کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کا کیا انجام ہوگا؟ مسلمانو اٹھو اور آزادی خواہ اقوام کے دوش بدوش ہٹلریت کے خلاف جہاد جاری رکھو۔"

محترم معاصر روزنامہ "ڈان" دہلی کی اشاعت مورخہ ۲۴ر دسمبر ۱۹۴۲ء میں اخبار "ماسکو نیوز" کے نامہ نگار خصوصی کی ایک چٹھی درج کی گئی تھی۔ نامہ نگار موصوف لکھتا ہے کہ جمہوریت تاجکستان کی مسجد یعقوب بے میں نماز جماعت کے بعد اوفا کے مرکزی اسلامی بورڈ کی طرف سے شائع شدہ اپیل پڑھ کر سنائی گئی کریمیہ اور دیگر مقامات کے مسلمانوں پر نازیوں نے جو جو ظلم ڈھائے اور مساجد اور مسلم خواتین کی جو جو بے حرمتیاں کیں ان سب مظالم کی تفصیل اس اپیل میں درج تھی، اور آخر میں مسلمانوں کو غیرت دلا کر تاکید کی تھی کہ ہٹلریت کے قلع قمع کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ قربانی اور کوشش کریں۔ اس اپیل پر شیخ الاسلام مفتی عبدالرحمٰن رسولیوف، قازان اور ماسکو کے امام صاحبان، اور باشقریہ، تاتاریہ، قازقستان، سائبریا اور خطۂ یورال کے علماء کے دستخط تھے۔ جب یہ اپیل پڑھی جا چکی تو قاری امین امام مسجد نے خطبہ پڑھا، اور سب نے سویٹ یونین اور اتحادیوں کی فتح کے لئے دعا مانگی۔

سویٹ یونین کی مرکزی کونسل کے اجلاس مورخہ ۱۸ر جون ۱۹۴۲ء میں برطانیہ ممالک متحدہ امریکہ اور سویٹ یونین کے باہمی معاہدہ کے بارے میں جب مولوٹوف وزیر خارجہ کی رپورٹ پڑھی گئی تو بہت سے ممبران نے تقریریں کیں۔ اس میں سے کامریڈ یوسف اوف (نمائندۂ ازبکستان) کی تقریر کا ایک مختصر سا اقتباس درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ آپ اپنی تقریر کے دوران میں فرماتے ہیں:

"ازبکستان کے مزدور اس معاہدہ کو نہایت اطمینان کے ساتھ لبیک کہتے ہیں۔ یہ دستاویز دنیا کی امن پسند اقوام کے لئے تاریخی اعتبار سے بیحد اہم ہے۔ سویٹ یونین نے اپنے قول و قرار ہمیشہ نہایت ایمانداری سے اور ٹھیک ٹھیک نبھائے ہیں۔ ہم اس معاہدے پر ایمانداری سے عمل پیرا رہیں گے۔ اس معاہدے کی غرض وغایت یہ ہے کہ ہٹلریت کا خاتمہ ہو۔ قوموں کی آبرو اور ان کے حقوق محفوظ ہو جائیں۔ بنی آدم کو

نازی بربریت، ظلم و تعدّی اور قومی ذلت سے بچانا چاہیئے،
ان وجوہات کی بنا پر ازبکستان کے لوگ اس معاہدے اور
سٹالن کی سیاست خارجہ کے دل و جان سے حامی ہیں
ان اقتباسات سے عیاں ہے کہ سویٹ یونین کے
مسلمان کیوں اور کس جوش و ثبات کے ساتھ ابنائے وطن
کے شانہ بشانہ ہٹلریت کا جان توڑ مقابلہ کر رہے ہیں۔
ان مسلمان قوموں کی صدیوں اپنی سلطنتیں رہیں۔ ایک
وہ زمانہ تھا کہ ان کے سامنے یورپ بھی کانپ رہا تھا۔ وہ زمانہ
بھی آیا کہ یہ اقوام زار روس کی حلقہ بگوش ہو گئیں۔ انقلاب آیا
خدا خدا کر کے ننگین استبدادیت سے چھٹکارا ہوا، اور یہ قومیں
سویٹ یونین کے حریت پرور پرچم کے نیچے شاہراہ ترقی
پر گامزن ہونے لگیں۔ اب ہٹلریت کا ہولناک
سیلاب ان کی نئی آزادیوں، نئی ترقیوں، نئی اُمنگوں،
کو نیست و نابود کیا چاہتا ہے۔ یورپ کی بڑی سے بڑی
اور چھوٹی سے چھوٹی قوموں کی تباہی کا بھیانک منظر
سامنے ہے۔ یہ قومیں جانتی ہیں کہ ہٹلری نظام میں مذہبی
آزادی، قومی ہستی اور انفرادی وقار سب کے سب
محو ہو جائیں گے۔ دیگر قومیں غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑی
جائیں گی۔ سب سے بالاتر یہ کہ ہٹلریت اسلام کو مٹانے میں
کوئی کسر باقی نہ رکھے گی۔
تاجکستان کے مسلم لیڈروں کی طرح ہم بھی پوچھتے
ہیں :-

"کیا اب بھی کوئی شک ہوسکتا ہے کہ ہٹلریت کی کامیابی کی صورت میں مسلمانوں کا کیا انجام ہوگا"

(م۔ی۔د)

((بقیہ مضمون صفحہ ۱۴))

کے اخبار نویسوں کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کیا "آپ کی
جیت ہماری جیت ہے" اسی نازک دور میں جب خطرات کی ڈراؤنی
گھٹائیں برطانیہ پر چھا رہی تھیں تو ترکی کے ایک مشہور سیاسی
نامہ نگار نے لکھا تھا "جنگ ختم ہونے سے پہلے برطانیہ کئی نئے
دوست پیدا کرلے گا مگر ترکی ایسا دوست ثابت ہوگا کہ برطانیہ
اسے ہرگز نہیں بھولے گا۔ کیونکہ ترکی اچھی بُری ہر حالت میں برطانیہ
کا دوست رہا ہے"
ترکی اور برطانیہ کے باہمی خوشگوار تعلقات کا بیّن ثبوت اس
ملاقات سے بھی ملتا ہے جو حال ہی میں غازی عصمت انونو اور مسٹر چرچل
کے درمیان بمقام "عطنہ" (ترکی) ہوئی ہے۔ یہ ملاقات صرف یہی
اہمیت نہیں رکھتی کہ ان دونوں حکومتوں کے دوستانہ تعلقات
اور بھی مستحکم ہو جائیں گے بلکہ اس لئے بھی قابل توجہ ہے کہ اس
ملاقات میں یہ بھی طے ہوا ہے کہ برطانیہ اور امریکہ ترکی کے دفاعی
انتظامات کی تکمیل میں پوری امداد کریں گے۔ (ادارہ)

"ہم اپنے فاضل اور محترم دوست خان محمد اسحاق خان ای۔اے۔سی۔ صوبہ سرحد کے ممنون ہیں جنہوں نے اپنے ایک دلچسپ خط میں آئن اسٹائن کے نظریہ اضافیت پر اپنے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اتنے مشکل مضمون کو اس آسانی اور خوش اسلوبی سے نبھانا موصوف ہی کا حصہ ہے۔ ہم موصوف کے خط کے چند اقتباسات نیچے درج کرتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ قارئین کرام عہد حاضر کے اس بلند پایہ مفکر آئن اسٹائن کے اس نئے خیال یعنی "نظریہ اضافیت" سے ضرور محظوظ ہوں گے"

(ادارہ)

آئن سٹائن سے ایک مرتبہ امریکہ کے ایک مشہور اخبار نویس نے اضافیت سمجھانے کے لئے کہا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اضافیت کا مفہوم سمجھنے کے لئے کم از کم تین دن درکار ہیں۔ اور پھر بھی میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی آپ سمجھ سکیں گے یا نہیں۔ جب آئن سٹائن جیسے دل و دماغ رکھنے والے کے لئے یہ مسئلہ سمجھانا اتنا مشکل ہے تو پھر میری بساط ہی کیا ہے۔ اس نظریہ کو خود سمجھنے کے لئے مجھے کئی سال درکار ہیں۔ پھر کہیں جا کر شاید اس قابل ہو سکوں کہ نن پردن کے پڑھنے والوں کو سمجھا سکوں۔ یہ امر آپ سے پوشیدہ نہیں کہ نن پردن کے پڑھنے والوں میں بیشتر حصہ اُن اصحاب کا ہے جو اب تک یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور ساکن ہے۔ کیونکہ اُن کے خیالات کے مطابق اگر یہ متحرک ہوتی تو اُن کا سر چکراتا۔ اگر چپٹی کی جگہ گول ہوتی تو وہ ضرور لڑھکتے رہتے۔ اُن کے نزدیک زمین بیل کے سینگ پر کھڑی ہے۔ جب اُس کا ایک سینگ تھک جاتا ہے تو دوسرے سینگ پر اُٹھا لیتا ہے۔ اور اسی وجہ سے زلزلے آتے ہیں۔ بیل مچھر پر اور مچھر پانی کی جھاگ پر ہے (مچھر جھاگ ہی میں تو پھنس سکتا ہے) جھاگ پانی کے اوپر تیرتا ہے، اور پانی زمین کے نیچے ہے۔ جیسا کہ کنوؤں میں نظر آتا ہے۔

خیر یہ تو ایک عالمانہ بحث ہے اور ہمارے ہموطن ابھی تک ولا الضّالین کے جھگڑوں سے فارغ نہیں ہوئے

ہیں۔ اُن کے نزدیک روزہ نہ رکھنے والا واجب القتل، لیکن قاتل قابل ملامت بھی نہیں۔ کیونکہ خدا اُسے خود اپنے کئے کی سزا دے گا۔ ایسی سرزمین میں اگر آئین سٹائن خود چل کر آئے اور یہاں کے علماء کے آگے اپنا نظریہ اضافیت پیش کرے تو ممکن نہیں کہ اُسے اپنی انتہائی کوششوں کے بعد بھی کامیابی حاصل ہو۔

آئن سٹائن کے نظریہ اضافیت کی پیچیدگیوں اور باریکیوں کو اگر سامنے رکھا جائے تو نیوٹن جیسا بلند مرتبہ سائنسدان موٹی عقل کا آدمی نظر آتا ہے۔ ہمارے ہموطنوں کے مروّجہ مذہبی خیالات کو اگر مدِّ نظر رکھا جائے تو نیوٹن بمقابلہ آئن سٹائن کے اسلام کے زیادہ قریب ہے۔ کیونکہ وہ اپنی عالمانہ تحقیقات کی بناء پر ساکن مطلق کا وجود تسلیم کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ بہت دور کسی ساکن ستارے یا اُس سے بھی کسی بلند مقام (عرش) پر ایسے وجود کا امکان ہے جو ساکن مطلق کہلایا جا سکے۔ لیکن آئن سٹائن نے جہاں نیوٹن کے دیگر نظریوں کو بالکل لغو اور باطل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہاں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ زمین یا دیگر اجرام فلکی میں جس کا ذکر نیوٹن نے کیا ہے، کوئی ایسا منطقہ نہیں جسے ساکن مطلق کہا جا سکے۔ اس خیال کی تصدیق ڈاکٹر اقبال کے اس شعر سے ہوتی ہے ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیّر کو ہے زمانے میں

خیر جملہ معترضہ کو جانے دیجئے۔ سائنسدانوں نے اس قسم کے اور بھی بہت سے نظریئے ایک دوسرے کی ضد میں وضع کئے ہیں۔ جن کا ذکر یہاں مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

یقین کیجئے کہ جب سے آپ نے مجھے آئن سٹائن کے اضافیت کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرنے کو فرمایا ہے اُس وقت سے میں اسی فکر میں ہوں کہ اس مشکل سے کیسے نجات حاصل کروں۔ یا پھر وہ ایسا کون طریقہ ہو سکتا ہے کہ اس دقیق اور ثقیل مسئلہ کو نن پرون کے پڑھنے والوں کے ذہن نشین کرا سکوں۔ آئن سٹائن کے مکان، زمان، خمیدگی مکان (Curvature of Space) ابعاد اربعہ مکانی، استمرار اور اس قسم کے دیگر اصطلاحات کو بھلا نن پرون کے پڑھنے والے کیونکر سمجھ سکیں گے۔ اصطلاحی اور علمی الفاظ سے قطع نظر، فرض کیجئے اگر آئن سٹائن نن پرون کے پڑھنے والے سے یہ کہہ بیٹھے کہ جس کھاٹ پر آپ بیٹھے ہیں وہ مطلق ساکن نہیں۔ اور خود آپ بھی ساکن نہیں۔ یعنی آپ کی کھاٹ اس لئے بظاہر ساکن نظر آتی ہے کہ وہ بمقابلہ زمین کے متحرک نہیں۔ زمین بھی سورج کے مقابلہ میں متحرک ہے۔ اور آپ کی کھاٹ زمین پر پڑی ہوئی ہے۔ اس لئے چلتی گاڑی میں بیٹھے ہوئے آدمی کی طرح آپ اگرچہ بظاہر ساکن نظر آتے ہیں لیکن حقیقتاً متحرک ہیں۔ اب اگر زمین اپنی حرکت کھو بیٹھے اور سورج کے گرد گھومنا بند کر دے تو بھی آپ مطلق ساکن نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ اُس صورت میں بھی زمین اور سورج

دیگر اجرام فلکی کے مقابلہ میں متحرک ہیں۔ اور اگر سورج کی حرکت بھی بند ہو جائے تو وہ بھی بمقابلہ دیگر ستاروں کے ساکن ہوگا۔ اور پھر یہ سب ستاروں کے دھندلے گچھے Nebulae کے مقابلہ میں متحرک ہوں گے ۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہ یقینی امر ہے کہ نئ پرون کے پڑھنے والے دوران بحث میں ہی بات کاٹ کر کہیں کہ ایسی باتیں دماغ کی خرابی پر دال ہیں۔ اور محض کج بحثی ہے ۔ سچ تو یہ ہے کہ جو کھڑا ہے اُسے کھڑا کہیں گے اور جو بیٹھا ہے اُسے بیٹھا بتائیں گے ۔ چلتے کو چلتا اور لیٹے ہوئے کو لیٹا ہوا ہی کہہ سکتے ہیں۔ ساکن کو کیسے متحرک کہا جا سکتا ہے" اب آپ ہی بتائیے کہ اُن کی اس مختصر سی دلیل کا کیا جواب ہو سکتا ہے ؟ اور اگر میں اس نظریۂ اضافیت کی مزید تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہوئے یہ کہوں کہ اس کافر کے نزدیک کائنات میں ہر چیز کی اضافی حیثیت ہے۔ اور کوئی چیز مطلق حیثیت نہیں رکھتی۔ تو قوم کے بزرگ مجھے فوراً دھر لیں گے۔ خواہ میں کتنا ہی یقین دلانے کی کوشش کروں کہ یہ سب آئن شٹائن کے خیالات ہیں۔ اور میرا ان سے کوئی تعلق نہیں۔

اس مشکل فلسفیانہ بحث سے قطع نظر اگر ہم آئن شٹائن کی اضافیت کو آگے رکھکر دنیا کے موجودہ رائج اخلاق پر غور کریں تو نیکی اور بدی بھی سراسر اضافی نظر آئے گی۔ مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ فلاں شخص بہت نیک ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ مطلق نیک یعنی برائی سے پاک ہے۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہوگا کہ اُس میں بُرائی کا عنصر بہ نسبت نیکی کے کم ہے۔ ہم کسی شخص کو اسوقت تک نیک نہیں کہہ سکتے۔ جب تک ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تصور نہ کریں کہ اُس میں بُرائی بھی موجود ہے ۔ اگر آپ یہ دلیل قابل توجہ نہیں سمجھتے تو ذرا تھوڑی دیر کے لئے ایسی دنیا کا تصور کیجئے جہاں نیکی ہی نیکی ہو۔ ایسی صورت میں جب کہ مقابلہ میں بدی موجود نہ ہو کیسے کسی شخص کو نیک کہا جا سکتا ہے ۔ یا ایک اور مثال لیجئے۔ ہم کسی چیز کو اس لئے سیاہ کہتے ہیں کہ اُس کے مقابلہ میں دوسرے رنگ موجود ہیں اور وہ چیز اُن کے مقابلہ میں سیاہ کہلاتی ہے ۔ لیکن اگر دنیا میں صرف ایک سیاہ رنگ ہو اور باقی رنگ موجود نہ ہوں تو پھر سیاہ رنگ کو کس طرح سیاہ مانا جا سکتا ہے۔ الغرض دنیا میں مطلق صفت کہیں موجود نہیں بلکہ دوسری صفتوں کے مقابلہ میں اُس کا وجود تصور کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کائنات میں بھی کوئی چیز مطلق خاصیت نہیں رکھتی۔ بلکہ ہر شئے اضافی خاصیت کی مالک ہے۔ مختصر یہ کہ آئن شٹائن کے نزدیک اس اضافی نظریے کا اطلاق ساری کائنات پر کیا جا سکتا ہے۔

دوراہا

گوپال متل

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر عیش کی بزم آراستہ ہے — اُدھر فرض کا پُر خطر راستہ ہے
اُدھر فاقہ مستوں کی آہ و بکا ہے — رباب مسرّت اِدھر نغمہ زا ہے
اُدھر سرفروشی، اِدھر دلنوازی — اِدھر کچھ حسیں اُس طرف چند غازی
اِدھر کامرانی کی دلکش اُمیدیں — اُدھر دل شکن، روح فرسا شکستیں
اِدھر کیف و مستی اُدھر تلخیٔ غم — اِدھر قہقہے، اُس طرف چشم پرنم
میں اے دل قدم کس طرف کو بڑھاؤں — میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

اِدھر ہے غلامی کا بے روح نغمہ — اُدھر جانفزا حرّیت کا ترانہ
اِدھر بے حسی سے ہر اک جبر سہنا — اُدھر دل میں جو کچھ ہو بیباک کہنا
اِدھر پائے دولت پہ سر کو جھکانا — اُدھر شہریاری سے پنجہ لڑانا
اِدھر خوار ہونا خود اپنی نظر میں — اُدھر نشۂ سرکشی کی ترنگیں
اِدھر مال و دولت اُدھر جنس ایماں — ہے اِن میں سے کیا تیری راحت کا ساماں
میں اے دل کسے اپنا مقصد بناؤں — میں یہ راہ پکڑوں کہ اُس سمت جاؤں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

غریبی کا اپنے کو خوگر بنا لوں — کہ فطرت کا اپنی گلا گھونٹ ڈالوں
سنبھالے رکھوں حق پرستی کا پرچم — کہ میں بھی کروں مال و دولت فراہم
اسے پاؤں پر لکشمی کے جھکا دوں — کہ سر اپنا راہِ وطن میں کٹا دوں
بغاوت کی تانیں اُڑاتا چلوں میں — کہ خواب آفریں گیت گانے لگوں میں
وہ بزم طرب سے ہوا پھر اشارہ — سر دار اُدھر وہ کسی نے پکارا
میں اے دل کسے بڑھ کے لبیک کہدوں — میں اس سمت جاؤں کہ وہ راہ پکڑوں

دوراہے پہ ہے کارواں زندگی کا

داستانِ نجات (۵)

کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

جب مارک اور ڈاکٹر بیرخانہ کے ہال کمرے میں داخل ہوئے تو بعض لوگ جو دروازہ کے پاس کی میزوں پر بیٹھے تھے ان کو دیکھ کر آداب بجالائے۔ ڈاکٹر نے تو بے خیالی سے جواب دے بھی دیا، مگر مارک نے کچھ اعتنا نہ کی۔ دونوں کچھ دیر ادھر ادھر دیکھا کئے کہ کہیں خالی میز مل جائے۔ مارک نے محسوس کیا کہ لوگ اسے مخالفانہ نگاہوں سے تک رہے ہیں آخر کار ایک کونے میں ایک خالی میز نظر آ گئی۔ دونوں وہاں جا بیٹھے۔

ڈاکٹر نے بیر منگوائی۔ اس اثنا میں اس نے اپنا پاپ جلایا، اور مارک نے اپنا سگرٹ۔ بیر آئی تو ڈاکٹر نے اپنا گلاس اٹھا کر کہا، آپ کا جام صحت! مارک نے جواب دیا آپ کا بھی!

ہال کمرے کے دوسرے سرے پر ایک شخص لگا الاپنے۔

مارک۔ بیر بھی ہے، گانا بھی ہے۔ بس ایک کسر ہے، عورتیں نہیں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر روبی کو ساتھ لے آئے ہوتے۔

ڈاکٹر۔ روبی اور اس بیرخانے میں آتی؟

مارک۔ آپ نے اسے یہاں آنے کو کبھی کہا بھی ہے؟

ڈاکٹر۔ نہیں۔

مارک۔ ذرا کہہ دیکھئے۔ اس کا بشرہ بتاتا ہے کہ اس کے دل میں آپ کے لئے ایک مادرانہ شفقت ہے۔

ڈاکٹر مارک کا چہرہ غور سے دیکھنے لگا۔ کسی وجہ سے

اسے بھلا لگتا تھا۔ پھر کہا۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔ عرصے سے اسے جانتا ہوں مجھ سے ہے بھی کئی برس بڑی۔ ہم ایک ہی جگہ کے رہنے والے ہیں اور ہمارے گھرانوں کا آپس میں ملنا جلنا رہا ہے۔ آپ بھی اسے دیر سے جانتے ہیں؟

مارک۔ نہیں۔ ایک مرتبہ امریکہ میں ملا تھا۔ یا اب یہاں ملا ہوں وہ بھی امریکی ہے میں بھی امریکی ہوں۔ یہ تعلق بہر ملاقات کافی ہے۔

ڈاکٹر۔ کیوں نہیں۔

مارک۔ میری مراد یہ تھی کہ ہم دونوں کی زبان ایک ہے۔ امریکی تو بہتیرے ہیں۔ مگر روبی ہمارے لئے مایۂ ناز ہے کیونکہ عجب شان دلبری رکھتی ہے۔

ڈاکٹر اپنے پائپ کو پھونک مارتا رہا۔ پھر سوچ کر کہا، دلبر تو نہیں، دلکش ضرور ہے۔ اتنی دُبلی عورت حسین کیونکر ہو سکتی ہے؟ وہ تو کمی خون کے عارضے میں مبتلا نظر آتی ہے بمبئی میں تو اسے حسین نہیں کہہ سکتا۔

مارک۔ آپ تو اسے طبّی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جناب، اس زندگی میں ہر چیز کو طبّی پہلو ہی سے نہ دیکھا کیجئے، ورنہ بہت خسارے میں رہیئے گا۔

ڈاکٹر۔ شاید۔

مارک۔ میں اپنا مطلب واضح کرنا چاہتا ہوں۔ مثلاً مجھی کو لیجئے۔ میں مصوّر ہوں۔ بہت سی عورتیں ایسی ہیں جنکی تصویر بہت اچھی بنتی ہے۔ یہ تو ضروری نہیں کہ میں محبت بھی ان ہی سے کروں۔ اسی طرح اگر آپ کا خیال ہو کہ آپ اسی عورت سے محبت کریں جس کا بدن اور دماغ کوئی نقص ہی نہ رکھتا ہو۔ تو ایسی عورتیں تو شاذ و نادر ہی مل پاتی ہیں۔

ڈاکٹر ذرا گھبرا کر مارک کو دیکھنے لگا۔ صاف نظر آتا تھا کہ مارک اسے روبی کا عاشق سمجھتا ہے۔

مارک۔ کیا میرا روبی کا ذکر چھیڑنا آپ کو ناگوار گذرا؟

ڈاکٹر۔ نہیں، ہرگز نہیں!

مارک۔ نہ جانے اس کا ذکر کیوں چھڑ گیا۔ مجھ سے تو اس سے زیادہ جان پہچان بھی نہیں۔ البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ میں نے اس میں بیحد لبھاؤ پایا۔ یہی میرا مطلب تھا۔

ڈاکٹر۔ میں خوب سمجھتا ہوں۔ میں اپنے آپ میں بھی اسکی طرف ایک کشش محسوس کرتا ہوں۔ گو اتنے عرصے سے اسے جانتا ہوں۔ اب تو کبھی کبھار ملاقات ہو پاتی ہے۔ وہ بھی جب اسے جگر کا عرق دینا ہوتا ہے۔ وہ موقع دل لگی کے لئے تو موزوں ہوتا نہیں۔

مارک لگا کھلکھلا کے ہنسنے۔ پہلے تو ڈاکٹر کو ذرا تعجب ہوا پھر خود بھی ہنسنے لگا۔

ڈاکٹر۔ اگر یہ باتیں روبی کے سامنے ہوئی ہوتیں تو وہ بہت لطف اُٹھاتی۔

مارک۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔ اب کم از کم اسی کا جام صحت پینا چاہیئے۔

دونوں نے گلاس اُٹھائے اور خالی کر ڈالے۔

ڈاکٹر نے ملازمہ کو بُلایا۔

مارک۔ اب میری باری ہے۔

ڈاکٹر۔ نہیں نہیں، اپنے ملک میں میں ہی پلاؤں گا۔

ڈاکٹر نے دو گلاس اور منگوائے۔ ملازمہ نے انھیں گھورا اور اکل کھرے پن سے چلدی۔

ڈاکٹر۔ مجھے اپنی وردی پہننی چاہیے تھی۔

مارک۔ اچھا، تو آپ بھی وردی پہنتے ہیں؟

ڈاکٹر۔ یہاں تو عام ہے۔ بلکہ وردی بنا آدمی اس مرغ کی طرح لگتا ہے جس کے دُم کے پر جھڑ گئے ہوں۔ لیکن میری وردی مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔

مارک۔ فوجی وردی؟

ڈاکٹر۔ نہیں نہیں۔

بیرا آئی تو ڈاکٹر نے پوچھا "آپ امریکہ کب لوٹ رہے ہیں؟

مارک۔ کیا جانے کب جاپاؤں۔

ڈاکٹر۔ کاش میں آپ کے ساتھ جا سکتا۔ امریکہ دیکھنے کو جی بہت پھڑپھڑا رہا ہے۔ کئی کشش ہیں ان میں سے بعض میرے پیشہ سے متعلق ہیں۔ وہاں کی حسین لڑکیاں بھی، مگر زیادہ تر میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آزادی کسے کہتے ہیں؟ (ادھر اُدھر دیکھکر) باتیں کرنے کے لئے یہ جگہ چنداں موزوں نہیں۔ اور مجھے آپ سے باتیں کرنا ہیں بہت۔

مارک نے یہ دیکھکر کہ آس پاس کے لوگ انھیں دیکھ رہے ہیں اور ان کی طرف کان لگائے ہوئے ہیں کچھ گھبرا گیا۔

ڈاکٹر نے ملازمہ کو بُلا کر بل ادا کر دیا۔ وہ چلی گئی تو ڈاکٹر نے کہا، میں آپ سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ بدقسمتی سے میرا پیشہ بہت کڑا اور گندہ ہے۔ مجھے بہت تڑکے اُٹھنا پڑتا ہے۔ اس لئے جلد سو جاتا ہوں۔ میں نے اپنے رہنے کے لئے چند کمرے لے رکھے ہیں۔ کل رات میرے یہاں کھانا کھانے آکر مجھے ممنون کر سکتے ہیں؟

مارک۔ میں خود بھی بہت چاہتا ہوں کہ آپ سے ملوں۔

ڈاکٹر۔ میں دل کھول کر باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، یہ آزادی یہاں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ میں بحث مباحثہ کو پسند کرتا ہوں۔ اچھا تو کل رات باتیں ہوں گی میں اپنا پتہ آپ کو لکھے دیتا ہوں۔

ڈاکٹر نے اپنی جیب سے خط لکھنے کا چھوٹا سا پیڈ نکالا اور ایک پنسل۔ ان کو میز پر رکھکر دم بھر دیکھا۔ اس کا چہرہ کھنچ گیا۔ کاغذ پر اپنا نام اور پتہ لکھکر مارک کو دیدیا، اور کہا "اب چلیں" جیا تا اُٹھانے ہی کو تھا کہ یک بیک مسکرا کر کہا "سچ میں تو آپ کا نام تک نہیں جانتا۔ روبی نے آپ کا نام لیا تو تھا مگر بہت دھیرے سے۔ اس وقت وہ ذرا گھبرائی ہوئی تھی۔

مارک۔ میرا نام مارک پرینگ ہے۔

ڈاکٹر۔ "مارک پرینگ"!

اب تو اس کی سب مُسکراہٹ جاتی رہی اور چہرے سے اضطراب ٹپکنے لگا۔ آخر کار کہا۔ "عجیب بات ہے"

مارک۔ کیوں؟

ڈاکٹر نے "مارک پرینگ" پھر آہستہ سے دُہرایا۔

مارک۔ بات کیا ہے؟

ڈاکٹر۔ آپ ایمی ریٹر کے بیٹے ہیں؟

مارک۔ جی ہاں!

خط دے کر مارک سے کہا: لیجئے، یہ آپ ہی کیلئے ہے۔

مارک نے لے کر دیکھا تو اس کا نام اسکی ماں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ ہکا بکا ہوگیا۔ پھر کھول کر پڑھا۔

خط کیا تھا الوداع تھی۔ دوبارہ پڑھا تب سمجھا کہ بس ماں اب رخصت ہونے کو ہے، اور یہ اس کا آخری پیام ہے۔ اپنی کہنیاں میز پر رکھکر اپنا سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اگر کہیں اکیلا ہوتا تو دھڑام سے گر پڑتا۔ ہال کمرہ لوگوں سے اٹا تھا۔ اور پاس ڈاکٹر کھڑا تھا۔ ضبط کیا۔ سنبھلا۔ اسے یاد آیا کہ سبھی کہتے رہے کہ موت سے کم سزا نہ ہوگی۔ قرائن بھی یہی بتلا رہے تھے۔ پہلے ایک چھٹی آئی۔ پھر خموشی۔ ہیننگ، کنسز اور روبی نے بھی یہی کہا۔ فریٹنر کے رویے سے یہی ترشح ہوتا تھا۔ مگر اسے یقین نہ آتا تھا۔ ڈاکٹر کو دیکھا ہاتھ جیبوں میں دئے میز کی طرف ٹکٹکی لگائے، کرسی پر سمٹا بیٹھا ہے۔ آس پاس کے لوگ اب بھی اسکی طرف متوجہ تھے۔

مارک۔ یہ خط خود اس نے آپ کو دیا تھا؟

ڈاکٹر۔ ہاں۔ **مارک۔** کب؟

ڈاکٹر۔ کل۔ **مارک۔** ابھی زندہ ہے؟

ڈاکٹر۔ ہاں۔

مارک نے سگرٹ نکالا اور ذرا تیزی سے سلگایا۔

ڈاکٹر سے پوچھا: آپ کون ہیں؟

ڈاکٹر۔ میں ڈاکٹر ہوں۔ درحقیقت تو میں محکمۂ حفظان صحت میں ملازم ہوں۔ آجکل جیل بھرے پڑے ہیں۔ ڈاکٹروں کی مانگ ہے تین مہینے سے میں ایک سیاسی جیل میں مامور ہوں۔ میں آپکی والدہ سے ایک ایسے جیل میں ملا تھا جہاں پر سول اور سیاسی غرض ہر قسم کے بدترین مجرم جنہیں پھانسی کی سزا دی گئی ہے رکھے جاتے ہیں۔

مارک۔ تو میری ماں اب بھی وہیں ہے؟

ڈاکٹر۔ نہیں، آجکل شہر کے باہر قیدیوں کے ایک عارضی جیل میں ہے۔

مارک۔ وہاں کیوں؟

ڈاکٹر۔ بیمار ہوگئی تھی۔ میری تشخیص کے مطابق اسے "اپنڈیسائٹس" کا عارضہ تھا۔ میں اس کا اپریشن کرنا چاہتا تھا، اور میں نے اپنے بھائی کی مدد سے جو با اثر شخص ہے، اجازت حاصل کرلی تھی۔ میں دراصل سرجن ہوں۔ مگر آجکل گذران مشکل ہے۔ جو کام ملا میں نے قبول کرلیا۔

مارک۔ تو آپ نے آپریشن کر ڈالا؟

ڈاکٹر۔ ہاں، میں نے ہی اسے موجودہ جیل میں پہنچایا کیونکہ وہاں آپریشن کے لئے زیادہ سہولتیں میسر ہیں۔ دوسرے جیلوں کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ وہاں رہتی تو کب کی چل بسی ہوتی۔ اسے ہسپتال میں رکھنے کی اجازت نہیں ملی۔ اب وہ ایک عورت کے ساتھ جسے دق کا عارضہ ہے ایک کمرہ میں رہتی ہے۔ اس کا بستر صاف ستھرا ہے اور علاج خاصہ اچھا ہو رہا ہے۔

مارک۔ کیا اب بالکل اچھی ہوگئی ہے؟

ڈاکٹر۔ کل ذرا پیدل چلی تھی۔

مارک۔ اب میعاد کتنی رہ گئی ہے؟

ڈاکٹر۔ کچھ زیادہ نہیں۔ **مارک۔** پھر بھی کتنی؟

ڈاکٹر چپ ہوگیا۔

مارک۔ بتائیے، ضرور بتائیے۔

ڈاکٹر۔ بدھ وار کی صبح تک۔

مارک۔ بدھوار؟ آج اتوار ہے۔

جھٹ جیب سے گھڑی نکالی۔ رات کے سوا بارہ تھے۔ اتوار تو گیا۔ اب تو پیر ہے۔

مارک۔ میں کچھ کر سکتا ہوں؟

ڈاکٹر۔ آپ کے بس کی بات نہیں رہی۔ اگر کوئی راستہ نکلا تو میں آپ کو اطلاع دیدوں گا۔

مارک۔ تو آپ کو اطمینان ہے کہ اسوقت کچھ نہیں ہو سکتا۔

ڈاکٹر۔ ہاں مجھے یقین ہے (پھر دھیرے سے) میرے بس میں ہو تو میں خود اسے بچانا چاہتا ہوں۔ مگر اُن ہونی بات ہے۔

مارک۔ روپے سے شاید کام بن سکے۔

ڈاکٹر۔ ناممکن۔ مارک۔ کچھ تو ہونا چاہئے۔

ڈاکٹر۔ سب لاحاصل ہے اُمید دل سے نکال دیجئے کہ قید خانے سے بھاگ سکتی ہے۔

مارک۔ لوگ بھاگ ہی نکلتے ہیں۔ ڈاکٹر۔ یہاں سے نہیں۔

مارک۔ اسوقت تو اسی جیل میں ہے۔

ڈاکٹر۔ ہاں، پر وہ بہت بیمار رہی ہے۔ اب ذرا چلنے پھرنے لگی ہے۔ وہاں سے نکلنا محال ہے۔ آپ اپنے دماغ کو مفت میں پریشان نہ کیجئے۔

مارک۔ آپ نے کہا ہے کہ آپ اسے بچانا چاہتے ہیں۔ اس کی وجہ بتا سکتے ہیں آپ؟

ڈاکٹر (آہستہ سے) یہ بتانا مشکل ہے اور آپ سے مل کر تو اور بھی مشکل ہو گیا ہے۔

مارک۔ نہیں ضرور بتائیے۔

ڈاکٹر۔ تو سنئے۔ میں آپ کو شل اپنے پاتا ہوں۔ آپ کو دیکھتا ہوں تو وہ یاد آجاتی ہے۔ اس کا خیال آتا ہے تو آپ یاد آجاتے ہیں۔ آپ کا یہاں آنا ہی بتاتا ہے کہ آپ دونوں ایکدوسرے کو کتنا چاہتے ہیں۔

مارک۔ تو اسکی جان خلاصی کیلئے ایسا کام بتائیے جو میں کر سکتا ہوں۔ کتنا ہی کڑا اور جوکھم کا ہو۔ میں تو جان پر کھیلنے کو تیار ہوں۔

ڈاکٹر۔ آپ کچھ نہیں کر سکتے۔

مارک۔ لعنت ہو آپ پر اور آپ کے ملک پر۔

ڈاکٹر۔ ذرا ٹھہرئیے۔ بہرحال یہ تو بہتر ہے کہ وہ میری تحویل میں رہے۔

مارک۔ ہاں۔ میں اس وجہ سے بھی خوش ہوں کہ آپ اس کی مشکل آسان کر سکتے ہیں۔ کیا آپ اسے بتائیے گا کہ ہم مل چکے ہیں؟

ڈاکٹر۔ اگر آپ کو اصرار ہو۔

مارک۔ کیا بتاؤں؟ میرے یہاں آنے کا اسے علم ہو جائے تو وہ میری وجہ سے اور بھی پریشان ہو جائیگی۔ بہتر ہے اسے پتہ ہی نہ چلے۔ تاہم میں کچھ اسے لکھنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میرا خط پہنچا سکتے ہیں؟

ڈاکٹر۔ ضرور، کل رات تو میرے یہاں آئے گا

مارک۔ کیا بتاؤں۔ نہ جانے کل رات تک زندہ بھی رہوں۔

دونوں نے ایکدوسرے کو غور سے دیکھا۔

ڈاکٹر۔ ایک گلاس اور لیجئے۔

مارک۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر۔ تو چلیں۔

دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ڈاکٹر نے اپنا چاتا اُٹھایا۔ دروازہ پر پہنچکر دیکھا کہ ابھی مینہ برس رہا ہے۔

ڈاکٹر۔ آپ اپنے ہوٹل کا راستہ تو جانتے ہیں۔ مارک۔ ہاں۔

ڈاکٹر۔ اچھا تو کل ملیں گے۔ (دونوں نے اپنی اپنی راہ لی)

(م-ی-د)

آجکل

پندرہ روزہ

قیمت فی پرچہ — دو آنے

چندہ سالانہ — تین روپے

پشتو رسالہ "نن پرون" کا اردو ایڈیشن

سال (۲) | ۴ مارچ سنہ ۱۹۴۳ء | ۲۶ صفر المظفر سنہ ۱۳۶۲ھ | نمبر ۲۰

فہرست

خط و کتابت ذیل کے پتہ پر ہونی چاہیئے

طارق کی دعا

اندلس کا میدانِ جنگ

علامہ اقبالؒ

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے — جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
دو عالم سے کرتی ہے بیگانہ دل کو — عجب چیز ہے لذّتِ آشنائی
شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن — نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

خیاباں میں ہے منتظر لالہ کب سے
قبا چاہیے اس کو خونِ عرب سے

کیا تو نے صحرا نشینوں کو یکتا — خبر میں، نظر میں، اذانِ سحر میں
طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو — وہ سوز اس نے پایا انھیں کے جگر میں
کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے — وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

کونسا نظام پائیدار ہے؟

ابتدائے آفرینش سے اب تک یہ دنیا جنگ و فساد کا اکھاڑہ رہی ہے۔ انسان ہمیشہ انسان کا دشمن اور اُس کے لہو کا پیاسا رہا ہے۔ تاریخ کا ہر ورق ان خونی واقعات کا شاہد ہے۔ فرشتوں کے اُس خیال کی تصدیق جو انھوں نے خداوند کریم کے فرمان کے جواب میں ظاہر کیا تھا، بارہا ہو چکی ہے۔ بس اگر دنیا میں آج خون کی ندیاں بہ رہی ہیں تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ دنیا کی تاریخ میں شاید ہی کوئی زمانہ گذرا ہو، جب اشرف المخلوقات کا دعویٰ رکھنے والی مخلوق نے ایسے ہلاکت آفریں آلاتِ جنگ کا استعمال کیا ہو اور ساتھ ہی ساتھ علوم و فنون کے میدان میں بھی اس قدر ترقی کی ہو کہ زمین، ہوا، پانی، سورج، چاند، ستارے، غرض کائنات کی کوئی چیز بھی تحقیق و تجسس سے نہ بچی ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی کبھی نہیں ہوا کہ دنیا کے تمام لوگ آجکل کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گئے ہوں اور اپنا سب کچھ ایسی عالمگیر جنگ میں جھونک دیا ہو۔ ان وجوہات کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگرچہ دنیا کی تاریخ اس قسم کی لڑائیوں اور فسادوں سے اٹی پڑی ہے لیکن موجودہ جنگ جس وسیع اور بڑے پیمانہ پر ہو رہی ہے، شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔

موجودہ جنگ سے نہ صرف وہ لوگ جو لڑائی میں شامل ہیں متاثر ہیں بلکہ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا گوشہ رہ گیا ہو جو جنگ کے اثرات سے محفوظ ہو۔ ہر شخص حیران و پریشان ہے کہ آخر اس تباہی کا انجام کیا ہوگا، اور جنگ کے بعد یہ تباہ حال و برباد دنیا کیسے ازسرِ نو آباد ہوگی، اور آئندہ اس قسم کی تباہ کاریوں کا کامل طور پر کس طرح سدباب ہو سکتا ہے؟

کچھ دنوں سے چونکہ لڑائی نے ایک نیا رُخ اختیار کیا ہے اس لئے دنیا کی ازسرِ نو تعمیر کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو رہی ہے۔ اس سلسلہ میں جنگ کے اسباب پر بھی بحث ہو رہی ہے اور فریقین میں سے ہر ایک کو موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ آخر لڑائی کی ابتدا کہیں سے تو ہوئی، لیکن ایسے مہلک اور خونریز سانحات کے اسباب کا اگر علم بھی ہو جائے تو انسان کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی، اس کے اسباب و علل کا مطالعہ انتہائی غور و

غوض اور ٹھنڈے دل کے ساتھ ہونا چاہئے۔

دنیا کے موجودہ واقعات کے متعلق مبصرین مختلف آراء اور نظریے رکھتے ہیں، بلکہ اس ضمن میں بہت کچھ کہا بھی جاچکا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس حادثۂ عظیم کے ختم ہونے پر دنیا کی حالت بہت کچھ بدل جائے گی۔ لیکن آیندہ بھی جو تعمیر ہوگی وہ بھی اُنھیں اصولوں پر مبنی ہوگی جو ابتدائے تاریخ سے ابتک ہر لڑائی کے بعد وضع ہوتے رہے ہیں، اُس کے وجوہات بھی کم و بیش اسی نوعیت کے ہوں گے جو پہلے تھے۔ البتہ اُن کی صورت اور اُن کا اطلاق مختلف زمانوں میں مختلف رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ذاتِ باری تعالیٰ کی تخلیق کی منشا اور بنی نوع انسان اور کائنات کے ارتقا کی تکمیل کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہی ہے۔ اس میں بعض اوقات ایسے واقعات بھی ظہور پذیر ہوتے ہیں جو فوری انقلاب کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہ انقلاب کبھی کبھی روحانی، اخلاق اور مذہبی بھی ہوتا ہے، لیکن زیادہ تر اس کی نوعیت سیاسی ہی ہوتی ہے۔ بعض اوقات یہ علمی، اقتصادی اور صنعتی شکل بھی اختیار کرلیتا ہے، لیکن عام طور پر ایسے انقلابات مذہبی اور سیاسی اثرات اور واقعات کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ مذہبی اور روحانی ارتقاء کا راستہ رفتہ رفتہ بلند حوصلگی اور استقلال کے ساتھ طے ہوتا ہے۔ اس میں بہت سے نشیب و فراز دیکھنے پڑتے ہیں، لیکن کامیابی ایسے ہی افراد کو نصیب ہوتی ہے جنھیں قدرت نے خاص اسی کام کے لئے منتخب کیا ہو۔ اس لئے مذہبی عمارت محنت و مشقت سے ایسی مستحکم بنیادوں پر کھڑی کی جاتی ہے کہ بڑے سے بڑا زلزلہ بھی اسے جگہ سے نہیں ہلا سکتا۔ مذہب کی بنیاد کا استحکام اسی تدریجی ارتقاء پر منحصر ہے۔ مثلاً خدائے پاک کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ رسول کریم کو خاتم النبیینؐ کی حیثیت سے دنیا میں شروع ہی سے بھیج دیتا اور ساتھ ہی قرآن کریم جیسی مکمل کتاب بھی نازل کردیتا، لیکن انسان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ارتقاء تدریجی ہو۔ چنانچہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے ذریعہ یہ فطری دین یعنی اسلام مختلف صورتوں میں اُترا اور پھیلا، اور تکمیل ہوتے ہوتے آخرکار قرآن کریم کی تعلیمات کی شکل میں نازل ہوا، اور ساتھ ہی اشاعت کے لئے رسول کریم رحمۃ للعالمین مبعوث ہوئے۔

مذہب کی تکمیل کا مسئلہ اس قدر مسلّم ہے کہ اس پر زیادہ بحث کرنا بیکار ہوگا۔ البتہ سیاسیات اور اخلاقیات میں بہت کچھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ اس لئے یہاں اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈالنا نامناسب نہ ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ دنیا کے مسلک میں آنے والی تبدیلی کی کیا شکل و صورت ہوگی۔ آیا ان قدیم بنیادوں پر نئی عمارت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے؟ بنی نوع انسان کے تجربہ میں یہ بات کئی بار آچکی ہے۔ یعنی دنیا کی تاریخ میں سیاسی، تمدنی اور اخلاقی نظریئے ظہور میں آئے، پروان چڑھے اور پھر دھم سے گر پڑے مثلاً اگر ایک طرف یونان، عرب، امریکہ اور برطانیہ کے مسلکوں پر ہماری نظر پڑتی ہے تو دوسری طرف تحریک احیاء علوم، صنعتی انقلاب اور انقلاب روس کا بھی وجود ہے۔ کل کی بات ہے کہ روس، ترکی چین، جرمنی، اٹلی اور ہسپانیہ کو انقلابی دور سے گذرنا پڑا۔ دنیا نے ان انقلابات سے جو تجربہ حاصل کیا وہ آج موجودہ جنگ کی شکل میں نظر آرہا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ایک اور تجربہ چل رہا ہے جو ایک بین الاقوامی مسلک کی تبدیلی کا متقاضی ہے، جیسے مجلس بین الاقوام جرمنی کا نیا نظام، جاپانیوں کا مشترکہ ایشیائی مفاد وغیرہ — جمہوریت تو ایک پُرانا مسلک ہے۔ الغرض دنیا میں ان تین نظریوں کے درمیان زبردست کشمکش جاری ہے، اگر ان پر غور کیا جائے تو تینوں کا مقصد یہی ہے کہ دنیا کا نظام بہتر ہو، اسکی تعمیر پھر سے ہو، اور زندگی کا نیا نظریہ پیدا کیا جائے تاکہ جہالت اور بھوک دور ہو اور مساوات، اخوت اور امن کا دور دورہ ہو۔

ہر شخص زندگی کا صحیح لطف اُٹھا سکے۔ ہر فرد، قبیلہ اور قوم کو وہ کچھ میسّر ہو جو انھیں اسوقت حاصل نہیں۔

کچھ دنوں سے ان تینوں نظریوں میں انقلابی نظریئے کو بہت شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ایک طرف ایک جماعت اس نظام میں طاقت کے بل بوتے پر فوری تبدیلی کی خواہاں ہے، اور اپنی فوجی طاقت سے دنیا میں ایک تہلکہ مچا رکھا ہے، جیسے جرمنی اور اٹلی۔ دوسری طرف وہ جماعت ہے جو پر امن رویّہ اور جمہوریت کی حامی ہے۔ پہلی جماعت کا مسلک طاقت، تیزی اور وحشت کے جذبوں سے ملو ہے، دوسری جماعت کا کام تعمیری اور طریقۂ کار بھی تیز ہے، لوگ زیادہ تر زور سے کام نکالنے کے حامی رہے ہیں اور اُن کا یہ خیال رہا ہے کہ جمہوری طریقہ بہت سُست رفتار اور ڈھیلا ہے۔ صحیح طریقہ تو ہٹلری چال ہے کہ مہینوں کا کام منٹوں میں ختم ہو۔ اس میں شک نہیں کہ جمہوری طریقۂ کار کی سُست رفتاری کی وجہ سے جمہوری ممالک میں بھی بعض لوگ انقلابی مسلک کو پسند کرنے لگے۔ چنانچہ ہٹلر اور مسولینی کو اپنی تعریف و توصیف سُن کر یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید نازیت جمہوریت پر غالب آجائے۔ انھوں نے جمہوریت کو فنا کرنے کی ٹھانی، اور فسطائیت اور نازی اصولوں کی تیز رفتاری اور نازیوں کے پروپیگنڈے سے لوگ ڈرنے لگے کہ جمہوریت کا خاتمہ شاید دنوں کی بات ہے، لیکن آج تین سال کی لڑائی کے بعد وہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اُن کا خوف غلط فہمی پر مبنی تھا۔ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ ایک انسان اپنی چالاکی اور عیاری سے طاقت پیدا کر کے بڑی بڑی طاقتوں کو کچل دیتا ہے، یا جوئے میں آناً فاناً لاکھوں پیدا کر لیتا ہے۔ لیکن یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کام وہی پائیدار ہے جو تدریجی مراحل طے کر چکا ہو، خواہ اُس کا تعلق کسی شخص سے ہو یا قوم و حکومت سے۔ ہر کام کی تکمیل کے لئے بہت محنت و استقلال کی ضرورت ہے۔ چوری یا جوئے سے مالدار ہونا آسان ہے لیکن یہ مالداری پائیدار نہیں۔ اس کے برعکس منظّم تجارتی کاروبار میں شاید ہی کوئی آناً فاناً امیر کبیر ہو گیا ہو۔ لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا ہے اور اُسے تجربات حاصل ہوتے ہیں، اُس کی تجارت اُسی قدر مستحکم بنیادوں پر قائم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ صدیوں کاروبار چلتا رہتا ہے اور حادثات زمانہ کی دستبرد سے محفوظ رہتا ہے۔ جمہوریت، اور فسطائیت کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہٹلر نے تھوڑی ہی مدت میں بہت کچھ حاصل کر لیا تھا، لیکن پھر جمہوریت کی مشین بھی حرکت میں آئی اور اب اُس کا ہر پُرزہ متحرک ہے۔ اُس کی پوشیدہ اور محفوظ طاقتیں اُبھر آئی ہیں۔ اگر یہ مشین اپنی پوری رفتار سے ایک دفعہ چل پڑی تو سب کچھ روندتی نکل جائے گی۔ نازیت اور فسطائیت کی طاقت اور ظلم و جبر کی پالیسی پر پشتو کی یہ ضرب المثل

"دنیا رولنڈہ بادشاھی تیرہ بہ شی نہ"

پوری طرح صادق آتی ہے۔ بس دنیا میں صرف وہی نظام قائم رہ سکے گا جو فطری اور تدریجی ہے اور وہ نظام جمہوری ہے۔

(ادارہ)

رُباعی

ہر آن جفا سے قلب ڈر جاتا ہے
ہر بات پہ آسماں بپھر جاتا ہے
کرتا ہوں اُسے مالِ غنیمت میں شمار
جو لمحہ فراغت سے گذر جاتا ہے

رفتارِ زمانہ

مسٹر چرچل کا جنگ پر تبصرہ :-

مسٹر چرچل کی تقریر کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اتحادی اقوام کی حکمت عملی میں اب نمایاں تبدیلی ہو چلی ہے۔ کیسا بلینکا کی کانفرنس کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ یہ امر کہ ہم نے اپنے لائحۂ عمل کے بارے میں جو عملی قسم کے فیصلے کئے اُس پر سب متفق تھے اتحادیوں کے باہمی اعتماد کا بیّن ثبوت ہے۔ اُن کے الفاظ میں اب اس کے سوا اور کچھ باقی نہیں رہا کہ تفصیلی طور پر ایک نقشہ بنایا جائے اور پھر اس کی تفصیلات کو یکے بعد دیگرے عملی جامہ پہنایا جائے"۔

مسٹر چرچل نے غیر مشتبہ الفاظ میں یہ بھی واضح کر دیا کہ "اتحادی اقوام حتی الوسع روس کی اس ہولناک اور شاندار جدوجہد میں مدد کریں گی"۔ انھوں نے اس بات پر خاص طور سے زور دیا کہ اتحادی قوموں کا فرضِ اوّلین جو پہلے تھا، وہی اب ہے، یعنی روس کی ہر ممکن امداد۔

روس :-

پچھلے پندرہ دنوں میں روسی محاذ پر سُرخ فوجیں بلا کی تیزی کے ساتھ آگے بڑھیں۔ اس لڑائی کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ۱۹۴۳ء کے شروع سے روسیوں نے اُس سے کہیں زیادہ علاقہ جرمنوں سے دوبارہ واپس لیا ہے جتنا کہ جرمنوں نے ۱۹۴۲ء میں فتح کیا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ جرمنوں نے اپنی ۱۹۴۲ء کی مہم کے دوران میں یہ کہنا شروع کیا تھا کہ ملکی فتوحات روسی فوجوں کی تباہی سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ روسیوں نے روستوف، خارخوف اور کرسک جیسے اہم فوجی مرکزوں کو جرمنوں سے دوبارہ چھین لیا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ جرمنوں کے اُن خطوطِ مقاومت میں جن کا برلین ریڈیو اس کثرت سے ذکر کرتا تھا، اس حد تک تبدیلی واقع ہوگی کہ جرمن فوجی کمان کے سارے نقشے درہم و برہم ہو جائیں گے۔ جرمنوں کا پیچھے ہٹنا خود اُن کے فیصلہ کا نتیجہ نہیں تھا۔ انھیں اتنا بھی موقع نہیں ملا کہ وہ تیزی سے حسب دلخواہ فوجوں کو ادھر اُدھر حرکت دیتے، یا رسد و جنگ کے سامان ہی واپس لے آتے۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کُلی طور پر پیچھے ہٹنے میں ہچکچا رہے تھے، اور محض اپنی عزت کو برقرار رکھنے کے لئے انھوں نے سیکڑوں کیا ہزاروں جرمنوں کو قربان کر ڈالا۔ جرمن پروپیگنڈا کرنے والے اب اس شکست کو جو انھیں روس کی اعلیٰ درجہ کے ہتھیاروں سے مسلح فوجوں کے ہاتھوں نصیب ہوئی ہے، لاتعداد جرمنوں کی بے سود موتوں کا ڈرامائی انداز میں ذکر کر کے بہلاتے ہیں۔

جرمنی :-

جرمنی کی شکستوں سے جو بیدلی اور بے اعتمادی پیدا ہوئی

ہے وہ صرف اُن سپاہیوں ہی تک محدود نہیں جو روسی محاذ پر لڑ رہے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ خود جرمنی میں عوام کو ۴۲-۱۹۴۱ء کی پسپائی کے باوجود ایک حد تک کامیابی کا یقین تھا، لیکن وہ بھی اب گھبرائے ہوئے ہیں۔ یہ گھبراہٹ جنگی محاذ کی بُری خبروں پر اس قدر مبنی نہیں جتنی کہ اُن متضاد اطلاعات پر جو کہ سرکاری طور پر دی جاتی ہیں۔ جرمنوں کو یہ علم ہے کہ روسی تیل (جو ایک زمانہ میں بہت ممکن تھا کہ انھیں مل جاتا) ان کے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، مزید براں انھیں لڑنے کے لئے آدمیوں کی بھی سخت ضرورت ہے۔ وہ اب نئے نئے سپاہیوں اور نئے نئے کاریگروں کو بھرتی کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوج کے لئے عمر کی حدود میں توسیع کر دی ہے۔ بڈھوں اور لڑکوں کو جبری طور پر بھرتی کیا جا رہا ہے۔

شمالی افریقہ :-

یہاں اس دوران میں جہاں تک لڑائی کا تعلق ہے کافی دلچسپی رہی۔ افریقہ کے شمال میں ٹیونیسیا کی خلیج سے جرمن اکّا دُکّا ناکامیاب قسم کے حملے کرتے رہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن آٹھویں لشکر کے حملے سے قبل اپنی ناگفتہ بہ حالت کو درست کرنے کے سلسلہ میں پوری پوری کوشش ضروری سمجھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ جرمنوں کو افریقہ کے برِّ اعظم سے نکالنے میں کچھ عرصہ لگ جائے لیکن اتنا تو یقینی ہے کہ وہ نکالے ضرور جائیں گے۔ اتحادیوں کو شاید کافی جانوں کا نقصان اُٹھانا پڑے، لیکن یہ امر اُن کے اس ارادہ میں کہ جرمنی اور اٹلی پر مستقل دباؤ پڑتا رہے، حائل نہ ہوگا۔

جاپان :—

جب سے جاپان لڑائی میں کودا ہے —— ایسی لڑائی جسمیں اُسکے جرم میں شریک ساتھیوں کی فوجی چالوں اور نقشوں کو اُلٹ دیا گیا۔ اُسے ایک ایسے دشمن سے مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے جسے برابر کمک پہنچ رہی ہے اور جس کی طاقت میں آئے دن اضافہ ہو رہا ہے۔ جاپانیوں نے پہلی دفعہ جنوبی بحر الکاہل میں دو محاذوں پر اپنی فیصلہ کن شکست کا اعتراف کیا ہے۔ کچھ دن ہوئے جاپانی فوجی کمان نے یہ اعلان کیا کہ جاپانی فوجوں نے پاپوا اور گوڈال کنار کو بالکل خالی کر دیا ہے۔ جاپانی عوام کو اس خبر سے جو خود اُن کے لیڈروں کی زبانی اُنھیں معلوم ہوئی، سخت صدمہ پہنچا ہے۔ لیکن یہ خبر بالکل صداقت پر مبنی نہیں۔ جاپانیوں کو بڑی سخت شکست ہوئی، اور وہ اُن مذکورہ علاقوں کو خالی نہ کر سکے۔ اُنھیں مکمل طور پر برباد کر دیا گیا۔ آخری جاپانی جو زندہ بچا تھا وہ بھی فاتح اتحادی فوجوں کے ہاتھوں مارا گیا۔

افغانستان :-

پشتو اکاڈمی کابل کے شعبۂ صحافت کے مدیر خان گل پاچا خان کی نئی تصنیف "لغوی خیرنہ" چھپکر شائع ہو گئی ہے۔ مصنّف موصوف نے جو اکاڈمی کابل کے شعبۂ صحافت کے مدیر ہیں، پشتو زبان کے بارے میں نہایت کاوش اور تدقیق سے وسیع معلومات بہم پہنچا کر اس کتاب میں درج کی ہیں۔ چنانچہ مصنّف موصوف کو اس جلیل القدر ادبی خدمت کے صلہ میں محکمۂ مطبوعات کی ایک خاص کمیٹی کی سفارش پر اعلیٰ ترین انعام موسوم بہ "جائزۂ خوشحال خاں خٹک" عطا کیا گیا ہے۔

"لغوی خیرنہ" کی چھپائی دیدہ زیب ہے، اور اسکی قیمت محض ۳ افغانی ہے۔ ہم مصنّف موصوف اور مطبع عمومی کابل کی خدمتیں دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ پشتو زبان کے جاننے والے اس قابل قدر کتاب کا مطالعہ کریں۔

جگر ہمارے موجودہ غزل گو شعرا میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں جتنی ہر دلعزیزی جگر کو نصیب ہوئی ہے، شاید ہی کسی اور شاعر کو نصیب ہوئی ہو اس کے یہ معنی نہیں کہ جگر سے بہتر غزل کہنے والے شاعروں کی ہمارے یہاں کمی ہے۔ اصل میں جگر کی ہر دلعزیزی کا باعث کچھ تو اُن کے کلام کی رندی و سرشاری ہے اور کچھ اُن کے پڑھنے کا جگر سوز انداز۔ جس نے جگر کو کسی مشاعرہ میں اپنے خاص پُر کیف انداز میں پڑھتے دیکھا ہے وہ اُن کے ترنم کی سحر کاری کا ضرور قائل ہے۔

جگر کی زندگی کے سطحی حالات سے کم و بیش ہر شخص واقف ہے۔ مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ نویں یا دسویں درجہ تک تعلیم پائی۔ گھر میں ہر فرد شعر و شاعری اور موسیقی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں جگر کا شعر و شاعری کی طرف بچپن ہی سے مائل ہو جانا، کوئی عجیب بات نہ تھی۔ کسب معاش کے سلسلہ میں کچھ عرصہ تک چشمے کے ایجنٹ رہے۔ لیکن شاعرانہ طبیعت اس پابندی کی بھلا کب تاب لاسکتی تھی۔ اسی سلسلہ میں ازدواجی زندگی کی بندشوں سے بھی آزادی حاصل کی، اور شراب و شاعری میں غرق ہو گئے دس بارہ سال یا کچھ اس سے زیادہ عرصہ تک جگر نے کچھ عجیب متوحشانہ زندگی بسر کی۔ کسی چیز کا ہوش نہ تھا، سوائے مے گلفام کے۔ جو جہاں بھی پکڑ کر لے گیا، چلے گئے۔ وہاں سے طبیعت گھبرائی کہیں اور چل دئے۔ قدردانوں کی کمی نہ تھی۔ جہاں بھی جاتے، سر آنکھوں پر بٹھائے جاتے۔ اِن کے اعزاز میں مشاعرے منعقد ہوتے۔ شعر و سخن کے دلدادہ، ہر وقت ان کو گھیرے رہتے۔ کبھی کبھی وہ ان صحبتوں سے گھبرا کر، چپکے سے نکل جاتے۔ دوست احباب ڈھونڈھ رہے ہیں، جگر صاحب کا پتہ نہیں۔

جگر کی مے نوشی اور پھر اس بلا کی مے نوشی، آخرکار اُن کی صحت کو لے ڈوبی۔ تین تین چار چار دن سوائے شراب کے، اور کوئی چیز اُن کے حلق کے نیچے نہ اُترتی۔ اُن کی شراب نہ صرف اُن کے لئے بلکہ اُن کے مخلص احباب کے لئے بھی بلائے جان ہو گئی تھی۔ لیکن آخرکار اس رند بلانوش کو ہوش آہی گیا، اور یہ شاید اُس مذہبی جذبہ کا اثر تھا جو رندی کے زمانہ میں بھی کبھی کبھی اُن سے توبہ کرا لیتا تھا۔ اب جگر بہت ہی معقول اور خود دارانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس دور میں غزل کے میدان میں جن شاعروں نے اپنا کوئی انفرادی رنگ پیدا کیا ہے، اُن میں حسرت، فانی، اصغر، اور جگر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جگر عمر کے اعتبار سے ان سب سے چھوٹے ہیں۔ چنانچہ اُنھیں حسرت، فانی اور اصغر سے مستفیض ہونے کے کافی مواقع ملے۔ لیکن وہ سب سے زیادہ اصغر سے متاثر ہیں۔ اصغر ایک صوفی اور صاحبِ حال شاعر تھے۔ جگر نے مدتوں اُن کی صحبتوں سے فیض اُٹھایا ہے۔

یوں تو ہونے کو جگر اور بھی ہیں اہل کمال
خاص ہے حضرت اصغر سے ارادت مجھکو

جگر کا ابتدائی کلام بالکل اصغر کے رنگ میں ڈوبا نظر آتا ہے متصوفانہ خیالات کے علاوہ جگر اصغر کے پسندیدہ الفاظ اور تراکیب سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ روح، برق، موج، دریا، تبسم، نظارہ، خاص وغیرہ الفاظ اصغر کو بہت محبوب تھے۔ جگر کے یہاں بھی ان کی کافی کثرت ہے۔ ان کی ابتدائی صوفیانہ شاعری کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں۔

لے کے نکلا ہے مرا جوش لطافت مجھ کو
خوب پہچان لے آج اے مری صورت مجھ کو
گر پڑی روح تعین کدۂ ہستی میں
کاش ہوتا ہی نہ احساس محبت مجھ کو

برق چمکی تھی کہ برپا جوشِ طوفاں ہوگیا
المدد اے شوق نظارہ پریشاں ہوگیا
روح قالب سے نکل کر اصل میں گم ہوگئی
نَے سے ہوتے ہی جدا نغمہ پریشاں ہوگیا
ورنہ کیا تھا صرف ترتیب عناصر کے سوا
خاص کچھ بیتابیوں کا نام انساں ہوگیا
چھوٹ سکتا تھا بھلا اس جسم سے دامانِ روح
پھر کبھی ملنے کا شاید عہد و پیماں ہوگیا
یوں بسر کی زندگی میں نے اسیری میں جگر
ہر طریقہ داخلِ آدابِ زنداں ہوگیا

لطافت مانعِ نظارۂ صورت سہی لیکن
دھڑکنا دل کا کہتا ہے وہ گذرے ہیں اِدھر ہوکر

اک جمالِ نو بہ نو، طوفاں بہ طوفاں چاہیئے
اب بجائے ہر نظر تصویرِ جاناں چاہیئے
سیرگاہِ عشق میں کانٹے ہی کانٹے ہیں تو کیا
دیکھنے والی نظر گلشن بداماں چاہیئے
یہ بھی وحشت ہے کوئی، اپنا گریباں، اپنا ہاتھ
ہاتھ اُن کا چاہیئے، اپنا گریباں چاہیئے

ایک ذرہ کا اگر حسن نمایاں ہوجائے — آدمی کثرت انوار سے حیراں ہوجائے
کفر ہی کا اگر انساں کو عرفاں ہوجائے — جس جگہ ٹیک دے سر کعبۂ ایماں ہوجائے
عرش تک ہو نہیں سکتی جو رسائی نہ سہی — یہی انساں کی ہے معراج کہ انساں ہوجائے

آجائے اگر اپنی ضد پر کوئی دیوانہ — خود گرد پھرے آکر کعبہ ہو کہ بتخانہ
احساس ہے ہستی کا، ادراک ہے مستی کا — ہاں اے نگہ ساقی اک اور بھی پیمانہ

اگرچہ ان شعروں میں کچھ نہ کچھ کیفیت ضرور ہے، لیکن سچ پوچھئے تو ان کی نوعیت محض تقلیدی ہے۔ یہ روایتی خیالات ہیں جو اچھی طرح نظم کر دئے گئے ہیں۔ جگر اس میدان کے مرد نہیں۔ اُنھیں تصوف سے

لگاؤ ضرور ہے، لیکن اس حد تک نہیں کہ اُن کی شخصیت کا جزو ہو گیا ہو۔ اصغر کے یہاں جو تڑپ نظر آتی ہے، وہ ان کے یہاں نہیں۔

جگر کی پوری پوری شخصیت جہاں بے نقاب ہوتی ہے، وہ اُن کی رندانہ اور عاشقانہ شاعری ہے۔ شاعری میں اُسی وقت جان پیدا ہوتی ہے جب شاعر انتہائی خلوص سے اپنی زندگی کے تجربات کا نچوڑ پیش کرتا ہے۔ زندگی میں جن چیزوں کو شاعر نے شدّت سے محسوس کیا ہے، اُنھیں وہ اُسی شدّت کے ساتھ پیش کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ جگر کی زندگی کا ایک حصّہ جام و مینا سے کھیلتے گذرا ہے وہ سرور، نشہ، سرشاری، بدمستی کی کیفیات سے ایک عرصہ تک لذّت اندوز ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ جہاں وہ اس قسم کے تجربات بیان کرتے ہیں اُن کے اشعار میں بلا کی بیساختگی اور روانی پیدا ہو جاتی ہے۔

پوچھا کیا، کتنی وسعت دل کے پیمانے میں ہے
سب اُلٹ دے ساقیا، جتنی بھی میخانے میں ہے

یوں تو ساقی ہر طرح کی تیرے میخانے میں ہے
وہ بھی تھوڑی سی جو ان آنکھوں کے پیمانے میں ہے

شیشہ مست و بادہ مست و حُسن مست و عشق مست
آج پینے کا مزہ پی کر بہک جانے میں ہے

وہ رند ہوں کہ اُلٹ دی جب آستیں میں نے
دکھا دئے حرم و دیر سب یہیں میں نے

اے محتسب نہ پھینک مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ہے۔ ارے ظالم شراب ہے

بہت ہی عجیب شعر ہے۔ شاعر پہلے تو آہستہ سے محتسب کو منع کرتا ہے، پھر التجا کرتا ہے کہ "مرے محتسب نہ پھینک" محتسب پھر بھی نہیں سُنتا اور پھینکنے پر تُلا نظر آتا ہے تو شاعر غم و غصّہ میں دیوانہ وار شراب کی اہمیت اُس پر واضح کرتا ہے کہ "ظالم شراب ہے، ارے ظالم شراب ہے"۔ کتنے بتدریج بڑھتے ہوئے جذبات صرف دو مصرعوں میں سمو دئے گئے ہیں۔

لیکن جگر کے حُسن و عشق کی دنیا بھی، بہت ہی لطیف دنیا ہے وہ جہاں عشق کی نفسیات پر عبور رکھتے ہیں، وہاں حُسن کی نفسیات سے بھی ناواقف نہیں۔ انکے عاشقانہ جذبات میں، خودداری کے علاوہ متانت بھی نظر آتی ہے۔ اُن کی نظر میں جتنا عشق بیقرار اور اُفتادہ مزاج ہے، اُتنا ہی حُسن بھی ہے۔

عشق ہی تنہا نہیں آشفتہ سر میرے لئے
حُسن بھی بیتاب ہے، اور کس قدر میرے لئے

سرد سرد آہوں میں تاثیر محبت گرم گرم
خشک خشک آنکھوں میں جوشِ اشک تر میرے لئے

سامنے آتے ہی آتے وہ تنفس تیز تیز
سینۂ شفاف وہ زیر و زبر میرے لئے

تجاہل، تغافل، تبسم، تکلم — یہاں تک تو آئے وہ مجبور ہو کر

ادھر سے بھی ہے سوا کچھ اُدھر کی مجبوری
کہ ہم نے آہ تو کی اُن سے آہ بھی نہ ہوئی

پھر بھی تجھ سے ہزار شکوے ہیں — جانتا ہوں مرا خیال بھی ہے

عشق کی مختلف النّوع کیفیتوں کو جگر نے جس طرح محسوس کیا ہے، اُس سے اُن کی غیر معمولی حسّاس طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وہ معاملہ بندی میں نہیں پڑتے۔ عامیانہ جذبات سے بھی بچتے ہیں۔ اُن کے جذبہ میں جہاں ایک والہانہ پن اور بیساختگی ہے، وہاں (خود بقول

جگر کے) ایک "ہلکی سی موج درد" بھی موجود ہے۔ اُن کے یہاں آرزوؤں اور تمناؤں کا ماتم نہیں ملے گا۔ وہ صرف اُن جذبات کے جزر و مد سے تعلق رکھتے ہیں جو محبت کی حالت میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کی شاعری کامرانی اور ناکامرانی، اُمید اور یاس کے بین بین نظر آتی ہے۔

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا،   دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا

اس طرح خوش ہوں کسی کے وعدۂ فردا پہ میں   درحقیقت جیسے مجھ کو اعتبار آ ہی گیا

درد نے کروٹ ہی بدلی تھی کہ دل کی آڑ سے   دفعتاً پردہ اُٹھا اور پردہ دار آ ہی گیا

تری خوشی سے اگر غم میں بھی خوشی نہ ہوئی
وہ زندگی تو محبت کی زندگی نہ ہوئی

صبا یہ اُن سے ہمارا پیام کہہ دینا
گئے ہو جب سے یہاں صبح و شام ہی نہ ہوئی

کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں
پھر ایسی چشمِ توجہ ہوئی ہوئی نہ ہوئی

کبھی شاخ و سبزہ و برگ پر، کبھی غنچہ و گل و خار پر
میں چمن میں چاہے جہاں رہوں، مرا حق ہے فصلِ بہار پر

نہ دیں غیظ میں مجھے دھمکیاں، گریں لاکھ بار یہ بجلیاں
مری سلطنت یہی آشیاں، مری ملکیت یہی چار پر

میں رہینِ درد سہی مگر، مجھے اور چاہئے کیا جگر
غمِ یار ہے مرا شیفتہ، میں فریفتہ غمِ یار پر

کیا عشق نے سمجھا ہے کیا حسن نے جانا ہے   ہم خاک نشینوں کی ٹھوکر میں زمانہ ہے

دل گیا رونقِ حیات گئی   غم گیا ساری کائنات گئی

ترکِ اُلفت بجا سہی ناصح   لیکن اُن تک اگر یہ بات گئی

مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن   اک مسیحا نفس کی بات گئی

دل کو برباد کر کے بیٹھا ہوں   کچھ خوشی بھی ہے کچھ ملال بھی ہے

تصوّر رفتہ رفتہ اک سراپا بنتا جاتا ہے
وہ اک شئے جو مجھی میں ہے مجسم ہوتی جاتی ہے

وہ رہ رہ کر گلے مل مل کے رخصت ہوتے جاتے ہیں
مری آنکھوں کی یارب روشنی کم ہوتی جاتی ہے

کسی صورت نمودِ سوزِ پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

سینۂ نَے پہ جو گذرتی ہے   وہ لبِ نَے نواز کیا جانیں

انھیں آنسو سمجھ کر یوں نہ مٹی میں ملا ظالم
پیامِ دردِ دل ہے اور آنکھوں کی زبانی ہے

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آ رہے ہیں وہ جا رہے ہیں

ہمارا ہی ہوگا نہ آغوش خالی   کچھ اپنا بھی پہلو تہی پائیے گا

ہمیں جب نہ ہوں گے تو کیا رنگِ محفل   کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا

چاندنی ہے، ہوا ہے، کیا کہیے   مفلسی کیا بلا ہے کیا کہیے

اس طرح کے اور بھی بہت سے اشعار جگر کے یہاں مل سکتے ہیں۔ ایک سے ایک بہتر۔ لیکن کسی شاعر کا صرف حسن و عشق تک رہ جانا، اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے انسانی ہستی کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ محبت ایک بہت ہی شدید جذبہ ہے لیکن جوانی کے ہنگاموں کے بعد اس جذبہ میں وہ شدت باقی نہیں رہتی۔ دوسرے ایک ہی موضوع پر لکھتے لکھتے طبیعت خود بخود اُکتا سی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن و عشق کے شاعر بہت جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ جگر بھی حسن و عشق کے میدان سے قدم باہر نہیں نکالتے

یہ نہیں کہ اُن میں باہر نکلنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ بعض اوقات وہ غیر شعوری طور پر اُن تاثرات کے اظہار پر مجبور نظر آتے ہیں جو ہمارے سیاسی اور معاشی حالات کی پیداوار ہیں۔ کانپور کے فرقہ وارانہ فسادیں جو قتل و خونریزی ہوئی تھی اُس کی تصویر بہت ہی دردناک الفاظ میں جگرؔ نے ایک فارسی کی نظم میں کھینچی ہے۔ کبھی کبھی وہ غزل میں بھی اس دور کی تلخیوں کو جگہ دیدیتے ہیں لیکن انھیں اس سے غرض نہیں کہ آخر ان تلخیوں کا سبب کیا ہے۔ یہ غزل دیکھئے۔

بے کیف مئے ناب ہے معلوم نہیں کیوں — پھیکی شبِ مہتاب ہے معلوم نہیں کیوں
بے وجہ تب و تاب ہے معلوم نہیں کیوں — دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں
ساقی نے جو بخشا تھا بصد لطف و باصرار — وہ جرعہ بھی زہر آب ہے معلوم نہیں کیوں
دل آج بھی سینہ میں دھڑکتا تو ہے لیکن — کشتی سی تہِ آب ہے معلوم نہیں کیوں
محسوس یہ ہوتا ہے کہ ہر تازہ تغیّر — میرے لئے بیتاب ہے معلوم نہیں کیوں

یا پھر یہ اشعار:۔

طبیعت اندنوں بیگانۂ غم ہوتی جاتی ہے
مرے حصّہ کی گویا ہر خوشی کم ہوتی جاتی ہے

جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں
یہ محفل اور برہم، اور برہم ہوتی جاتی ہے
زمانہ گرم رفتارِ ترقی ہوتا جاتا ہے
مگر اک چشمِ شاعر ہے کہ پُرنم ہوتی جاتی ہے

نہ حسن سے کوئی مطلب نہ عشق سے سروکار کچھ اس طرح کی بھی گھڑیاں گذار دیں ہیں نے

بلبل ہمہ تن خوں شد و گل شد ہمہ تن چاک
اے وائے بہارے اگر این است بہارے

فن کے اعتبار سے جگرؔ کے یہاں جو موسیقیت اور روانی ہے، وہ اس دور کے کسی اور غزل گو شاعر کے حصّہ میں نہیں آئی۔ جگرؔ مترنم اور نازک الفاظ کا خاص طور سے خیال رکھتے ہیں۔ اُن کے سطحی خیالات میں بھی اسی وجہ سے ایک دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُن کے یہاں وہ گہرائی نہیں جو میرؔ و غالبؔ کے عظیم المرتبت ہونے کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے۔

م۔ ا۔ ج

(بقیہ از مضمون صفحہ ۲۴)

بکھیڑے ڈال کر اُردو کی ترقی کو روکے رکھا۔ حتیٰ کہ پنجاب اور دکن کے لوگوں نے اُردو کی وہ خدمت کی کہ یو۔پی کے لوگ خجالت سے گردن نہ اُٹھا سکے۔ اسی طرح ہم بھی اپنی بکھیڑوں میں پھنسے رہیں گے اور پنجاب کی عورتیں پشتو کی ڈی۔ لٹ کی ڈگریاں حاصل کرتی رہیں گی۔

مختصر یہ کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ضلع پشاور اور مردان کے لوگ پشتو کے بارے میں تنگدلی چھوڑ دیں۔ پشتو تمام افغانوں کی مادری زبان ہے۔ تمام افغانوں کو موقع دیا جائے کہ وہ تحریر اور تقریر سے پشتو کی خدمت کریں، اور تلفظ یا الفاظ کے اختلاف کا قطعی خیال نہ رکھا جائے۔ مثلاً لخکر دَ بگل نعرہ پہ خپلو غوگو اوریدلہ"۔ اب ہم اسی فقرے کو یوں ادا کریں گے "لخکر۔ د۔ بگل غاگ پہ خپلو غیگو اوریدلو"۔ اور تحصیل ٹیری کے خٹک اسی فقرے کو (بقیہ مضمون صفحہ ۱۵ پر)

ایران، افغانستان اور ہندوستان کو ٹیونیسیا سے اتنا کم تعلق ہے کہ بہت کم لوگوں کو اس کے متعلق کچھ زیادہ علم ہوگا آجکل چونکہ وہاں لڑائی ہو رہی ہے اور اس کے متعلق آئے دن وہاں سے خبریں آ رہی ہیں، اس لئے ہر شخص اُس ملک کے نقشہ، شہروں کے ناموں اور یہاں تک کہ وہاں کی موسمی کیفیت سے بھی واقف ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے ہمارا خیال ہے کہ اگر ہم یہاں ٹیونیسیا کی طویل تاریخ کا مختصر سا خاکہ پیش کریں تو غیر مفید ثابت نہ ہوگا۔ یہ خاکہ دراصل اُن واقعات پر مبنی ہے جو مقامی اہمیت رکھتے ہیں، اور ایسے واقعات جو آجکل رونما ہیں اور جن کی عالمگیر حیثیت ہے، قریب قریب ایک ہزار سال قبل ظہور میں آئے تھے۔

اس ملک کی قدیم تاریخ ۲۵۰۰ سال قبل شروع ہوتی ہے جب الفینیقیین نے جو شام کے ساحل سے آئے تھے، اسے آباد کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد رومنوں نے اسے فتح کر لیا۔ کچھ اور مدت گذر جانے کے بعد یہ سلطنت بائیزنٹائن کا ایک صوبہ بن گیا، یہاں تک کہ عربوں نے سنہ ۶۴۷ء میں اس پر پہلی دفعہ حملہ کیا۔ لیکن اس حملہ کی نوعیت محض اک دھاوے کی سی تھی۔ اسی قسم کا دھاوا ۱۸ سال بعد سنہ ۶۶۵ء میں پھر ہوا۔ کچھ اور عرصہ گذر جانے کے بعد عقبہ بن نافع (سنہ ۶۶۹ء کے بعد) کی گورنری کے زمانہ میں، جس نے قیروان کی بنیاد ڈالی تھی، وہ صوبہ جسے عرب افریقیۃ کہتے ہیں، خلفائے بنو اُمیہ نے دراصل فتح کیا۔

اس ملک میں پہاڑیاں بکثرت ہیں جو موجودہ الجیریا کی سرحد پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ جب عربوں نے اسے فتح کیا تو شہروں میں یونانی بستے تھے اور ریگستان میں خانہ بدوش بربری۔ افریقیۃ لاطینی نام افریقہ کی خراب شدہ شکل ہے، اسی طرح بربری اصل میں barbarian (وحشی، جاہل) سے نکلا ہے۔ رومنوں نے تمام قدیم اور غیر مہذب قوموں کو یہی نام دے رکھا تھا۔ اس نئے مفتوحہ صوبہ کی تاریخ میں ہمیں خاص طور سے بغاوت کا ایک طویل سلسلہ نظر آتا ہے۔ ہنگامہ پسند بربری بغاوت اور لوٹ مار کر رہے ہیں یا پھر عرب کی محافظ فوج، جس میں عربوں کے علاوہ مشرق کے ہر قسم کے قسمت آزما بھرے ہوئے تھے، کوئی نہ کوئی فساد برپا کر رہی ہے اور فساد ہی نہیں، لوٹ مار میں بھی مشغول ہے۔ یہ حالت اُس وقت تک رہی جبتک کہ ابراہیم بن اغلب جیسا سخت آدمی وہاں نہیں پہنچا۔ سنہ ۸۰۰ء میں

اُس نے اپنا اقتدار قائم کیا اور خلفائے بنو عباس کی اطاعت قبول کر لی جنھوں نے اُس کے تقرر کی تصدیق کر دی۔ اُس نے عملاً خود مختار گورنروں کے سلسلہ کا آغاز کیا جن کی حکومت ۹۰۹ء تک قائم رہی اس سال فاطمیوں نے ان کی طاقت کا خاتمہ کر دیا۔

بربریوں میں ہر نئے مذہب کو اختیار کرنے کی بڑی حیرت انگیز صلاحیت تھی، اگرچہ ان کا جذبہ کچھ زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہتا تھا۔ بہت سے سُنّی بھی تھے جن میں اکثر مالکی مسلک کے پیرو تھے۔ بہت سے خوارج اور اباضیہ تھے۔ ۸۹۳ء میں جب ایک فاطمی داعی ابوعبداللہ الشیعی مشرق سے آیا اور اُس نے دعوت دی تو ایک طاقتور قبیلہ کتامہ نامی نے بڑے جوش و خروش سے لبیک کہا۔ وہ تمام ملک پر چھاگئے اور افریقیہ پر قبضہ کر لیا۔ ۹۰۹ء میں المہدی باللہ کی خلافت کا اعلان رقادہ میں کیا گیا جو قیروان کے مضافات میں واقع ہے، اور اس طرح ایک نئی خلافت کی بنیاد پڑی۔ المہدی ایک غیر معمولی قابلیت کا آدمی تھا اور اُسے سلطنت کے استحکام کیلئے بہت کام کرنا پڑا۔ ۹۳۴ء میں اُس کی وفات کے بعد اُس کے بیٹے القائم بامراللہ نے اُس کے کام کو جاری رکھا۔ اُس کی حکومت کے آخری دنوں میں خوارج نے ابویزید بن کیداد کی سرکردگی میں علم بغاوت بلند کیا۔ ٹھیک ایک ہزار سال قبل القائم بڑے زور شور سے جنگ میں مشغول تھا لیکن اُسے کافی امداد نہ مل سکی۔ وہ پہلے سوسہ اور بعد میں مہدیہ جو سمندر کے کنارے واقع ہے میں محصور ہوا، مؤخر الذکر اُس کے باپ نے آباد کیا تھا۔ ۹۴۶ء میں القائم دفعتاً بیمار پڑا اور مر گیا۔ اُس کے ساتھیوں نے پھر بھی جنگ جاری رکھی یہانتک کہ اُس کا بیٹا اور جانشین المنصور باللہ فوج لے کر مدد کے لئے آپہنچا، باغیوں کو شکست دی اور آخرکار ابویزید کو بھی پچھاڑ کے گرفتار کر لیا۔ گویا ایک ہزار سال قبل انہی مقامات میں قسمتوں کا فیصلہ کرنے والی لڑائیاں لڑی گئیں۔ اِن لڑائیوں نے فاطمی خلفا کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا جن کے پرچم کے تلے اسلامی کلچر کو انتہائی عروج ہوا تھا۔

فاطمی ریاست بہت جلد سنبھل گئی اور ۲۳ سال بعد ۹۶۹ء میں مصر بھی ایک فوجی مہم میں سر ہو گیا، اور ایک سال کے بعد دمشق بھی۔ ۹۷۳ء میں المنصور کا بیٹا المعز لدین اللہ جو سب سے زیادہ قابل فرمانروا تھا، قاہرہ منتقل ہو گیا۔ فاطمیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بھی مشرق میں منتقل ہو گیا۔ افریقیہ کو قریب قریب نظر انداز کر دیا گیا اور کوئی پچاس سال بعد بربریوں نے پھر بغاوت کی اور حکومت بنو زیری کے خاندان میں آگئی۔ اُس کے بعد دوسرے خاندانوں کا اقتدار قائم ہوا۔ اسی طرح یہ سلسلہ چلتا رہا یہانتک کہ سولھویں صدی کے آخر میں یہ صوبہ ترکوں کے ہاتھ میں چلا گیا جو بہت عرصہ سے ایشیائے کوچک اور قسطنطنیہ میں اپنے قدم جمائے ہوئے تھے۔

اُنیسویں صدی میں الجیریا اور ٹیونس جو بحری ڈاکوؤں اور بردہ فروشی کا مرکز بنا ہوا تھا، ان پر فرانس کی نظریں پڑیں۔ ۱۸۳۰ء میں الجیریا پر قبضہ ہو گیا اور ٹیونیسیا کو بھی رفتہ رفتہ فرانسیسی اقتدار کے تحت میں آنا پڑا، اور آخرکار ۱۸۸۳ء میں یہ فرانس کے سائے میں آگیا۔

ٹیونس جو آجکل دارالسلطنت ہے، قیروان سے بھی کہیں زیادہ قدیم ہے۔ دونوں مقامات آثار قدیمہ کے اعتبار سے بہت دلچسپ اور ہمیشہ علوم و فنون کا مرکز رہے ہیں۔ عربی ادبیات کی

تاریخ میں انھوں نے اپنے کافی نقوش چھوڑے ہیں۔ آج سارے ملک کی زبان عربی ہے۔ بربری خانہ بدوش بڑی تیزی سے بستے جاتے ہیں، جدید تعلیم پھیل رہی ہے، تجارت وصنعت میں ترقی ہورہی ہے اور یہ بہت ممکن ہے کہ جنگ کے بعد اس ملک کی ترقی کی رفتار اور بھی تیز ہوجائے۔ اس کی آبادی زیادہ نہیں ہے۔ ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے مطابق ..... ۲۲ سے کچھ ہی کم تھی جن میں بیس لاکھ مسلمان تھے اور باقی عیسائی اور یہودی یہ سب کے سب قریب قریب قصباتی باشندے تھے۔ ٹیونس کی آبادی تقریباً ۲ لاکھ ہے۔ قیروان کا نمبر پانچواں ہے۔ اسکی آبادی صرف ۲۰ ہزار ہے۔

یہ قدیم مقام گرمیوں میں سخت گرم اور سردیوں میں سرد ہوتا ہے۔ یہ سمندر کی سطح سے ۲۵۰ فیٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اکثر پہاڑی چشموں کے سیلاب کی زد میں آجاتا ہے۔ پرانے زمانہ میں یہ مقام بیماریوں کا گھر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے فرماں روا اپنی رہائش کے لئے کوئی نہ کوئی نیا اہتمام کرتے تھے۔ فاطمی خاندان کے عروج سے پہلے رقادہ کے مضافات کی سب سے زیادہ اہمیت تھی، لیکن المہدی نے سمندر کے کنارے ایک نئی عمارت بنوائی جس کا نام مہدیہ رکھا۔ خوارج کی بغاوت کے فرو ہونے کے بعد المنصور نے ایک نئی جگہ آباد کی جس کا نام منصوریہ رکھا۔ یہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے اور ایک صدی کے بعد ان کا ذکر بھی باقی نہیں رہا۔

دوسرے شہر جو ساحل پر یا ملک کے اندرونی علاقوں میں واقع ہیں، بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا شہر سفاکس ہے جس کی آبادی صرف ... ۲۸ ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر مقامی صنعت اور زراعت کو ترقی دی جائے تو ملک پہلے سے کہیں زیادہ بہتر اور خوشحال نہ ہوسکے۔

(بقیہ مضمون صفحہ ۱۲)

یوں کہیں گے " لشکرہ د- نگل زاغ پہ خپلو غنو یژو (د ریدلو" اسی طرح مختلف قبائل اور مختلف علاقوں کے لوگ اس فقرے کو مختلف تلفظ اور الفاظ میں ادا کریں گے اور اگر اس بات کی پابندی ہو کہ صرف ایک ہی طریقہ سے (یعنی یوسف زئی کے طریقے پر) یہ فقرہ ادا کیا جائے تو قدرتی اور فطرتی طور پر ایسا نہیں ہوسکتا، اور یہ تو تب ہوسکے گا کہ یا تو ہم دس بارہ سال کے لئے باقی سب دھندے چھوڑ دیں، اور علاقہ یوسف زئی کے کسی حجرے میں ڈیرے ڈالیں (کیونکہ پشتو سیکھنے کے لئے صوبہ سرحد میں کوئی سکول یا کالج نہیں ہے) اور یا جب کبھی مولانا صاحب مضمون کیلئے استدعا کریں تو ہم کہدیں، بابا معاف کرو پشتو میں وسعت نہیں ہے۔

(صاحبزادہ رازق نوربی، اے (آنرز) بی، ٹی (علیگ)
ہیڈ ماسٹر اے یو۔ مڈل سکول ٹیری ضلع کوہاٹ (صوبہ سرحد)

فلسفۂ وحی

(۶) ڈاکٹر محمد احسان اللہ خان پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور

یہ دراصل اعتقاد کا معاملہ ہے۔ یہ جانچنے کے لئے کہ دعویٰ سچا ہے یا جھوٹا کوئی خاص قاعدہ یا قانون یا منطقی معیار نہیں ہے، صرف یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ دعوید ار اتنے بھروسہ کا آدمی ہے کہ اس پر اعتماد کیا جاسکے اور اس کی افادات آپ کی معیاری فطرت کے مقتضیات کے منافی تو نہیں۔ اس کی شخصیت، اس کے اعمال اور ارشادات آپ کے سامنے ہیں اور ان ہی کی بنا پر آپ اس کے دعوے کی صداقت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

(۱) شخصیت۔ نبی کی شخصیت بہت عظیم الشّان ہے اور اس میں خاص کشش ہوتی ہے۔ اس کی زندگی اس اخلاقی دستور العمل کے مطابق جو خدا کی طرف سے مرتب ہو کر بذریعہ وحی آیا ہو، سختی کے ساتھ منضبط ہوتی ہے۔ اس کی زندگی ایک بے داغ اور معصومانہ زندگی ہے جو شفاف صداقت اور خالص شرافت اور اُلوالعزمی لئے ہوئے ہوتی ہے اور خود غرضانہ ترقی کی خواہش کا اس میں شائبہ تک نہیں ہوتا۔

(۲) اس کے عمل سے پوری جرأت اور ثابت قدمی پائی جاتی ہے۔ اس کے استقلال میں تو خلل آ ہی نہیں سکتا۔ اپنے مقاصد کی اشاعت میں وہ بڑی سے بڑی مشکلات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اعمال کچھ اس قسم کے ہوتے ہیں کہ نہ تو لوگوں کی نظر و مشاہدہ سے بچ سکتے ہیں اور نہ بے نتیجہ ہی ہوتے ہیں، بلکہ وہ اعمال اثر و نتیجہ کے لحاظ سے زندگی کے نظری اور عملی میدانوں میں (یعنی زندگی کے اصولوں میں اور بشر کے ان اعمال میں جو ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے سے رونما ہوئے ہوں) ایک وسیع انقلاب اور فعالیت پیدا کر دیتے ہیں۔

(۳) اس کے ارشادات میں ایسی جامعیت اور یک رنگی پائی جاتی ہے کہ اُن پر عمل کرنا انسانی بہبودی کا باعث ہوتا ہے اور ان میں ایسی جدّت ہوتی ہے جسے سارے بنی آدم مل کر بھی پیدا نہ کر سکیں، اور جس کے لئے ہماری روحیں ترس رہی ہوں۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ ہم ایسے خدائی پیام کو کیوں مانیں جس کی حقیقت کا سمجھنا ہمارے ادراک، فہم اور عقل کے بس کا نہ ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ گو آپ کی قوائے مدرکہ قاصر ہیں لیکن اس سے خدائی پیام کی حقیقت اور صحت کی تردید نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ وہ باطنی تحریک کا مادہ بھی تو ہے جس کی صلاحیت پہلے سے موجود ہوتی ہے، اور اس

صلاحیت کو نبی کی مقتدر شخصیت اور بھی اُبھارتی ہے۔ اب مجھ سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی ایسی بات پر یقین کروں جس کا کسی اور وسیلہ سے مجھے علم نہیں ہو سکتا۔

اس کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقیقت محض حقیقت کی حیثیت سے قوت عمل سے عاری ہے۔ اس بات پر غور کیجئے گا تو یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت اپنے آپ کو نظری اعتبار سے منوا دے، مگر بذاتہٖ اس یقین کو عمل میں تبدیل نہیں کر سکتی، اور جسے قوّت کہتے ہیں وہ دراصل عمل ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ کہنا کہ "حقیقت قوت اور عمل کرانے کی استعداد رکھتی ہے" دراصل محض تمثیلی اور مجازی طرزِ بیان ہے۔ یہ امر کہ حقیقت کے ادراک کا لازمی نتیجہ یہ نہیں کہ اس کے مطابق عمل بھی شروع ہو جائے، اس مثال سے واضح ہو جائے گا کہ قرآن، انجیل اور دیگر مقدس کتابوں کے پیرووُں کو ان کی کامل حقیقت کا یقین ہے۔ تاہم وہ ان پر پوری طرح سے پابند نہیں۔ بلکہ فی الحقیقت آجکل کی مادّی اور انفرادی رجحانات کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پابندی کے مقابلہ میں ان کتب مقدسہ کی خلاف ورزی کہیں زیادہ ہے۔ یہ تو انبیا کی مقتدر شخصیتوں ہی کا اثر ہے کہ لوگ ان کی تعلیمات، ارشادات اور حقیقت کو ماننے لگتے ہیں۔ یہ اُن کی شخصیت کی مقناطیسی کشش ہی ہے جو لوگوں کے دل و دماغ کو اس طرح تسخیر کرتی ہے کہ وہ انبیاء کے احکام پر بےچون و چرا عمل کرنے لگتے ہیں۔

اصول و قواعد اور اُن کی صحت کو محض نظری طور پر سمجھ لینے سے انسان کے دل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ مثال ملاحظہ ہو۔ سچ بولنا درحقیقت ایک نیک اور مستحسن فعل ہے۔ باوجود اس کے اگر میں اچھا آدمی نہیں ہوں تو اپنے مفاد کیلئے جھوٹ بولنے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ اگر سچ میں قوت فعل ہوتی تو سچ پر عمل کرنا ناگزیر ہو جاتا۔ پس اس لغزش کی یا راستی سے انحراف کی علّت کیا ہے؟

اگر آپ اس نظریہ پر کہ سچ میں قوت عمل ہے، اَڑے ہوئے ہیں تو ایک اور لغویت کا سامنا کرنا پڑے گا، یعنی قوت آزادی کی آزادی جاتی رہے گی۔ دنیا ایک مقدس نظام بن جائے گی۔ اور علم نیکی کا یا نیکی کی علّت کا مترادف ہو جائے گا۔ لیکن ان نظریوں سے مجھے اتفاق نہیں۔ تقدس تو ایک نصب العین کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ وہ ربّانی کیفیت ہے جو ساری کائنات کا مقصود ہے۔ اس کے علاوہ علم نہ تو نیکی کا مرادف ہے نہ نیکی کے سبب کا۔ یہ دو بالکل مختلف اقدار ہیں۔ میں یہ بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تمام بشری فعالیت کا مرکز محض بشر ہی ہے۔ لہذا دنیا کی ساری موجودات میں سے بشر بشر ہی سے مانوس ہے اور بشر بشر ہی کا اثر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کبھی ہم کسی اہم موضوع پر کچھ کہیں یا لکھیں تو ہم بشر ہی کا حوالہ دیتے ہیں یعنی ان نامور مصنّفین کا جنھوں نے کتابیں لکھی ہیں۔ میرے اس بیان کی السنہ بھی تصدیق کرتی ہیں۔ کیونکہ قرونِ ماضی کی دانش بڑی حد تک زبانوں ہی میں محفوظ ہے۔ میری مادری زبان پشتو میں ایک ضرب المثل ہے (بقیہ مضمون صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ ہو)

"مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ"

کیپٹن فیض احمد صاحب فیض

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے؟
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخواب میں بنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
جسم نکلے ہوئے امراض کے تنّوروں سے پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

خدانے درویش کامل کو جو مرتبہ عطا کیا ہے وہ اُن شہنشاہان ذی حشم کو بھی نصیب نہیں ہوا جو نصف کرۂ ارض پر حکمراں تھے فرمانرواؤں نے اکثر آستانِ درویش پر جبیں سائی کی ہے۔ "ظلِّ الٰہی" اکثر درویشانِ کامل کے رہین منت رہے ہیں۔ سکندرِ اعظم فاتح دنیا سہی، لیکن ارسطو کا ایک ادنیٰ چیلا تھا۔ فرعون نے لاکھ دعویٰ خدائی کیا۔ لیکن حضرتِ موسیٰ کے آگے اُس کی کٹ پتلی سے زیادہ وقعت نہ تھی۔ اکبر شہنشاہ ہندوستان تھا، لیکن اُس کو شیخ سلیم چشتی کے آگے سرِ نیاز جھکانا ہی پڑا۔ آئیے اس وقت موخرالذکر درویش کی بارگاہ سے کچھ عقیدت کے پھول ہم بھی حاصل کریں۔

شیخ سلیم چشتیؒ ایک اعلیٰ خاندان کی فرد تھے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد نے اپنی کتاب "تاریخ جہانگیر" میں بیان کیا ہے کہ "وہ فرخ شاہ، بادشاہ کابل کو اپنا مورثِ اعلیٰ بتاتے تھے۔ اُن کے قریبی بزرگوں نے دہلی میں بود و باش اختیار کرلی تھی۔ جہاں ۱۴۷۹ء میں اُن کی ولادت ہوئی"۔ نواب شمشاد الدولہ شاہ نواز نے "معاصر الامرا" میں بیان کیا ہے کہ "اُن کے پدر بزرگوار شیخ بہاءالدین تھے جو شیخ فریدالدین گنج شکر کی اولاد تھے"۔ شیخ سلیمؒ نے خواجہ ابراہیم جو چھٹے واسطہ میں فضیل ابن عیاض کے فرزند سجادہ نشین تھے، کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا، اور اُن کے مریدوں میں بہت جلد سب سے اعلیٰ مرتبہ حاصل کرلیا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ زہد و تقدس، عبادت گذاری اور نیکو کاری اُن کو ورثہ میں ملی تھی۔ اس پر تحصیل علم کے ذوق نے اُن کو ایک درویشِ کامل بنا دیا تھا۔

تحصیلِ علم اور سیاحی کا ذوق اُن کو کشاں کشاں بغداد، شام، نجفِ اشرف اور دیگر اسلامی ممالک لے گیا۔ وہ دو مرتبہ ہندوستان سے باہر گئے اور ۲۲ سال تک اسلام کے ہر فرقہ کا بغور مطالعہ کیا۔ شمس العلما مولانا مولوی محمد حسین صاحب آزاد نے "دربارِ اکبری" میں بیان کیا ہے کہ "تمام سال سفر میں سیاحی، حج کے وقت مکہ معظمہ آجاتے تھے۔ پھر سیر کو نکل جاتے تھے۔ اس طرح ۲۲ حج کئے۔ چودہ پہلی دفعہ، آٹھ دوسری دفعہ، اخیر مرتبہ چار برس مکہ معظمہ ہی میں رہے۔ چار برس مدینۂ منوّرہ میں۔ مکہ والے چار برسوں میں بھی خاص خاص دنوں میں مدینۂ طیبہ جا رہتے تھے"۔

شیخ سلیمؒ کے علم و فضل کا جو اثر اسلامی ممالک کے باشندوں پر ہوا اُس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اُن کو "شیخ الہند" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ بقول "ڈاکٹر بینی پرشاد" اُن کے لقب

"شیخ الہند" نے اُن کو ہندوستان کے متعدد مہاجرین سے افضل تر قرار دیا۔"

سچائی اور حقانیت کی مدتوں جستجو اور مختلف فرقوں کے دقیق مطالعہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ شیخ سلیمؒ کا رجحان تصوّف کی طرف ہوگیا۔ وہ گھنٹوں مراقبہ میں رہتے تھے اور اُن کی روح جویائے وصال۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب شیخ مان پانی پتی نے اُن سے دریافت کیا کہ "طریقۂ شما با استدلال است یا بکشف" تو اُنھوں نے جواب دیا "درطَورِ ما دِل بہ دِل است"۔

برسوں کی سیاحی کے بعد جب ۱۵۶۴ء میں شیخ سلیمؒ ہندوستان واپس ہوئے تو علماء اور مشایخ کے حلقہ میں اُنکی بہت تعظیم و تکریم ہوئی۔ مُلا عبدالقادر بدایونی نے تاریخیں لکھیں۔

شیخ الاسلام وَلیِ کامل — آن مسیحا نفس و خضر قدم
لامع از جبہ او سِرّ اول — طالع از چہرۂ اُو نورِ قدم
از مدینہ چو سوئے ہندستان — آن مسیحا نفس و خضر قدم
بشمر حرفے دمشمر حرفے — بہر تاریخ ز خیر المقدم

دوسری تاریخ

شیخ الاسلام مقتدائے انام — رفع اللہ قدرہ السامی
از مدینہ چو سوئے ہند آمد — آن ہدایت پناہِ نامی
گیر حرفے و ترک کن حرفے — بہر سالش ز شیخ اسلامی

واپسی پر شیخ سلیمؒ نے بمقام سیکری سکونت اختیار کی یہ وہ مقام تھا جہاں بابر نے رانا سانگا پر فتح پائی تھی اور اظہارِ تشکر کے لئے اُسکو "شُکری" کے نام سے موسوم کیا تھا۔

شیخ سلیمؒ کا شمار اُن درویشانِ کامل میں ہوتا ہے جن کے آستان پر کئی بادشاہوں کی جبینِ ناز جھکی جب شیر شاہ کا بڑا لڑکا عادل خاں اپنے چھوٹے بھائی سلیم سے تخت نشینی کے معاملہ میں گفتگو کرنے چلا تو سیکری میں شب برات کو پہنچا۔ وہ اور خواص خاں شیخ سلیمؒ کی قدمبوسی کو حاضر ہوئے اور انہیں کے مہمان ہوئے۔ شیر شاہ کے چھوٹے لڑکے سلیم کو بھی اُن سے خاص عقیدت تھی۔ سلیم شاہ کے دو امام تھے۔ ایک شیخ سلیمؒ اور دوسرے حافظ نظام بداونی۔ لیکن دوسرے بادشاہوں کی بنسبت شہنشاہ اکبر کو اُن سے زیادہ عقیدت تھی۔

۱۵۶۹ء تک اکبر کے جتنے بھی بچے ہوئے ان کا عہدِ طفولیت ہی میں انتقال ہوگیا۔ اکبر کو ایک جانب یہ تشویش تھی کہ اُس کے بعد تخت و تاج کا وارث اُس کی اولاد ہی میں سے ہو۔ دوسری جانب شفقتِ پدرانہ اس امر کی مقتضی تھی کہ کوئی بچہ ایسا ہو جس کو وہ اپنا کہہ سکے۔ شیخ محمد بخاری اور حکیم عین الملک نے شیخ سلیم چشتیؒ کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اُن سے دعا کرائیے خدا آپ کو جانشین عطا کرے۔ ابو الفضل نے بھی "اکبر نامہ" میں شیخ موصوف کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ "اس زمانے میں خداشناسی، خدا پرستی اور ریاضت کا نور شیخ سلیم ساکنِ سیکری کی ذات میں جلوہ گر تھا"۔ غرض اکبر خود سیکری گیا اور شیخ سلیمؒ سے التجا کی کہ وہ اُس کے حق میں دعا کریں۔

اِس بارے میں جہانگیر کا اپنا بیان جو اُس کی تُوزک میں درج ہے بہت دلچسپ ہے:- "...... جن دنوں میرے والد بزرگوار کو فرزند کی بہت آرزو تھی، ایک چٹان پر سیکری متصل آگرہ شیخ سلیمؒ نامی ایک درویش صاحب حال رہتے تھے۔ اُنھوں نے

عمر کی بہت سی منزلیں طے کر لی تھیں۔ اُس نواح کے لوگ اُن کے
بہت معتقد تھے۔ میرے والد درویشوں کے نیازمند تھے۔ وہ
شیخ سلیمؒ کی خدمت میں حاضر ہونے لگے۔ ایک مرتبہ اثنائے توجہ
اور بیخودی کے عالم میں اُن سے پوچھا کہ میرے ہاں کتنے فرزند
ہوں گے۔ فرمایا خدا تمھیں تین فرزند عطا کرے گا۔ والد نے کہا
میں نے منّت مانی کہ پہلے فرزند کو آپ کی تربیت اور توجہ کے
دامن میں ڈالوں گا اور آپ کی مہربانی کو اُس کا حامی و حافظ بناؤں
شیخ نے ازراہ قبولیت کہا مبارک باشد ہم نے بھی اُسکو اپنا بنایا۔"

اُس زمانے کے مشہور مؤرخ نظام الدین احمد نے اپنی
تاریخ "طبقاتِ اکبری" میں لکھا ہے کہ "شہنشاہ کئی مرتبہ شیخؒ
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ہر مرتبہ دس بیس روز وہیں بسر کئے"
انھیں دنوں معلوم ہوا کہ اکبر کی راجپوت ملکہ (راجہ بہارمل والیٔ
جے پور کی لڑکی) جو مریم الزمانی کے لقب سے یاد کی جاتی تھی، حمل
سے ہے۔ اکبر کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وضع حمل سے پہلے ملکہ کو مع
خواصوں کے شیخ کے گھر بھیجدیا۔ وہاں ۱۷ ماہ ربیع الاول ۹۷۷ھ
بروز چہارشنبہ ایک لڑکا پیدا ہوا۔ شیخ سلیمؒ نے پہلی بار اپنی بیٹی سے
دودھ پلوایا اور اپنے نام پر اُس کا نام رکھا۔ لیکن اکبر کے دل میں شیخ
سلیمؒ کی اس قدر توقیر تھی کہ اس لڑکے کو کبھی سلیم کہکر نہ پکارا۔ ہمیشہ
اُس کو شیخو بابا کہکر مخاطب کیا (سلیم جب تختِ سلطنت پر بیٹھا تو جہانگیر
کا لقب اختیار کیا) سلیم کے بعد شہزادہ مراد اور دانیال کی
پیدائش سے شیخؒ کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

شیخ سلیمؒ حتی الامکان اظہارِ کرامات سے پرہیز کرتے تھے،
لیکن کبھی کبھار کرامات ظہور پذیر ہو ہی جاتی تھیں۔ شیخ سلیمؒ کی ایک
کرامت کا تذکرہ جہانگیر نے بھی اپنی توزک میں کیا ہے "ایک دن
کسی تقریب سے میرے والد نے (شیخ سلیم سے) پوچھا کہ آپ کتنی
عمر پائیں گے اور آپ ملک بقا کی جانب کب انتقال فرمائیں گے
فرمایا عالم الغیب تو خدا ہے۔ جب بہت پوچھا تو مجھ نیازمند کی طرف
اشارہ کر کے فرمایا کہ جب شہزادہ کسی کے یاد کرانے سے کچھ سیکھ لے
اور خود سُنادے تو جاننا کہ وقت وصال نزدیک آپہنچا۔ والد بزرگوار
نے یہ سُنکر سب لوگوں کو جو میری خدمت کے لئے مقرر تھے تاکید
کردی کہ کوئی شخص شہزادے کو نظم و نثر میں تعلیم نہ دے۔ اسی طرح
دو سال سات مہینے گذرے۔ ایک دن عورتوں میں سے ایک
نے جو نظر گذر کے لئے روز مجھے اسپند کرجاتی تھی اور خیرات و
تصدقات کی بہرہ مند ہوتی تھی مجھے تنہا پایا۔ اس مقدمہ کی اُسے
خبر نہ تھی۔ اُس نے یہ شعر یاد کرادیا ؎

الٰہی غنچۂ اُمید بکشا　　گلے از روضۂ جاوید بنما

میں خدمتِ شیخ میں گیا تو انھیں یہ شعر سُنادیا۔ وہ خوشی سے
بے اختیار والد بزرگوار کے پاس گئے اور اس واقعہ سے مطلع فرمایا
اتفاقاً اُسی شب آثارِ تپ ظاہر ہوئے۔ دوسرے دن آدمی بھیجکر
تان سین کلاونت کو جو بے مثل گویّا تھا طلب فرمایا۔ تان سین نے
اُن کی خدمت میں جاکر راگ چھیڑا۔ پھر والد مرحوم کو طلب کیا۔ وہ
تشریف لائے تو فرمایا کہ وعدۂ وصال آپہنچا۔ اب آپ سے رخصت
ہوتے ہیں۔ اپنے سر سے دستار اُتار کر میرے سر پر رکھی اور کہا کہ
سلطان سلیم کو اپنا جانشین بنایا، اور اُسے خدائے حافظ و ناصر
کے سپرد کیا لحظہ بلحظہ اُن کا ضعف بڑھتا گیا اور آثار مردنی ظاہر
ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ محبوبِ حقیقی کا وصال میسر ہوا۔"

اکبر نے اظہارِ عقیدتمندی کے لئے شیخؒ کی یادگار کے طور پر اسی جگہ ۱۵۶۹ء میں ایک نئے شہر کی بنیاد ڈالی جو بعد میں فتحپور سیکری کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ شہر ۱۴ سال تک زیرِ تعمیر رہا اور ۱۵۷۴ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ اکبر نے ۱۵۶۹ء ہی میں اس جگہ کو اپنا دار السلطنت قرار دیدیا تھا، یہ شہر ۱۵۸۵ء تک پایۂ تخت رہا۔

فتحپور سیکری آگرہ سے تقریباً ۲۱ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ آج یہ ایک مختصر سا قصبہ رہ گیا ہے لیکن شاہی زمانے کی عمارات اب بھی اُس کی عظمتِ رفتہ اور شانِ گذشتہ کی قصہ خوانی کر رہی ہیں۔ ان عمارات میں بُلند دروازہ، شیخ سلیم چشتیؒ کا مزار، مسجد، پنج محل، جودھابائی کا محل، عبادتخانہ وغیرہ ہر سیاح سے خراجِ تحسین حاصل کرتے ہیں۔

درویشِ کامل کی شہرت ان عمارات کی مرہونِ احسان نہیں وہ دن بھی آئے گا جب اُس درویشِ کامل کی یہ یادگار مٹ جائے گی۔ لیکن اُس کا نامِ نامی سینہ بہ سینہ چلے گا اور رہتی دنیا تک اُس کی شہرت کا ستارہ چمکتا رہے گا۔

غزل

تجھی سے دادِ وحشت لیں، تجھی کو مہرباں کر لیں
جنونِ شوق میں جو چاہیں ہم اے آسماں کر لیں

جو آئے دل میں سب جذبِ نگاہِ ناتواں کر لیں
ہم عرضِ شوق سے پہلے نہ اُن کو رازداں کر لیں

شکستہ ساز چھیڑیں، اپنی آنکھیں گلفشاں کر لیں
وہ آئیں یا نہ آئیں، ہم تو بزم آرائیاں کر لیں

مری نظروں میں خاکِ آشیاں بھی آشیاں ہوگی
جنھیں ہے بجلیوں کا خوف، فکرِ آشیاں کر لیں

تلافی کچھ نہ کچھ ہو جائے تکلیفِ تبسّم کی
ذرا ٹھہرو، ہم اپنے دامنوں کی دھجیاں کر لیں

ہوائے گرم! کچھ مہلت دے ان معصوم غنچوں کو
کہ تھوڑی دیر تو نظّارۂ رنگِ جہاں کر لیں

(جذبی)

مراسلہ

پشتو رسم الخط

پشتو کا خون کس کی گردن پر ہے؟

محترمی مولانا عبد القادر خان سلمہٗ اللہ تعالیٰ،

میں نے رسالہ "نن پرون" بابت ۲۵ر اکتوبر سنہ ۱۹۴۲ء میں آپ کا مضمون بعنوان "آپ کی مرضی لیکن......" پڑھا۔ بہت خوب ہے۔ واللہ! میں یہ گمان بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایک سرحدی "دغر راوڑہ" بھی اردو میں اس پایہ کا مضمون لکھ سکتا ہے۔ سچ ہے کہ ؎

این سعادت بزور بازو نیست   تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

اور دعا ہے "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"۔

میں رسالہ "نن پرون" کا کافی عرصے سے مطالعہ کر رہا ہوں جب سے آپ نے "اس کارِ خیر" (قوم افغان کی تعمیر کا کام کارِ خیر نہیں تو اور کیا ہے) میں حصّہ لینا شروع کیا ہے۔ "نن پرون" نے بے گمان وہ درجہ حاصل کر لیا ہے جس پر ہم سرحدی بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اب شاید سرحد کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔

اس بات سے مجھے اور بھی خوشی حاصل ہوئی کہ "نن پرون" کا مقصد (جیسا کہ آپ نے محولۂ بالا مضمون میں واضح کیا ہے) یہ ہے کہ "افغان قوم کا متمدن، مہذب اور بلند پایہ اقوام میں شمار ہو" کیا ہی مبارک مقصد ہے۔ جزاک اللہ فی الدارین خیرا!

اب میں اپنے اصلی مطلب کی طرف آتا ہوں۔ آپ نے ہم سے ایک میٹھا سا گلہ کیا ہے۔ وہ یہ کہ سرحدی مضمون نگار "نن پرون" کیلئے پشتو مضامین کم لکھتے ہیں۔ آپ کا گلہ بھی بجا ہے، لیکن ہمارا عذر بھی بیجا نہیں۔ یہ غلط ہے کہ پشتو میں وسعت نہیں۔ پشتو زبان جتنی وسیع شاید ہی کوئی زبان ہو، اور اگر موقع ملا تو انشاء اللہ میں معقول دلائل سے اس امر کو ثابت بھی کروں گا۔ مگر ہماری جو غلطی ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک پشتو کی قدر نہ پہچانی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسلامیہ کالج کے ایام میں جب سید صاحب یا رسا صاحب کسی موقع پر پشتو میں اشعار فرماتے تو ہم منہ پر رومال ڈال کر ہنستے اور دل میں کہتے کہ یا اللہ ان گربکوٹوں کو کیا ہو گیا ہے کہ پشتو میں اشعار کہتے ہیں، اور یہ مجھے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ "خیبر میگزین" کے حصۂ اُردو میں مضامین چھپوانے کے لئے ہم غیور پٹھان ہمیشہ ایڈیٹر صاحب کی منّت سماجت کرتے تھے، اور حصۂ پشتو کا بیچارہ ایڈیٹر ہمیشہ مضامین کے لئے اپیلیں کیا کرتا تھا۔ سید صاحب اور رسا صاحب کو بھی یہ بات ابھی تک اچھی طرح یاد ہو گی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم پشتو میں کچھ لکھنے سے معذور بھی ہیں۔ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہیں کہ صوبہ سرحد میں زیادہ شاعر پشتو کو پاؤں تلے روندتے ہوئے اردو شاعری کے میدان میں جا گھستے ہیں اور وہاں سے جب

ہندوستانی شاعروں کے ڈنڈے پڑتے ہیں تو وا ایسا دُم دبا کر بھاگ آتے ہیں اور دامنِ گمنامی میں ہمیشہ کیلئے مُنہ چھپا لیتے ہیں۔ اسی شوق میں کوہاٹ سے رسالہ "ادیب" نکلا پنجاب اور یو پی کے ادیبوں نے جب خبر لی تو مجبوراً غیر طبعی موت مرنا پڑا۔ اسی طرح بنوں سے رسالہ "ارژنگ سخن" جاری ہوا۔ اُس بیچارے کو بھی یو۔ پی کی تنقیدی تلواروں نے شہید کر دیا۔ ان باتوں کے باوجود ہم ہیں کہ اُردو کے پیچھے بھاگے پھرتے ہیں۔ وجہ کیا ہے؟ کیا پشتو میں وسعت نہیں؟ کیا پشتو میں لذت نہیں؟ نہیں ایسا ہرگز نہیں، وجہ کچھ اور ہے۔ یہ نہیں کہ ہم پشتو میں لکھنا نہیں چاہتے ہم پشتو میں لکھ نہیں سکتے۔ شرم کی بات ہے، مگر کیا کریں، یہ حقیقت ہے۔ میں خود اسکا مجرم ہوں کہ بجائے پشتو خط ہذا اُردو میں لکھ رہا ہوں۔

پشتو میں مضامین نہ لکھ سکنے کی دو بڑی وجوہات ہیں (۱) رسم الخط (۲) تلفظ اور الفاظ کا اختلاف۔ اور پشتو کا خون انہی اصحاب کی گردن پر ہے جو ان دو باتوں کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں کہ بیچاری پشتو زبان بیچ میں کچل کر رہ گئی ہے۔

میں رسم الخط کے بارے میں کچھ تفصیل کے ساتھ عرض نہیں کروں گا کیونکہ اس پر بحث جاری ہے جو نہایت دلچسپ ہے اور کسی حد تک معنی خیز بھی ہے۔ اگر خود غرضی اور تعصب کی عینک اُتار کر پھینک دی جائے تو رسم الخط کے بارے میں آپ کی تجویز نہایت معقول، موزوں اور مفید ہے۔ شیدا صاحب آپ کی تجویز کے ایک حصے سے تو متفق نظر آتے ہیں۔ مگر دوسرے حصے میں اختلاف رکھتے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تجویز کا دوسرا حصہ ہی ایسا ہے جسے بہترین کہا جا سکتا ہے، ورنہ عربی طرز تحریر یا فارسی طرز تحریر کوئی بھی ہو، کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ عربی طرز تحریر میں زیادہ سہولت اور فائدہ ہے، کیونکہ عربی طرز تحریر کے ٹائپ رائٹرز موجود ہیں چنانچہ آجکل بعض لوگ اُردو کو بھی عربی طرز تحریر پر لکھنا پسند کرتے ہیں۔ دکن میں اس امر کی طرف خاص میلان پایا جاتا ہے۔ رہی دوسری بات یعنی پشتو کے خاص حروف "ژیم" "سیم" وغیرہ کا مٹانا۔ میں کہتا ہوں کہ سب سے پہلے اسی لعنت کو دور کیا جائے۔ انہی مخصوص حروف نے پشتو کے ڈایالکٹس کو برباد کر دیا ہے اگر یہ حروف نہ رہیں تو مختلف قبائل کے اختلافِ تلفظ کا سبب پٹھانوں کو تھوڑے عرصے میں پتہ لگ جائے گا، اختلاف تلفظ سے کان مانوس ہو جائیں گے، اور اختلاف تلفظ پر ہنسی کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ اس موقع پر مجھے ایک دلچسپ لطیفہ یاد آگیا۔ خدا بخشے میرے چچا ایوب نورڈ بگری پشاور میں کسی زمانے میں تھانیدار تھے، اور "تم کون ہو؟" کو جب وہ پشتو میں ادا کرتے تو کہتے "خوک ئی"۔ پشاوری کہتے ہیں "سوک ئی" یعنی س بولتے ہیں اور ہم "ھوک" کے بجائے اسی لفظ کو اس لہجے میں ادا کرتے ہیں کہ سوک چوک تک جا پہنچا ہے۔ اس خوک ئی سے میرے چچا بیچارے کا نام "چوک تھانیدار" ہو گیا۔ مدعا میرا یہ ہے کہ رسم الخط میں زیادہ فتنہ انہی مخصوص حروف نے برپا کیا ہے۔

شیدا صاحب اس بارے میں فرماتے ہیں کہ "جیسے یہ معلوم ہو کہ لفظ "ځان" جان سے بنا ہے تو وہ کبھی اسے ضان یا ظان نہیں لکھے گا" درست، مگر شیدا صاحب نے جغرافیہ میں پڑھا ہو گا کہ درسمند کی مولیاں مشہور ہیں۔ درسمند کے باشندے جو پشتو کے اہل زبان ہیں مولی کو "مُوئی" کہتے ہیں۔ ہم تو مُولَۍ کہتے ہیں بعض لوگ اس کو مُولئے کہتے ہیں اور بعض میلے کہتے ہیں، اس کا شیدا صاحب کے پاس کیا علاج ہے۔ گھر کو ہم "کور" کہتے ہیں اور بنوچی اس کو "کیر" کہتے ہیں۔ "لشکر" کو لکھنے کیلئے "ت" "بن" ایجاد ہو گیا، اب "کور" کیسے لکھا جائے گا، تاکہ بنوچیوں کو اعتراض نہ ہو۔ دراصل ہم بہت تنگدلی سے کام لے رہے ہیں جس طرح لکھنؤ اور آگرہ والوں نے اُردو میں قسم قسم کے (بقیہ مضمون صفحہ ۲۱ پر)

داستان نجات (۶)

کون سُنتا ہے فغان درویش
قہر درویش بہ جان درویش

جب مارک اکیلا جارہا تھا تو پوری طرح سمجھنے لگا کہ اب اُسّی کا بچنا محال ہے اور بدھ کی صبح کو پھانسی لگ جائے گی۔ تیز جارہا تھا۔ اگر راستہ سیدھا نہ ہوتا تو نہ جانے کہاں جا نکلتا۔

اپنے قیام گاہ پر پہنچا۔ سیڑھی چڑھکر اپنے کمرے کے سامنے آیا تو یکایک رُک گیا۔ کمرے کے اندر روشنی تھی۔ گھڑی نکال کر دیکھی تو بجنے ایک۔ دل میں سوچنے لگا:۔ یہ روشنی کیسی؟ کوئی ابتک بیٹھا میرا انتظار کر رہا ہے۔ (روبی کی بات یاد آئی) کہیں خفیہ پولیس کا آدمی تو نہیں؟ چپکے سے چل ہی نہ دوں، کسی نے مجھے آتے تو دیکھا ہے ہی نہیں، لیکن اگر خفیہ پولیس کا آدمی ہوتا تو اسے نیچے ہال کمرے میں انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ یہاں سے تو میں کھسک بھی سکتا ہوں، وہاں سے بچنا مشکل تھا۔ اگر اب چلا بھی جاؤں تو فائدہ؟ جدھر جاؤں پاسپورٹ تو دکھانا ہی پڑے گا۔ بجائے اسکے کہ بھاگ جاؤں پولیس والوں سے بات ہی کیوں نہ کرلوں۔ میں نے کوئی جُرم تو کیا ہی نہیں، کیوں ڈروں؟ اس کے علاوہ میں امریکی بھی تو ہوں۔ ہرچہ بادا باد!

کانوں میں جھنجھناہٹ سی ہونے لگی۔ لپک کر کواڑ کھولا تو دیکھا فریڈ بیٹھا ہے، کچھ تھکا ماندہ نظر آتا تھا۔ مارک کو دیکھتے ہی اُٹھا

مارک۔ اچھا تم ہو؟ فریڈ۔ جناب! کیا میں بیٹھ سکتا ہوں؟

مارک: ضرور، کچھ کہنا چاہتے ہو؟ **فرٹیز**: خط آپ کو مل گیا؟
مارک: ہاں، مگر یہ بات تو میں تمھیں اُس دن بھی بتا چکا ہوں۔
فرٹیز: اب تو آپ سب کچھ سمجھ گئے ہیں۔ **مارک**: ہاں!
فرٹیز: آپ اپنی والدہ سے بھی ملے؟
مارک: نہیں، مگر مجھے پتہ چل گیا ہے کہ وہ کہاں ہے، اور اس پر کیا کچھ گذری؟ یہ بھی جانتا ہوں کہ اس بدھ کو پھانسی لگ جائے گی۔

فرٹیز نے مایوسی سے سر ہلایا، اور کف افسوس ملنے لگا۔ پھر سنبھل کر کہا: اُس دن کے واقعے کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میری مجبوری تو آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ میرا ساتھی میرا بھائی ہی تھا، مگر میں یہی مناسب سمجھتا تھا کہ اسے یہ پتہ نہ چلے کہ آپ کون ہیں؟ پولیس کی لے دے کی وجہ سے وہ مجھ سے بھی ناخوش ہے۔

مارک: افسوس، کیا تم ہوٹل گئے تھے؟
فرٹیز: جی ہاں، وہاں کے دربان سے میری پہلے کی جان پہچان ہے مجھے اس نے آپ کا پتہ دیدیا، آج ہمت کرکے چلا آیا ہوں۔
مارک: فرٹیز، آخر تم کیوں گھبرا رہے ہو، تمھارا تو کوئی قصور نہیں ہے۔
فرٹیز: (جھینپ کر) کچھ قصور تو ہوگا جو ہفتہ بھر مجھے حوالات میں رہنا پڑا اچھی خاصی ملازمت تھی وہ بھی گئی، اور اب تک پولیس میری نگرانی کر رہی ہے اور تو اور میرا اپنا بھائی مجھ سے بےحد بدظن ہو رہا ہے۔ اسے ذرا بھنک پڑ جائے کہ میں اس معاملے میں کچھ کیا چاہتا ہوں تو نہ آؤ دیکھے نہ تاؤ خود ہی مجھے پولیس کے حوالے کردے گا۔

مارک: والدہ گرفتار کب ہوئی تھی؟ **فرٹیز**: ۲۰ جنوری کو۔
مارک: اور مقدمے کی سماعت کب شروع ہوئی؟
فرٹیز: یہ تو معلوم نہیں، البتہ اسکی گرفتاری کے دو ہفتے بعد خفیہ پولیس مجھے لے گئی۔ رات بھر سوالات کی بوچھار رہی۔ چوبیس گھنٹے پلک سے پلک نہ جھپک پائی۔ تب وہ لگے مجھے مارنے، اتنا مارا کہ میں کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا (اسوقت فرٹیز کی آنکھوں سے نفرت ٹپکنے لگی) طرح طرح کے سوال کیا گئے۔ امی امریکہ میں کیونکر بسر اوقات کرتی تھی۔ ملنے والے اسکے کون تھے؟ خط و کتابت کس سے رہتی تھی؟ روپیہ کہاں سے آتا تھا؟ وہ کہاں خرچ کرتی تھی؟
مارک: تو تم نے کیا کچھ بتایا؟
فرٹیز: میں نے بتلایا کہ بیس برس پہلے میں اس کنبے کے ساتھ امریکہ گیا تھا۔ تنخواہ دیتے رہے کام کرتا رہا۔ جب لگے تنخواہ گھٹانے تو میں نے بگڑ کر نوکری چھوڑ دی، اور خود اپنا کاروبار کرنے لگ گیا (اپنی آنکھیں بھینچ کر مکر سے مارک کی طرف دیکھا) میں بھلا ان کی باتوں میں آسکتا تھا میں ان کا مطلب سمجھتا تھا۔ ان کی غرض یہ تھی کہ میں آپ کی والدہ کے خلاف گواہ بن جاؤں، اور وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ میں کیا بیان دے سکتا ہوں۔ میں نے دھوپ میں تو بال اپنے سفید کیے ہی نہ تھے میں نے انھیں یقین دلا دیا کہ میں آپ کی والدہ سے سخت ناخوش ہوں اور انتقام کا پیاسا ہوں۔ میری غرض یہ تھی کہ وہ میرا بیان کرادیں
مارک: تو تمھیں پیش کیا؟
فرٹیز: ہاں کیا اور جو ہوسکا میں نے کہہ ڈالا، مگر سب بےسود۔ انھوں نے اسے سزا دینے کی پہلے ہی سے ٹھان رکھی تھی۔
مارک: کیا سماعت مقدمہ خفیہ طور پر ہوئی؟

فرٹیز: جی ہاں بالکل خفیہ طور پر۔ مجھے تو ایک ہی دن لے گئے تھے، اس دن مجھے پتہ چلا کہ سماعت کئی دن سے ہو رہی ہے۔ مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ ڈالا۔ چند روز بعد پھر مجھے بلایا۔ اسوقت میں جیل ہی میں تھا۔ انھوں مجھ سے کہا کہ ایک شرط پر تمھیں چھوڑ سکتے ہیں، وہ یہ کہ تم اس شہر سے چلے جاؤ، اور اپنا منھ بند رکھو۔ میں نے کہا کہ میری عین خواہش ہے کہ یہ ملک ہی چھوڑ دوں، اور انگلستان چلا جاؤں۔ انھوں نے کہا کہ جرمنی سے باہر تم کسی حالت میں نہیں جا سکتے ہو۔ تب میں نے کہا کہ میں اپنے بھائی کے پاس جا رہوں گا۔ انھوں نے یہ بھی جتا دیا کہ ایی ریٹیز کا جرم پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے اور اس کے لئے سزائے موت تجویز ہو چکی ہے، اگر چاہتے ہو تمھارا وہی حشر نہ ہو تو جو کچھ تم پر بیتی ہے اس کا کہیں ذکر نہ کرنا۔

مارک: اور وہ چٹھی؟

فرٹیز: جب میں کمرۂ عدالت سے نکلا تو باہر آپ کی والدہ ملی، اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور آنکھ بچا کر وہ چٹھی میری آستین میں رکھدی۔ کچھ نہ پوچھئے، میں نے اس چٹھی کو کس مشکل سے وہاں چھپائے رکھا۔ خیر یہ گذری کہ باہر آتے وقت کسی نے میری جامہ تلاشی نہیں لی۔

مارک: تم نے مجھے خود کیوں نہیں لکھا؟

فرٹیز: ویسے ہی ہمت نہیں پڑتی تھی، اور ان کے منع کرنے کے بعد بھلا کیسے جرأت ہو سکتی تھی؟ میں سمجھتا تھا کہ اگر وہ چٹھی کسی کے ہاتھ پڑ بھی جائے تو کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا ——— مسٹر مارک اُس دن وہ بہت بیمار نظر آتی تھی۔

مارک: وہ تو بہت بیمار رہی ہے، وہ بیرونی کیمپ میں لیجائی گئی اور وہاں اس کا اپریشن ہوا۔ جس ڈاکٹر نے اپریشن کیا تھا میں اس سے مل چکا ہوں۔

فرٹیز: زندہ تو ہے؟ **مارک:** ہاں۔

فرٹیز: اب میں سمجھا! میں بہت سوچا کیا کہ اس کی لاش کون لے۔ کوئی اور نظر نہ آیا تو خود میں نے درخواست کر ڈالی کہ اس کی لاش مجھی کو دیجائے۔ ضابطہ کی رو سے بعض اوقات مجرموں کی لاشیں بھی ملجاتی ہیں۔ کئی دفتروں میں مارا مارا پھرتا رہا تب کہیں میری درخواست منظور ہو پائی۔ کئی جگہ مجھ سے دستخط کرائے۔ چاہئے تھا مجھے اطلاع دیتے۔ میں متردد ہونے لگا۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ لوگ ضابطہ پر سختی سے پابند رہتے ہیں، شاید وہ زیادہ بیمار ہو گئی ہو، یا سزائے موت ہی سزائے قید میں تبدیل کر دی گئی ہو۔

مارک: نہیں، سزا تو وہی رہی۔

فرٹیز (آہستہ سے): بہرحال، اس کی لاش چونے کے کسی گڑھے میں تو پھینکنے سے رہے، آپ اطمینان رکھیں لاش مجھی کو دیں گے (اس موقع پر فرٹیز رو دیا اور سسکی لی)۔

مارک: لاش لے کے کروگے کیا؟

فرٹیز: اپنے بھائی کے گاؤں لیجاؤں گا اور وہاں حسب دلخواہ تجہیز و تکفین کروں گا۔ البتہ مجھے اجازت لینا پڑے گی۔ یہاں تو دفنانے کے لئے بھی بہت سی لکھت پڑھت کرنا پڑتی ہے۔

مارک: تمھارا بھائی وہاں دفنانے دے گا؟

فریٹز: روپیہ کیا نہیں کرا سکتا؟ اسے آجکل روپیہ کی ضرورت ہے۔ میرے پاس تو ہے نہیں، آپ آگئے ہیں، کچھ روپیہ تو آپ کے پاس ہوگا ہی؟

مارک: کیوں نہیں، وہ رقم ساری کی ساری امریکہ میں جمع ہوگئی تھی، جو درکار ہو مجھ سے لو۔

باتیں ہوچکیں تو فریٹز یہ کہتا ہوا اُٹھا: ہاں اب وہ مجھے بلائیں گے۔ میں نے اپنے ایک دوست کا پتہ دیدیا تھا، اسی پتے سے مجھے اطلاع آئے گی، وہ یہاں ڈرائی کلیننگ اور رنگنے کا کام کرتا ہے۔ اُس دن اسی کی گاڑی تو میں چلا رہا تھا۔ لاش مجھے صندوق میں بند ملے گی، اپنے بھائی کے فارم میں لیجاؤں گا کیا ہی اچھا ہو اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہونے پائے کہ آپ کون ہیں؟

مارک: پولیس تو جانتی ہے کہ میں یہاں ہوں اور میں کون ہوں۔

فریٹز (گھبرا کر): سچ؟ یہ کیونکر؟

مارک: میں خود پولیس کے افسر سے ملا۔

فریٹز: تو اس نے کچھ امید بھی دلائی؟

مارک: نہیں، میں ایک وکیل سے بھی مل چکا ہوں۔

فریٹز: بیکار وقت ضائع کیا آپ نے۔

فریٹز اُٹھا، اور کواڑ کھول ہی رہا تھا کہ مارک نے پوچھا: کوئی اور ترکیب تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟

فریٹز: کیسی ترکیب؟

مارک: کوئی اور، مثلاً ایسی ترکیب جس سے ہم اسے زندہ ہی نکال لائیں۔ یہ سوچنا کہ لاش ملے گی یا نہیں، بیکار ہے۔ یہ سوچو کہ اسے زندہ کیسے لائیں؟

فریٹز حیرت بھری نگاہ سے مارک کو تکنے لگا۔ اس کے دل میں یہ آیا کہ یہ واقعہ اس کے دماغ پر کچھ زیادہ اثر انداز ہوا ہے۔

فریٹز: اچھا، اب تو جاتا ہوں، کل مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔

مارک (بیدلی سے): بہت خوب۔ مگر آج رات گیارہ بجے کے قریب آجانا۔

فریٹز خاموش ہوگیا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ مارک کو کوئی تسکین بخش جواب دے، مگر مُڑا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ مارک نے پوشاک بدلی، اور بستر میں جا لیٹا۔ اس کے دل کو کچھ ڈھارس سی ہوگئی۔

(م۔ ی۔ د)

(بقیہ مضمون از صفحہ ۱۷)

جو یہاں صادق آتی ہے۔ دَخوار مُلا یہ بانگ خوك بسم اللّٰہ دائی۔ (یعنے بیچارے مُلا کی اذان کا کسی پر اثر نہیں ہوتا)

زیادہ تر اسی بناء پر انبیاء کی فی الواقع ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کسی نبی کے زمانہ میں جو لوگ اس کی تعلیم کو قبول اور اس پر عمل کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں تو اس کی وجہ کوئی کوئی عریاں حقیقت نہیں ہوتی، بلکہ نبی کی جلیل القدر شخصیت۔